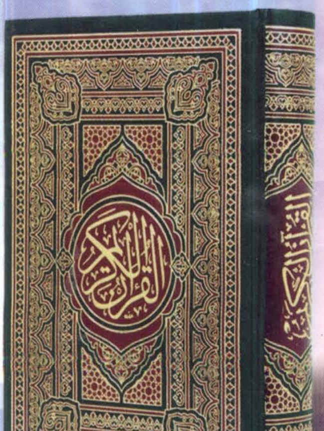
تفسیر سورہ فاطر



ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ

ادارۃ العلوم الاثریہ
فیصل آباد - پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیه ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

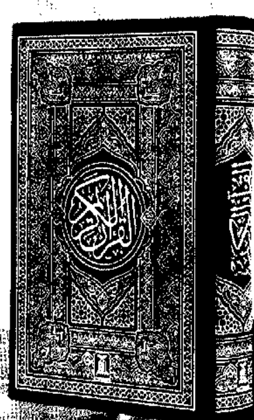
﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

تفسیر سورۃ فاطر



ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ

ادارۃ العلوم الاثریہ
فیصل آباد - پاکستان

نام کتاب: تفسیر سورۂ فاطر

مولف: ارشاد الحق اثری

ناشر: ادارۃ العلوم الاثریہ، منٹگمری بازار فیصل آباد

فون: 041-2642724

تعداد: 1000

تاریخ طباعت: فروری 2014ء

مطبع: انٹرنیشنل دارالسلام پرنٹنگ پریس، لاہور

فون: 042-7232400

ملنے کا پتہ

(1) ادارۃ العلوم الاثریہ، منٹگمری بازار فیصل آباد ۔ فون: 041-2642724

(2) مکتبہ اسلامیہ: غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

(B) کوتوالی روڈ فیصل آباد۔ فون: 041-2631204

فہرست

آیت نمبر 2

آیت نمبر 3

آیت نمبر 4

آیت نمبر 5

آیت نمبر 6

آیت نمبر 31-32

آیت نمبر 33

آیت نمبر 34-35

آیت نمبر 36

آیت نمبر 37

سورة فاطر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا
اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ؕ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١﴾ مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ
فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَ مَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ ؕ وَ
هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٢﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ
عَلَيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ
الْاَرْضِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۫ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿٣﴾ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ
كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿٤﴾ يٰٓاَيُّهَا
النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۥ وَلَا
يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿٥﴾ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ
عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ؕ ﴿٦﴾
اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۬ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿٧﴾ ع اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ

عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۖ
فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا
يَصْنَعُوْنَ ﴿۸﴾ وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ
اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ كَذٰلِكَ
النُّشُوْرُ ﴿۹﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ؕ اِلَيْهِ
يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصّٰلِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ وَالَّذِيْنَ
يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ
يَبُوْرُ ﴿۱۰﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ
جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ؕ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ وَمَا
يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ
عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۱﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ
سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ؕ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا
وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ
لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي
النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ

يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ وَالَّذِيْنَ
تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ؕ ﴿۱۳﴾ اِنْ تَدْعُوْهُمْ
لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ؕ وَ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ؕ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ﴿۱۴﴾
يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۱۵﴾
اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۚ ﴿۱۶﴾ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى
اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۱۷﴾ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ
اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ؕ اِنَّمَا تُنْذِرُ
الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَمَنْ تَزَكّٰى
فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾ وَمَا يَسْتَوِي
الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ﴿۱۹﴾ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ﴿۲۰﴾ وَلَا الظِّلُّ
وَلَا الْحَرُوْرُ ﴿۲۱﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۲۲﴾ اِنْ اَنْتَ
اِلَّا نَذِيْرٌ ﴿۲۳﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ؕ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ
اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴿۲۴﴾ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ

قَبْلِهِمْ ۚ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ بِالزُّبُرِ وَ بِالْكِتٰبِ
الْمُنِيْرِ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿٢٦﴾
اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ
مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ
اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴿٢٧﴾ وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ
الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ
الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ﴿٢٨﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ
وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً
يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴿٢٩﴾ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدَهُمْ
مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿٣٠﴾ وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ
الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ
بَصِيْرٌ ﴿٣١﴾ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا
فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ
بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿٣٢﴾ جَنّٰتُ
عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا ۚ

وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ﴿٣٣﴾ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا
الْحَزَنَ ۖ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ ﴿٣٤﴾ الَّذِي أَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ
مِنْ فَضْلِهِ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ وَلَا يَمَسُّنَا فِيهَا
لُغُوبٌ ﴿٣٥﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ
فَيَمُوتُوا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِنْ عَذَابِهَا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي كُلَّ
كَفُورٍ ﴿٣٦﴾ وَهُمْ يَصْطَرِخُونَ فِيهَا ۚ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا
غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۚ أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ
وَجَاءَكُمُ النَّذِيرُ ۖ فَذُوقُوا فَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ نَصِيرٍ ﴿٣٧﴾ إِنَّ
اللَّهَ عَالِمُ غَيْبِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ
الصُّدُورِ ﴿٣٨﴾ هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَمَنْ كَفَرَ
فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ إِلَّا
مَقْتًا ۖ وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ إِلَّا خَسَارًا ﴿٣٩﴾ قُلْ
أَرَأَيْتُمْ شُرَكَاءَكُمُ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي
مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ ۚ أَمْ
آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا فَهُمْ عَلَىٰ بَيِّنَتٍ مِنْهُ ۚ بَلْ إِنْ يَعِدُ الظَّالِمُونَ

بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ﴿٤٠﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ
بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿٤١﴾ وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ
لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ
فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿٤٢﴾ اسْتِكْبَارًا فِي
الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ؕ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ؕ فَهَلْ
يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ
وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿٤٣﴾ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ
فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْٓا اَشَدَّ
مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا
فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا ﴿٤٤﴾ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ
بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى
اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴿٤٥﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ ناشر

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْاَنْبِيَآءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَمَنْ تَبِعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ، أَمَّا بَعْدُ:

میرا سر اپنے مولائے کریم کے سامنے شکر وامتنان سے جھکے جارہا ہے جس نے ادارۃ العلوم الاثریہ کو حدیثِ پاک کی خدمت اور مسلکِ سلف کی پاسبانی کے ساتھ ساتھ اپنے پاک کلام قرآنِ مجید، فرقانِ حمید کی کچھ خدمت کی بھی توفیق عطا فرمائی۔ اس سے قبل سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات مبارکہ کی تفسیر ''فلاح کی راہیں'' کے نام سے، اس کے بعد ''تفسیر سورۂ ق'' شائع کرنے کی توفیق حاصل ہوئی۔ قارئین کرام نے اس حقیری کوشش کو شرفِ پزیرائی بخشا۔ بہت سے علمائے کرام نے اپنے خطبات اور دروس میں ان سے ستفادہ فرمایا اور اس سلسلہ کو جاری رکھنے کا مشورہ دیا، جس سے حوصلہ بڑھا۔ اب ادارہ ''تفسیر سورۂ فاطر'' احباب کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہے۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُّبَارَكًا فِيْهِ كَمَا يُحِبُّ رَبُّنَا وَيَرْضٰى-

یہ سلسلہ تفسیر پہلے دارالدعوۃ السّلفیہ کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے مؤقر ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور میں طبع ہوتا رہا ہے۔ جسے مزید حک واضافہ کے ساتھ ہم دارالدعوۃ السّلفیہ کے شکریہ کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کررہے ہیں۔

قرآنِ مجید کے ترجمہ کے لیے ہم نے استاذ الاساتذہ شیخ الحدیث والتفسیر مولانا

حافظ عبدالسلام مَتَّعَنَا اللّٰهُ بِطُوْلِ حَيَاتِهٖ کا ترجمۂ قرآن منتخب کیا ہے جو عام فہم ہے اور اس میں الفاظ کی پوری پوری رعایت رکھی گئی ہے جس کا اہتمام عموماً ترجمہ نگاروں نے نہیں کیا۔ تفسیر میں ہم نے وہی اسلوب اختیار کرنے کی کوشش کی ہے جو سلف سے منقول ہے۔ اور آیات سے متعلقہ متفرق فوائد ونکات جو کتب تفاسیر وغیرہ میں پائے جاتے ہیں حتی الوسع انھیں جمع کیا ہے اور اسے مفید تر بنانے کی اپنی سی سعی کی ہے۔ اہلِ علم سے التماس ہے کہ اگر اس میں کوئی غلطی محسوس کریں تو برائے مہربانی مطلع فرمائیں ہم ان کے سپاس گزار ہوں گے اور آئندہ اس کی اصلاح کریں گے۔

ہیچ مدان اپنے رفقائے کرام کا انتہائی شکر گزار ہے جو بہر آئینہ ادارہ کی سرپرستی فرماتے ہیں، اور دامے درمے قدمے سخنے اس کے یمین ویسار ہیں۔ اسی طرح ادارہ کے رفقائے کار: مولانا عبدالحی انصاری، مولانا طارق محمود فاضل مدینہ یونیورسٹی، مولانا حافظ محمد خبیب احمد اور قاری محمد بشیر حفظہم اللہ کا بھی بے حد ممنوں ہوں جن کے شب وروز تعاون ہی سے یہ سلسلہ بتوفیق ایزدی آگے بڑھ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی مساعی حسنہ کو قبول فرمائے، ادارہ کی ان خدمات کو شرف پزیرائی بخشے، ہم سب کے لیے ذریعہ نجات اور مؤسسینِ ادارہ کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے۔ آمین یا رب العالمین

خادم العلم والعلماء

ارشاد الحق اثری

۲۳ ذوالحجہ ۱۴۳۳ھ

۹ نومبر ۲۰۱۲ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ؕ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (فاطر:۱)

''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، فرشتوں کو قاصد بنانے والا ہے، جو دو دو اور تین تین اور چار چار پروں والے ہیں۔ وہ (مخلوق کی) بناوٹ میں جو چاہتا ہے اضافہ کر دیتا ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔''

اس سورت کا نام ''فاطر'' ہے اور اس کا ایک نام سورۃ ''الملائکہ'' بھی ہے۔ اس لیے کہ پہلی آیت میں ''فاطر'' کا لفظ ہے اور اسی میں ملائکہ کا بھی ذکر ہے۔ یہ سورۃ ۴۵ آیاتِ مبارکہ پر مشتمل ہے، اور مکی سورتوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں ۷۷۰ کلمات اور ۳۱۳۳ حروف ہیں۔[1] اس کا آغاز ''الحمد للہ'' سے ہوا ہے۔ قرآنِ مجید میں پانچ سورتیں ہیں جن کا آغاز ''الحمد للہ'' سے ہوا ہے:

(۱) الفاتحہ (۲) الانعام (۳) الکہف (۴) سبا (۵) فاطر۔

کلمۂ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' میں چند مباحث غور طلب ہیں:

۱: کسی کے اوصافِ ذاتیہ اور اختیاریہ کو بیان کرنا ''حمد'' ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی ہے جس کے تمام اوصاف ذاتی اور اختیاری ہیں۔ وہی سب پر قادر مطلق اور حاکم ہے۔ ساری مخلوق اسی کی محکوم ہے جس کسی میں کوئی خوبی ہے وہ اسی کی عطا کردہ ہے۔ ''الحمد'' میں 'ال' استغراق کے لیے ہے کہ ہر قسم کی حمد وثنا، وہ جس نوعیت کی ہو یا جس کسی کے لیے ہو وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی حمد ہے۔ اگر

[1] بصائر ذوی التمییز ۳۸۶/۱

کوئی عالم ہے تو علم اللہ تعالیٰ ہی کی عطا ہے۔ اگر کوئی طبیب یا خوب صورت ہے، حسنِ صوت یا لحن داؤدی سے متصف ہے، مال دار یا امیر وحاکم ہے یہ سب اوصاف وکمالات اللہ تعالیٰ ہی کے عطا کردہ ہیں۔

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِكَ الْخَیْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾[1]

''کہہ دے اے اللہ! بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے بادشاہی دیتا ہے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لیتا ہے اور جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کردیتا ہے، تیرے ہی ہاتھ میں ہر بھلائی ہے، بے شک تو ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔''

اس لیے ہر قسم کی حمد وتعریف کا حقیقی طور پر سزاوار اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے۔ اس لیے ''الحمد للہ'' کے معنی سب تعریف نہیں بلکہ سب تعریفیں ہی زیادہ صحیح ہے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ دعائے ماثورہ کا یہی مفہوم ہے:

((اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كُلُّهُ، وَإِلَيْكَ يَرْجِعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ))[2]

''اے اللہ! سب تعریفیں تیرے لیے ہیں، اور تمام معاملات تیرے پاس لوٹتے ہیں۔''

۲: ''حمد'' کے معنی شکر بھی ہیں، مگر یہ معنی عموماً کسی متعین نعمت کے تناظر میں ہوتے ہیں۔ قرآنِ پاک اور ادعیۂ مسنونہ میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ حمد کے بارے میں علماء نے کہا ہے کہ یہ زبان سے ہوتی ہے جبکہ شکر زبان، قلب اور اعضاء سے بھی ہوتا ہے۔ حضرت داود علیہ السلام اور ان کی اولاد کو جن انعامات سے نوازا گیا تھا، اسی تناظر میں انہیں فرمایا گیا:

---

① آلِ عمران: 26 ② بیهقی، صحیح الترغیب: 1576

﴿اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُکۡرًا ؕ وَ قَلِیۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّکُوۡرُ﴾ ①

''اے داؤد کے گھر والو! شکر ادا کرنے کے لیے عمل کرو، اور بہت تھوڑے میرے بندوں میں سے شکر گزار ہیں۔''

حضرت ثابت البنانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اہلِ خانہ کے لیے اوقات کو تقسیم کر دیا تھا یوں ہر وقت گھر میں نماز پڑھے جانے کا اہتمام تھا۔ ②

سیّدِ کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ تہجد میں اتنا لمبا قیام کرتے کہ پاؤں مبارک پر ورم آ جاتا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا عرض کرتیں کہ آپ اتنی زحمت کیوں اٹھاتے ہیں اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے پہلے پچھلے سب گناہ معاف کر دیئے ہیں تو آپ نے ارشاد فرمایا:

أَفَلَا أَكُونُ عَبْدًا شَكُورًا ③ ''کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔''

یہی روایت حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ ④

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿بَلِ اللّٰہَ فَاعۡبُدۡ وَ کُنۡ مِّنَ الشّٰکِرِیۡنَ﴾ ⑤

''بلکہ اللہ ہی کی پھر عبادت کر اور شکر کرنے والوں سے ہو جا۔''

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انسان کے جسم میں ہر جوڑ پر صدقہ ہے، ہر تسبیح صدقہ ہے، ہر تحمید و تہلیل صدقہ ہے اور ان کے لیے چاشت کی دو رکعتیں کافی ہیں۔'' ⑥ سجدہ عبادت ہے اور سجدۂ شکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خوشی کے موقع پر کرتے تھے۔ اس لیے شکر صرف زبان سے نہیں دل واعضاء سے شکر کی بجا آوری شکر کو مستلزم ہے۔

① سبا:13 ② ابن کثیر: 298/3 ③ صحیح بخاری:4837

④ صحیح بخاری:1130 ⑤ الزمر: 66 ⑥ صحیح مسلم:1671

۳: کسی کی تعریف کے لیے "مدح" کا لفظ بھی بولا جاتا ہے۔ مگر مدح میں ممدوح کی خوبیوں کا اختیاری اور ارادی طور پر ہونا ضروری نہیں۔ یہ اختیاری اور غیر اختیاری دونوں پر بولا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مدح کا لفظ حمد سے مقلوب ہے اور یہ دونوں مترادف ہیں۔ مگر انسان کے لیے حمد کا نہیں بلکہ مدح کا لفظ بولا جاتا ہے۔ علامہ راغب رحمہ اللہ وغیرہ نے فرمایا ہے کہ ہر شکر، حمد ہے مگر ہر حمد، شکر نہیں۔ اسی طرح ہر حمد، مدح تو ہے مگر ہر مدح حمد نہیں ہے۔ [1]

"الحمد" کے بارے میں ایک بڑی لطیف بات حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے کہی ہے۔ لکھتے ہیں:

((إِخْبَارٌ عَنْ مَحَاسِنِ الْمَحْمُوْدِ مَعَ حُبِّهِ وَإِجْلَالِهِ وَتَعْظِيْمِهِ.)) [2]

"محمود کے محاسن کا ذکر اس کی محبت، اس کی عظمت وجلال اور اس کی تعظیم وتکریم کے ساتھ۔"

جس سے قلب وروح جھوم جائیں اور دل کی گہرائیوں کی زبان ترجمان بن جائے حقیقتاً یہی حمد مقصود ومطلوب ہے کہ انسان دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کے جلال وجمال کا تصور کرتے ہوئے الحمد للہ کہے۔

۴: یہ "الحمد" اوّل وآخر صرف اللہ وحدہ لا شریک کے لیے سزاوار ہے۔ ابتدائے آفرینش کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ۝﴾ [3]

"سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اندھیروں اور روشنی کو بنایا، پھر (بھی) وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا،

---

(1) مفردات القرآن (2) بدائع الفوائد: 93/2 (3) الأنعام: 1

اپنے رب کے ساتھ (دوسروں کو) برابر ٹھہراتے ہیں۔"

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿وَهُوَ اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولٰى وَالْآخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝﴾ ①

"اور وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں اسی کے لیے دنیا اور آخرت میں سب تعریف ہے، اور اسی کے لیے حکم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔"

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور اس میں روح پھونکی تو حضرت آدم علیہ السلام کی زبان پر بھی سب سے پہلا کلمہ "الحمدللہ" تھا۔ چناں چہ صحیح ابن حبان میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَمَّا نَفَخَ اللّٰهُ فِي آدَمَ فَبَلَغَ الرُّوحُ رَأْسَهُ عَطَسَ فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، فَقَالَ لَهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى: يَرْحَمُكَ اللّٰهُ.)) ②

"جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام میں روح پھونکی تو روح ان کے سر تک پہنچی، انہیں چھینک آئی، تو انھوں نے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ" کہا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جواباً فرمایا: "يَرْحَمُكَ اللّٰهُ۔"

یہی روایت صحیح ابن حبان وغیرہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ ③

علامہ البانی نے اسے صحیح الموارد اور الصحیحۃ میں ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے امام البزار کے حوالے سے یہی روایت نقل کرکے فرمایا ہے:

① القصص: 70 ② صحیح ابن حبان، الموارد: 2081، السلسلة الصحيحة: 2159 ③ موارد الظمآن: 2082,2080

'هـٰذَا إِسْنَادٌ لَا بَأْسَ بِهِ.'[1]

چھینک آنے پر الحمد للہ اور اس کا جواب دینے میں آج بھی مسنون طریقہ یہی ہے۔ طبِ جدید نے اعتراف کیا ہے کہ چھینک آنے پر دل کی حرکت بند ہوجاتی ہے۔ گویا اس کے بعد حیاتِ نو پر الحمد للہ ربّ العالمین کہہ کر اللہ کی حمد اور اس کی نعمت پر شکر کا اظہار ہے۔

اسی طرح جن انسانوں کی قسمت میں جنت کا فیصلہ کردیا جائے گا ان کی آخری دعا یہی ''الحمد للہ'' ہوگی۔ چناں چہ ارشاد فرمایا:

﴿دَعْوَاهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾[2]

''ان کی دعا ان میں یہ ہوگی ''پاک ہے تو اے اللہ'' اور ان کی آپس کی دعا ان (باغات) میں سلام ہوگی اور ان کی دعا کا خاتمہ یہ ہوگا کہ سب تعریف اللہ کے لیے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔''

گویا جب جنت کا نظارہ کریں گے تو سبحان اللہ، سبحان اللہ کی صدا ہوگی۔ اہلِ جنت باہم آپس میں ملیں گے تو سلام، سلام کہیں گے، ربّ کریم کی طرف سے بھی ﴿سَلَامٌ قَوْلًا مِنْ رَبٍّ رَحِيمٍ﴾ کی صدا آئے گی۔ فرشتے بھی ان پر داخل ہوتے ہوئے سلام، سلام پکاریں گے، جیسے فرمایا:

﴿وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ○ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ﴾[3]

اور جب بیٹھیں گے اور جنت کی دائمی لذتوں کا احساس پائیں گے تو الحمد للہ رب العالمین پکاریں گے۔ سورۃ الزمر میں بھی ہے:

﴿وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّأُ

---

[1] البداية: 1/86 [2] يونس: 10 [3] الرعد: 23، 24

مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ o وَ تَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَ قِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o﴾ [1]

''اور وہ کہیں گے کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہمیں اس زمین کا وارث بنا دیا کہ ہم جنت میں سے جہاں چاہیں جگہ بنالیں،سو عمل کرنے والوں کا یہ اچھا اجر ہے۔ اور تو فرشتوں کو دیکھے گا عرش کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے اپنے ربّ کی حمد کے ساتھ تسبیح کررہے ہیں اور ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کردیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا ربّ ہے۔''

اس لیے اوّل وآخر، دنیا وآخرت میں اور آسمانوں اور زمین پر اللہ تعالیٰ ہی حمد کے لائق ہے اور وہی محمود ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَهُوَ اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ [2]

''اور وہی اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں،اسی کے لیے دنیا اور آخرت میں سب تعریف ہے اور اسی کا حکم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔''

۵: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ یا دیگر کلماتِ حمد سے اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف خود کی ہے۔ اپنی آخری کتابِ ہدایت اور نسخۂ شافی کا آغاز اپنی تعریف سے کیا ہے۔ سیّدِ کائنات حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جس قدر حمد وثنا کی اور جن جن کلمات سے حمد بیان کی اسی کا نتیجہ ہے کہ قیامت کے روز آپ کو یہ اعزاز بخشا جائے گا کہ آپ کے دستِ مبارک میں حمد کا جھنڈا ہوگا۔ [3]

[1] الزمر: 75,74 [2] القصص: 70 [3] ترمذی: 3615

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس انعام واکرام کے باوجود آپ اپنے مولا سے سربسجود ہو کر عرض کرتے ہیں:

'لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ.'[1]

''الٰہا! میں آپ کی ثنا کا حق ادا نہیں کرسکتا آپ اسی طرح ہیں جیسے آپ نے اپنی ثنا خود کی ہے۔''

زمین وآسمان اور ان کے مابین ہر چیز اللہ کی ثنا خوانی میں مصروف ہے:

﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِیْهِنَّ ؕ وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا۝﴾[2]

''ساتوں آسمان اور زمین اس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ بھی جو ان میں ہیں، اور کوئی بھی چیز نہیں مگر اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے، بے شک وہ ہمیشہ سے بے حد بردبار نہایت بخشنے والا ہے۔''

اس لیے وہی ذاتِ پاک حمد وثنا کی سزا وار ہے۔ اور وہی ہے جس نے اپنی تعریف خود آپ کی ہے، اور وہی اس کا مستحق ہے۔

۶: اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے لائق نہیں کہ وہ خود اپنی تعریف اور اپنی مدح بیان کرے۔ بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسانوں کو اس سے منع کیا ہے۔ چناں چہ ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی۝﴾[3]

اور اندھیروں اور روشنی کو بنایا، پھر (بھی) وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا،

[1] نسائی: 1101 [2] بنی اسرائیل: 44 [3] النجم: 32

”یقیناً تیرا رب وسیع بخشش والا ہے، وہ تمھیں زیادہ جاننے والا ہے جب اس نے تمھیں زمین سے پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں بچے تھے،سو اپنی پاکیزگی کا دعویٰ نہ کرو، وہ زیادہ جاننے والا ہے کہ کون بچا۔“

یہود ونصاریٰ اپنے آپ کو اللہ کی اولاد اور محبوب سمجھتے اور کہتے کہ جنت میں ہم ہی جائیں گے۔ جہنم میں گئے بھی تو یہ چند دنوں کا معاملہ ہوگا۔ اسی تناظر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ بَلِ اللّٰهُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ﴾ ①

”کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو پاک صاف کہتے ہیں، بلکہ اللہ پاک کرتا ہے جسے چاہتا ہے۔“

کسی انسان کی تعریف وتوصیف کا مدار تقویٰ اور اس کے قلب کی پاکیزگی اور اخلاص پر ہے۔ اور اس کا حال اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص کی تعریف کی تو آپ نے فرمایا:

’وَیْلَكَ قَطَعْتَ عُنُقَ صَاحِبِكَ.‘

”افسوس کہ تم نے تو اپنے ساتھی کی گردن ہی ماردی۔“

یہ بات آپ نے کئی بار دہرائی، پھر فرمایا:

اِذَا کَانَ اَحَدُکُمْ مَادِحاً صَاحِبَهٗ لَا مَحَالَةَ فَلْیَقُلْ أَحْسِبُ فُلَاناً وَاللّٰهُ حَسِیْبُهٗ وَلَا أُزَکِّیْ عَلَی اللّٰهِ أَحَداً أَحْسِبُهٗ کَذَا وَکَذَا. ②

”اگر تم میں سے کسی کے لیے کسی کی تعریف ناگزیر ہو تو وہ یوں کہے کہ میں فلاں شخص کو ایسا اور ایسا سمجھتا ہوں، اللہ ہی اسے بہتر جانتا

① النساء: 49 ② بخاری: 2662، 6162 ، مسلم: 3000

ہے، حقیقی علم صرف اللہ ہی کو ہے۔'' محمد بن عمرو بن عطا رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے اپنی بیٹی کا نام ''برہ'' رکھا تو مجھے زینب بنت سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نام رکھنے سے منع کیا ہے اور فرمایا ہے:

'لَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمُ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِأَهْلِ الْبِرِّ مِنْكُمْ.' (1)

''اپنے آپ کی پاکیزگی کا دعویٰ نہ کرو اللہ خوب جانتا ہے کہ تم میں سے پاک صاف کون ہے۔''

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'إِيَّاكُمْ وَالتَّمَادُحَ فَإِنَّهُ الذَّبْحُ.' (2)

''کسی کے منہ پر اس کی تعریف سے بچو یہ اسے ذبح کر دینا ہے۔''

حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی (ان کے منہ پر) تعریف کرنے لگا تو حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے اس کے منہ پر مٹی دے ماری اور فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو حکم دیا ہے جب تم منہ پر تعریف کرنے والے کو ملو تو اس کے منہ میں مٹی ڈالو۔ (3)

اس لیے نہ اپنی تعریف خود آپ کرنی چاہیے نہ کسی کے منہ پر اس کی تعریف کی جائے۔ بعض ظاہری احوال کی بنا پر ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ حسبِ علم یہ نیک ہے، سخی ہے، علم و عمل کے زیور سے آراستہ ہے مگر ساتھ یہ بھی کہنا چاہیے کہ حقیقتِ حال تو بس اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تعریف کا ہم کو حکم ہے اور یہ ہر حال میں ہونی چاہیے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف خود کی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب سیّدِ کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کی ہے۔ آپ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بھی تعریف کی ہے۔ انہیں جنت کی بشارتیں دی ہیں۔ اس لیے ہم ان کی تعریف وتوصیف، ان کا مقام ومرتبہ بیان کرتے ہیں اور ان تمام سے محبت دین وایمان

---

(1) مسلم: 2142 (2) ابن ماجہ: 3743، احمد (3) مسلم: 3002 وغیرہ

سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ طحاوی رحمہ اللہ نے العقیدۃ الطحاویہ[1] میں فرمایا ہے۔ اسی طرح تمام سلف امت ،تابعین کرام، ائمہ محدثین وفقہاء اور تمام اہل اللہ کا ذکر خیر سے کرتے ہیں۔ ان کی دینی خدمات اور ان کے عمل واخلاص کا حسب علم اعتراف اور اظہار کرتے ہیں۔ اور اجمالاً حسنِ ظن رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز انہیں سرخرو فرمائے گا۔ لیکن کسی کے نام بنام جنت جانے کا اعلان واظہار سے اسی لیے گریز کرتے ہیں کہ ﴿هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی﴾ کا یہی تقاضا ہے۔ علامہ طحاوی رحمہ اللہ نے بھی فرمایا ہے 'وَلَا نُنَزِّلُ اَحَداً مِنْهُمْ جَنَّةً وَلَا نَاراً'' ہم کسی کے بارے میں نہ جنت جانے کی بات کرتے ہیں نہ ہی جہنم جانے کی۔''

مگر ہائے افسوس! آج تو کچھ کر نہ پانے کے باوجود بھی اپنی تعریف کے ہم متمنی ہوتے ہیں۔ اپنے ناموں کے سابقے اور لاحقے کے متلاشی ہوتے ہیں۔ بلکہ تعریف و توصیف کے لیے اپنے احباب ساتھ رکھتے ہیں اور پھر ان کی تعریف پر پھولے نہیں سماتے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

الحمد للہ کی فضیلت:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تعریف اور حمد وثنا کی فضیلت کے بارے میں متعدد احادیث مبارکہ ہیں۔ ہم یہاں چند احادیث ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

ا: حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِيْزَانَ، وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَآنِ اَوْ تَمْلَأُ مَا بَيْنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ' الحديث[2]

''طہارت وپاکیزگی ایمان کا حصہ ہے، اور ''الحمد للہ'' میزان کا پلڑا بھر دیتا ہے، سبحان اللہ اور الحمد للہ، دونوں (آسمان اور زمین) بھر دیتے ہیں یا یہ فرمایا: بھر تمام اہلِ سنت کا اتفاق ہے کہ قیامت کے روز انسانوں دیتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین کے مابین ہے۔''

---

① العقيدة الطحاوية: 467 ② مسلم، رقم: 223

کے اعمال کا ترازو میں وزن کیا جائے گا اگر نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگیا تو انسان جنت میں جائے گا (اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ) اور اگر گناہوں کا پلڑا بھاری ہوگیا تو وہ جہنم رسید کردیا جائے گا۔ (اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْنَا مِنْهُمْ) قرآنِ مجید اور متعدد احادیث میں تو اس میزان کا ذکر ہے۔ اس حدیث سے جہاں ''میزان'' کا ثبوت ملتا ہے وہاں الحمد للہ اور سبحان اللہ کہنے کے اجر وثواب کا بھی علم ہوتا ہے۔

۲: حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَوَّلُ مَنْ يُّدْعٰى اِلَى الْجَنَّةِ الَّذِيْنَ يَحْمَدُوْنَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ.))

''سب سے پہلے جنھیں جنت کی طرف بلایا جائے گا وہ ہوں گے جو خوشی اور غمی ہر حال میں الحمد للہ کہیں گے۔''

یہ روایت مسند بزار اور طبرانی میں مختلف اسانید سے مروی ہے۔ علامہ منذری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے ان میں ایک سند حسن ہے اور حاکم نے اسے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے۔[1]

مگر شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ الفاظ امام عبداللہ ابن مبارک رحمہ اللہ کی کتاب الزہد میں حضرت سعید بن جبیر سے موقوفاً صحیح سند سے منقول ہیں۔[2]

حضرت عمران نے ایک روز فرمایا میں آج ایک حدیث تم کو بتلانا چاہتا ہوں، شاید تمھیں اس سے فائدہ پہنچے، 'إِعْلَمْ أَنَّ خَيْرَ عِبَادِ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الْحَمَّادُوْنَ' جان لو کہ قیامت کے دن سب سے بہتر وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کی باکثرت حمد کہیں گے۔[3]

---

① الترغيب: 437/2 ② الضعيفة، رقم: 633 ③ مسند احمد: 434/4

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس کے راوی الصحیح کے راوی ہیں اور یہ موقوف، مرفوع کی طرح ہے۔ اس سے بھی پہلی احادیث کی تائید ہوتی ہے۔ جنت کا دروازہ بھی تو احمد الحامدین ﷺ کھٹکھٹائیں گے اور آپ کے ہمراہ سب سے پہلے آپ کی امت ہی جنت میں جائے گی جن کا لقب ''حمادون'' ہے۔

۳: حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب مسلمان بندے کا نونہال فوت ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں: میرے بندے کے بیٹے کو لے آئے ہو؟ فرشتے عرض کرتے ہیں جی ہاں، پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے کے دل کا پھل، تم لے آئے ہو؟ تو وہ عرض کرتے ہیں جی ہاں، اللہ فرماتے ہیں: پھر میرے بندے نے کیا کہا؟ فرشتے عرض کرتے ہیں وہ آپ کی حمد بیان کرتا اور انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

'اِبْنُوا لِعَبْدِیْ بَیْتاً فِی الْجَنَّةِ وَسَمُّوْهُ بَیْتَ الْحَمْدِ.' [1]

''میرے بندے کا گھر جنت میں بنا دو اور اس کا نام ''بیت الحمد'' رکھو۔''

مصیبت میں ''الحمد للہ'' کہنے کا یہ اجر وثواب اسی لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی ہوا۔ اور وہ یقین رکھتا ہے اللہ تعالیٰ کا ہر فیصلہ عدل وحکمت پر مبنی ہے۔ اور وہی حَیٌّ قَیُّوْمٌ ہے باقی ہر ایک نے فنا ہونا ہے اس لیے حمد وثنا کا وہی سزاوار ہے۔ ہم سب کو اللہ ہی نے بنایا ہے اور ہر ایک نے اپنے اپنے وقت پر اسی کے پاس پہنچنا ہے۔ صدمہ کے موقعہ پر یوں اللہ کی حمد وثنا اور اللہ کے فیصلے پر صبر وثبات کا نتیجہ جنت میں ''بیت الحمد'' ہے۔

۴: کائنات میں ''احمد الناس'' اور ''احمد الحامدین'' نبی کریم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ آپ نے جن کلماتِ رفیعہ سے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی ہے ان کی تفصیل احادیث مبارکہ میں موجود ہے۔ آپ کو کتاب عطا فرمائی گئی تو آغاز الحمد سے کیا گیا، آپ ہر خطبہ کا آغاز الحمد سے کرتے۔ حتیٰ کہ قیامت کے روز، فرمایا:

[1] ترمذی: 1021، الصحیحة: 1408

فَأُثْنِیْ عَلٰی رَبِّیْ بِثَنَاءٍ وَتَحْمِیْدٍ یُعَلِّمُنِیْهِ. [1]

''میں اپنے رب کی حمد وثنا ایسے کلمات سے کروں گا جو خاص اسی وقت مجھے سکھلائے جائیں گے۔''

اسی حمد وثنا کا نتیجہ سمجھیے کہ الہامی طور پر آپ کا نام احمد رکھا گیا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسی نام سے آپ کی بشارت دی ہے۔ جیسا کہ سورۃ الصّف [2] میں ہے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ''احمد'' آپ کا ایسا مخصوص نام ہے کہ اس سے قبل کسی کا یہ نام نہیں رکھا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت یہی تھی کہ احمد کسی کا نام نہ ہو، تا کہ کوئی شک وریب میں مبتلا نہ ہو پائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا مصداق کون ہے؟ کثرتِ تحمید ہی کی بدولت قیامت کے روز ''لواء الحمد'' آپ کے دست مبارک میں ہوگا۔ آدم علیہ السلام اور ان کی ساری ذریت آپ کے جھنڈے کے نیچے اور اردگرد ہوگی۔ آپ کو ''مقامِ محمود'' پر سرفراز کیا جائے گا۔ اور آپ کی امت کا لقب ''حمادون'' ہوگا جیسا کہ حضرت کعب الاحبار سابقہ کتابوں کے حوالے سے ذکر کرتے ہیں اور امام دارمی نے السنن کے مقدمہ [3] میں اس کا ذکر کیا ہے۔

:۵ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے ''افضل'' اور سب سے ''محبوب'' چار کلمات ہیں: سُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ اَکْبَرُ ان کلمات کی فضیلت متعدد احادیث میں وارد ہے۔ جس کی تفصیل تطویل کا باعث بنے گی۔ بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ ان چاروں کلمات میں سب سے افضل ''الحمد للہ'' ہے۔ کیوں کہ اس میں باقی تینوں کلمات کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ تسبیح میں تنزیہ اور نقائص سے نفی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب اور نقص سے پاک ہیں۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، میں توحید کا اثبات اور شرک کی نفی ہے۔ اور اَللّٰهُ اَکْبَرُ میں تمام صفات کاملہ کا اظہار اور ہر کسی کے مقابلے میں اللہ کی بڑائی کا اعتراف ہے جبکہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ میں جمیع محامد کا اثبات، تنزیہ اور توحید کو مستلزم ہے۔ تمام

[1] بخاری [2] الصف: 6 [3] مقدمہ: 16/1

صفاتِ کمالیہ کا اقرار ہے۔ اس لیے کہا گیا کہ 'اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ' افضل الکلام اور احبُّ الکلام ہے۔

گویا ''الحمد للہ'' کلمۂ حمد وشکر ہی نہیں کلمۂ توحید وتمجید بھی ہے۔ اور یہی پہلا اور آخری سبق ہے۔ مگر علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ کفر سے ایمان میں آنے کا کلمہ لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ ہے۔ اسی کے بارے میں ارشاد ہے کہ لوگ جب تک لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ نہیں کہتے مجھے ان کے خلاف قتال کا حکم ہے، اور اس میں فیصلہ کن بات تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہے جو آپ نے ارشاد فرمائی کہ

'اَفْضَلُ مَا قُلْتُ اَنَا وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ قَبْلِیْ لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ'[1]

''سب سے افضل وہ کلمہ ہے جو میں نے اور مجھ سے پہلے تمام انبیاء نے کہا ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی الہ نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔''

مگر یہ کلمۂ توحید بھی انہی چار کلمات کا حصہ اور جز ہے۔ یہ کلمہ ایمان ہے اور جنت کی چابی ہے۔ تاہم حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہما کی حدیث سے من وجہ، الحمد للہ کی افضلیت ثابت ہوتی ہے۔ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ چار کلمات اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑے منتخب ہیں۔ جو ''سبحان اللہ'' کہتا ہے اس کے لیے بیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور بیس گناہ معاف ہوتے ہیں۔ جو 'اَللّٰہُ اَکْبَرُ' اور 'لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ' کہتا ہے اسے بھی اتنا ہی اجر وثواب ملتا ہے۔ یعنی بیس، بیس نیکیاں ملتی ہیں اور بیس، بیس گناہ معاف ہوتے ہیں۔ اور جو کوئی دل سے الحمد للہ رب العالمین کہتا ہے اسے تیس نیکیاں ملتی ہیں اور تیس گناہ معاف ہوتے ہیں۔ یہ حدیث مسند امام احمد، السنن الکبریٰ للنسائی اور مستدرک حاکم میں صحیح سند سے مروی ہے اور علامہ البانی رحمہ اللہ

[1] تفسیر قرطبی: 132/1

نے بھی اسے صحیح الترغیب [1] میں ذکر کیا ہے۔ جس سے اجر وثواب کے اعتبار سے ''الحمد للہ ربّ العالمین'' کی فضیلت دوسرے کلمات پر ثابت ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

٦: ''الحمد للہ'' جہاں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور کلمۂ شکر ہے وہاں یہ بہترین دعا بھی ہے۔ چناں چہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فرماتے تھے:

'اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَفْضَلُ الدُّعَاءِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ.' [2]

''سب سے افضل ذکر ''لا الٰہ الا اللہ'' ہے اور سب سے افضل دعا ''الحمد للہ'' ہے۔''

اس لیے ''الحمد للہ'' کلمۂ حمد وثنا، کلمۂ شکر، کلمۂ توحید اور کلمۂ دعا بھی ہے بلکہ بہترین دعا ہے۔ امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ ''الحمد للہ'' دعا کیوں کر ہے؟ انہوں نے فرمایا تم نے عبداللہ بن جدعان کی مدح سرائی کے بارے میں امیہ بن ابی الصلت کا کلام نہیں سنا جس میں اُمیہ نے کہا ہے:

أ أَذْكُرُ حَاجَتِيْ أَمْ قَدْ كَفَانِيْ
حِبَاؤُكَ إِنَّ شِيْمَتَكَ الْحَيَآءُ
إِذَا أَثْنٰى عَلَيْكَ الْمَرْءُ يَوْماً
كَفَاهُ مِنْ تَعَرُّضِهِ الثَّنَاءُ
كَرِيْمٌ لَا يُغَيِّرُهُ صَبَاحٌ
عَنِ الْخُلُقِ الْجَمِيْلِ وَ لَا مَسَاءُ

''کیا میں اپنی حاجت وضرورت ذکر کروں، یا تمہاری عطا اور حیا دار

[1] صحیح الترغیب، رقم: 1554 [2] ترمذی: 3383، ابن ماجہ: 38

خصلت کا بیان ہی کافی ہے۔ جب کوئی آدمی تمھاری کسی روز مدح سرائی کرتا ہے، تو اس کے لیے یہ تعریف کرنا ہی اس کے سوال وطلب کے لیے کافی ہے۔ وہ ایسا سخی ہے کہ صبح وشام اس کے بہترین اخلاق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔"

امام سفیان رحمہ اللہ نے یہ شعر پڑھ کر فرمایا: لو جب سوال کی بجائے مخلوق کی ثنا وتعریف ہی اپنے ممدوح کے لیے کافی ہے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بارے میں کیا خیال کیا جاسکتا ہے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تعریف وثنا کہنے والا دو اعتبار سے دعا کرنے والا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

((وَالْمُثْنِیْ عَلٰی رَبِّہٖ بِحَمْدِہٖ وَآلَائِہٖ دَاعٍ لَہٗ بِالِاعْتِبَارَیْنِ فَإِنَّہٗ طَالِبٌ مِنْہُ، طَالِبٌ لَہٗ فَھُوَ الدَّاعِیْ حَقِیْقَۃً))

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اس کی تعریف وحمد کرنے والا دو اعتبار سے دعا کرنے والا ہے ایک یہ کہ وہ اللہ سے مانگتا اور سوال کرتا ہے اور دوسرا یہ کہ وہ اللہ کے لیے مانگتا ہے اور یہی حقیقتاً دعا کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

هُوَ الْحَيُّ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ. (1)

"وہی زندہ ہے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ خالص اسی کو پکارو، دین اسی کا ہے۔ سب تعریفیں تمام جہانوں کے ربّ کے لیے ہی ہیں۔"

یہ جو انھوں نے فرمایا ہے کہ "وہ اللہ کے لیے مانگتا ہے" تو اس کا مفہوم یہ ہے وہ صحت، اولاد، مال غرضیکہ جو بھی مانگتا ہے اللہ کے دین کی سربلندی اور اس کی بندگی کی ادائیگی کے لیے مانگتا ہے۔ مال طلب کرتا ہے تو اس لیے کہ اسے اللہ کی راہ میں

(1) فقه الأدعية والأذكار: 235/1

صرف کرے گا۔ اولاد طلب کرتا ہے تو اس لیے کہ اسے دین کے زیور سے آراستہ کرے گا اور دین کا خدمت گزار بنائے گا۔ صحت طلب کرتا ہے کہ بحسن وخوبی اس کی بندگی کر سکے اور ضرورت پڑے تو اس کے دین کے لیے جہاد کر سکے۔

الغرض یہ اللہ کا سائل ہے اور اللہ کے لیے سائل ہے جو طلب کرتا ہے وہ اللہ کی رضا جوئی کے لیے اور اس کے دین کی خدمت گزاری کے تناظر میں مانگتا ہے اور پکار اٹھتا ہے:

((اِلٰهِیُ اَنْتَ مَقْصُوْدِیُ وَرِضَاكَ مَطْلُوْبِیُ.))

الحمد للہ کہنا بہت بڑی نعمت:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس قدر انعامات سے نوازا ہے کہ انہیں حیطۂ شمار میں لانا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ [1]

''اگر تم اللہ کی نعمت شمار کرو تو اسے شمار نہ کر پاؤ گے۔''

جب انعامات کا شمار وقطار ہی نہیں تو ان کی شکر گزاری کیوں کر ہو سکتی ہے؟ یہ انعامات تو شکمِ مادر سے آخری سانسوں تک بے شمار ہیں اس لیے ان کی شکر گزاری کا حق کیوں کر ادا ہو سکتا ہے؟ حضرت عتبہ بن عبد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'لَوْ أَنَّ رَجُلًا يَجُرُّ عَلٰى وَجْهِهٖ مِنْ يَوْمِ وُلِدَ إِلٰى يَوْمِ يَمُوْتُ هَرَمًا فِيْ مَرْضَاةِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ لَحَقَّرَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ' [2]

''اگر کوئی شخص اپنی پیدائش سے بڑھاپے میں موت تک اللہ کی رضا کے لیے سربسجود رہے تو قیامت کے روز اسے بھی حقیر جانے گا۔''

اس لیے اللہ تعالیٰ کے احسانات وانعامات کی شکر گزاری ہو ہی نہیں سکتی۔ ایک

---

[1] ابراھیم: 34 [2] مسند امام احمد: 185/4، الصحیحۃ: 447

سے ایک نعمت بڑی ہے۔

ایک طرف اگر ''نعمتِ نفع'' ہے جس میں صحت وسلامتی، مال واولاد، آسائش وآرام اور امن وامان ہے تو دوسری طرف ''نعمتِ دفع'' ہے کہ اپاہج نہیں بنایا، محتاجگی اور درماندگی سے بچایا ہے۔ مخالفوں کی مخالفت اور حاسدین کے حسد سے محفوظ رکھا ہے، اس کے ساتھ ایمان وعمل صالح کی توفیق، زبانِ ذاکر اور قلبِ شاکر کی نعمت بخشی کفر وضلالت سے محفوظ فرمایا ہے تو قدم قدم پر ان نعمتوں کے احساس سے انسان بے خود ہو کر پکار اٹھتا ہے۔

بے لطف تو من قرار نتوانم کرد
احسان تو شمار نتوانم کرد
گر بر تن من زبان شود ہر موئے
یک شکر تو از ہزار نتوانم کرد

حضرت بشر حافی نے منصور بن عمار رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے حوالے سے لکھا تو انہوں نے جواباً خط لکھا:

يَا أَخِيُ! فَقَدُ أَصُبَحَ بِنَا مِنُ نِعَمِ اللّٰهِ مَا لَا نُحُصِيهِ فِيُ كَثُرَةِ مَا نَعُصِيهِ فَلَقَدُ بَقِيتُ مُتَحَيِّراً فِيمَا بَيُنَ هَاتَيُنِ لَا أَدْرِيُ كَيُفَ أَشُكُرُ بِجَمِيُلِ مَا نَشَرَ أَوُ قَبِيُحِ مَا سَتَرَ ①

''اے بھائی! ہم اپنی بکثرت نافرمانیوں کے باوجود اللہ کی دی ہوئی بے شمار نعمتوں سے صبح کرتے ہیں، میں تو ان دو باتوں پر حیران ہوں، نہیں سمجھ پاتا کہ کیسے شکر کروں اس وجہ سے کہ اللہ نے میری خوبیوں کو لوگوں میں عام کر دیا ہے یا اس وجہ سے کہ اس نے میری خطاؤں پر پردہ پوشی فرما دی ہے۔''

اللہ کی بعض نعمتوں کا تو انسان کو احساس ہی نہیں ہوتا۔ چند سال قبل یونان کے

① ذکر اخبار أصبهان: 147/1، عدة الصابرين: 145

''اوناس'' نامی تاجر کا اخبارات میں ذکر ہوا جو دنیا کی سب سے بڑی جہاز ساز کمپنی کا مالک تھا۔ اور دنیا کے امیر ترین انسانوں میں وہ شمار ہوتا تھا۔ اس سے انٹرویو لیا گیا تو اس سے پوچھا گیا آپ کی کوئی خواہش؟ اس نے کہا: ہاں ایک خواہش ہے مجھے ایک عارضہ ہے کہ میری پلکوں کے بند ہونے اور کھلنے کی صلاحیت مفقود ہوگئی ہے، ڈاکٹروں نے دیکھنے کے لیے پپوٹوں پر سلوشن لگا دیا ہے۔ پلکوں کو ان کے ساتھ چمٹا دیتا ہوں تھک جاتا ہوں یا سونا چاہتا ہوں تو پلکیں نیچے کر لیتا ہوں۔ اس کا علاج آج تک کوئی ڈاکٹر نہیں کر سکا۔ انٹرویو لینے والے نے پوچھا اگر یہ درست ہو جائیں تو کیا انعام واکرام دیں گے؟ اس نے کہا اپنی ساری دولت اور سارا اثاثہ دینے کے لیے تیار ہوں۔[1]

اس سے اندازہ کیجیے کہ اللہ کی ایک ایک نعمت کس قدر بیش قیمت ہے۔ یہ روشنی، یہ ہوا ہمیں مفت میں حاصل ہو رہی ہیں۔ جبکہ بجلی کے قمقموں اور پنکھوں کو چلانے کے لیے ہر ماہ کتنا خرچ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اللہ کی ان بے شمار نعمتوں میں سے کسی ایک نعمت کا شکر بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت داود علیہ السلام نے فرمایا:

'إِلٰهِی لَوْ اَنَّ لِكُلِّ شَعْرَةٍ مِنِّیْ لِسَانَیْنِ یُسَبِّحَانِكَ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالدَّهْرَ مَا وَفَیْتُ حَقَّ نِعْمَتِكَ وَاحِدَةً '[2]

''میرے مولیٰ! اگر میرے ہر بال کی دو زبانیں ہوں جو زندگی بھر صبح وشام تیری تسبیح بیان کریں تو تیری ایک نعمت کا بھی حق ادا نہیں ہو سکتا۔''

یہ سب نعمتیں بجا مگر ان نعمتوں پر ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ کہنا ان نعمتوں سے بھی بڑی نعمت ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسی حوالے سے صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی اس دعا سے استدلال کیا ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع کے بعد قومے کی حالت میں پڑھتے تھے:

---

[1] ھفت روزہ الاعتصام، ۲۱ جون ۲۰۰۲ء [2] عدۃ الصابرین: 128

((رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ، مِلْءَ السَّمٰوَاتِ وَمِلْءَ الْاَرْضِ وَمِلْءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَیْءٍ بَعْدُ، اَهْلَ الثَّنَاءِ وَالْمَجْدِ، اَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ وَكُلُّنَا لَكَ عَبْدٌ اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ، وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ .))[1]

''اے اللہ! ہمارے ربّ! تیرے لیے ہی سب تعریفیں ہیں آسمانوں کے بھرنے کے برابر، زمین کے بھرنے کے برابر، اور اس کے جس کے بھرنے کے بارے میں آپ چاہتے ہیں۔ تعریف اور عظمت کے لائق آپ ہی ہیں۔ سب سے زیادہ حق بات جو بندے نے کہی۔ اور ہم سب تیرے بندے ہیں۔ اے اللہ! جو کچھ آپ دینا چاہیں اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ اور جس کو آپ روک دیں اسے کوئی دے نہیں سکتا اور کسی دولت مند کو تیرے عذاب سے دولت مندی فائدہ نہیں دیتی۔''

اس دعا میں ''اَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ'' میں ''عبد'' سے رسول اللہ ﷺ مراد ہیں۔ اور یہ جملہ خبر ہے جس کی مبتدا محذوف ہے۔ یعنی اصل کلام یوں ہے: ''الحمد احق ما قال العبد'' اور حمد وثنا ہی سب سے زیادہ حق بات ہے جو بندہ کہتا ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اس (سورۂ فاتحہ) کو نماز میں لازم قرار دیا، اور اسی بنا پر ہر خطبہ اور ہر ذی شان کام کا آغاز آپ الحمد سے کرتے تھے۔[2]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلٰی عَبْدٍ بِنِعْمَةٍ فَقَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ، اِلَّا كَانَ مَا أُعْطٰی اَفْضَلَ مِمَّا أَخَذَ .))[3]

''اللہ تعالیٰ نے جس بندے کو کوئی نعمت عطا فرمائی تو اس نے اس پر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہا۔ مگر جو نعمت اس نے حاصل کی اس سے یہ کلمۂ حمد جو اسے عطا کیا گیا زیادہ فضیلت والا ہے۔''

---

① مسلم: 477 ② مجموع الفتاوی: 312/14 ③ ابن ماجه: 3805

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔ الحمد للہ کا جس نعمت سے افضل ہونا، اس حدیث میں مذکور ہے اس سے مراد دنیوی نعمت ہے۔ جیسے صحت، رزق اور دفعِ ضرر وغیرہ اور الحمد للہ کہنے کی توفیق ملنا دینی نعمت ہے۔ یہ دونوں نعمتیں ہیں مگر اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کو اپنی نعمتوں پر حمد وشکر کی توفیق عطا فرمانا، دنیوی نعمتوں سے افضل ہے۔ کیوں کہ دنیوی نعمتوں کے ساتھ اگر اللہ کا شکر اور اس کی حمد وثنا نہ ہو تو یہ نعمت بڑی آزمائش بن جاتی ہے۔ چناں چہ حضرت ابو حازم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((كُلُّ نِعْمَةٍ لَا تُقَرِّبُ مِنَ اللّٰهِ فَهِيَ بَلِيَّةٌ.))

''جو نعمت قربِ الٰہی کا باعث نہیں وہ بڑی مصیبت ہے۔''

اس لیے جب دنیوی نعمت پر حمد وشکر کی توفیق حاصل ہوتی ہے تو یہ نعمتِ شکر اس دنیوی نعمت سے افضل اور بہتر ہے اور اللہ کے ہاں محبوب ہے۔ کیونکہ اللہ اپنے شکر گزار اور حمد کار بندے سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ کے ہاں یہ بات بڑی پسندیدہ ہے کہ اس کا بندہ کھانا کھائے، پانی پیئے اور اس کا شکر کرے اور اس کی تعریف کرے۔ جب انسان کی یہ حالت ہے کہ جب وہ جود وسخا کا مظاہرہ کرے تو لوگ اس کی تعریف کریں اور وہ اس تعریف کو اپنے مال ومتاع سے بہتر سمجھتا اور اس پر خوش ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو سب سے بڑے سخی اور سب سے بڑے جواد ہیں، اس کی جود وسخا پر جب اس کا بندہ اس کی حمد کرتا اور اس کا شکر بجا لاتا ہے تو وہ بھی اسے پسند کرتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندے سے حمد وشکر کا تقاضا کرتے ہیں اور اس حمد وشکر کے نتیجہ میں مزید نوازشوں سے سرفراز کرنے کا حتمی وعدہ فرماتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کی حمد کا محتاج نہیں، کوئی انسان اس کی حمد نہ بھی کرے وہ پھر بھی محمود ہے۔ لیکن وہ اپنے بندے کی طرف سے حمد وشکر کو پسند کرتا ہے۔ یہ اس لیے بھی کہ اس میں خود بندے کی فلاح وفوز کا راز ہے۔ اور یہ بھی تو اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ وہ اپنے

بندے کی حمد وثنا کو اپنے بندے کی طرف ہی منسوب کرتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعریف کی، یہ بالکل اسی طرح جیسے اللہ تعالیٰ کسی کو مال ودولت سے نوازتا ہے۔ پھر اپنے بندوں سے قرض کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور اس قرض دینے یعنی اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے پر اپنے بندے کی تعریف کرتا ہے حالاں کہ سب مال ومتاع کا مالک تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔[1]

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ "الحمد للہ" کہنے کی نعمت، دنیا کی تمام نعمتوں سے افضل ہے۔ بلکہ حضرت بکر بن عبداللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((مَا قَالَ عَبْدٌ قَطُّ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اِلَّا وَجَبَتْ عَلَيْهِ نِعْمَةٌ بِقَوْلِهِ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، فَمَا جَزَاءُ تِلْكَ النِّعْمَةِ؟ جَزَاءُ هَا اَنْ يَّقُوْلَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، فَجَاءَ تْ أُخْرٰى، وَلَا تَنْفَدُ نِعَمُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ.))[2]

"انسان جب بھی الحمد للہ کہتا ہے اس پر الحمد للہ کہنے کی وجہ سے ایک اور نعمت لازم ہوگئی۔ اس نعمت کا کیا بدلہ ہے؟ اس کا بدلہ ہے کہ وہ پھر الحمد للہ کہے، یوں ایک اور نعمت حاصل ہوئی۔ اللہ کی نعمتیں ختم ہونے والی نہیں ہیں۔"

یعنی ادائے شکر پر ایک اور شکر لازم آتا ہے۔ کیوں کہ شکر کی توفیق بھی تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ پھر اس توفیقِ شکر پر پھر شکر۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: الحمد للہ کہنا نعمت ہے اور نعمت پر الحمد للہ کہنا بھی اللہ کی نعمت ہے اور بعض نعمتیں بعض سے سبقت لے جانے والی ہوتی ہیں۔ مثلاً نعمتِ شکر، نعمتِ مال، نعمتِ جاہ واولاد وغیرہ سے بہتر ہے۔[3]

---

[1] جامع العلوم والحكم: 214 رقم الحديث: 26 ملخصاً

[2] كتاب الشكر لابن ابي الدنيا: 17 [3] عدة الصابرين: 133

(۹) مقاماتِ حمد:

الحمد للہ کہنا اللہ تعالیٰ کے قرب ورضا کا باعث ہے اور یہ کلمہ اللہ کی حمد وثنا ہے، کلمۂ توحید ہے، کلمۂ شکر ہے، اور کلمۂ دعا بھی ہے۔ جس کا اہتمام مقصود ومحبوب ہے۔ مگر بعض اوقات اور مقامات پر اس کا اہتمام رسول اللہ ﷺ کی سنت اور بہت سی خیر وبرکات کا باعث ہے۔ ان تمام مقامات کا احاطہ تو یہاں مشکل ہے البتہ موضوع کی مناسبت سے بعض مواضع کا ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

۱: کھانے پینے کے بعد: اللہ تعالیٰ نے بھی حلال وطیب کھانا کھا کر شکر کا حکم دیا ہے۔ چناں چہ ارشاد فرمایا:

﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ۝﴾ [1]

”اے ایمان والو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا فرمائی ہیں اور اللہ کا شکر کرو اگر تم صرف اسی کی عبادت کرتے ہو۔“

صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ لَيَرْضٰى عَنِ الْعَبْدِ أَنْ يَّأْكُلَ الْأَكْلَةَ فَيَحْمَدَهُ عَلَيْهَا أَوْ يَشْرَبَ الشَّرْبَةَ فَيَحْمَدَهُ عَلَيْهَا.)) [2]

”بے شک اللہ اپنے اس بندے سے راضی ہوتا ہے جو کھانا کھاتا ہے تو اس پر اس کا شکر بجالاتا ہے یا پانی پیتا ہے تو اس پر بھی اس کا شکر کرتا ہے۔“

چناں چہ کھانے کے بعد ایک دعا حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے یوں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کھانا کھانے کے بعد یوں کہا:

---

[1] البقرة: 172 [2] مسلم: 2734

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ هٰذَا وَرَزَقَنِیْهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَلَا قُوَّةٍ غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ)) ①

''تمام تعریفیں تمام شکر اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے کھلایا اور میری کوشش اور قوت کے بغیر مجھے رزق عطا فرمایا۔ اس کے پہلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔''

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی چیز نوش جاں فرماتے تو یہ دعا پڑھتے:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَ وَسَقٰی وَسَوَّغَهٗ وَجَعَلَ لَهٗ مَخْرَجًا.)) ②

''تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے کھلایا، پلایا اور حلق سے بہ سہولت اتارا اور اس کے (فضلے کی صورت میں) نکلنے کا راستہ بنایا۔''

ان کے علاوہ بھی کھانے کے بعد کی ادعیۂ ماثورہ منقول ہیں ہم یہاں انہی دو دعاؤں کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

۲: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بستر مبارک پر لیٹتے تو یہ دعا پڑھتے:

'اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَكَفَانَا وَاٰوَانَا، فَكَمْ مِّمَّنْ لَا كَافِیَ لَهٗ وَلَا مُؤْوِیَ' ③

''سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے ہمیں کھلایا، پلایا اور ہمارے لیے کافی ہوگیا اور ہمیں جگہ دی ورنہ کتنے لوگ ہیں جنہیں کوئی کفایت کرنے والا نہیں اور نہ کوئی جگہ دینے والا ہے۔''

① الترمذی: 3458 وغیرہ ② ابو داود: 3851 وغیرہ ③ مسلم: 2715 وغیرہ

کیا۔ شائقین ''دعا اور دوا کے مسنون آداب'' مرتبہ مولانا عبدالخالق حفظہ اللہ اور ''حصن المسلم'' للشیخ سعید بن علی القحطانی ترجمہ مولانا حافظ عبدالسلام صاحب زید مجدہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۱۰) الحمد للہ کے بعض جامع کلمات:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حمد وثنا کی فضیلت اور اس کے اجر وثواب کا پہلے مختصراً ذکر ہوا ہے۔ اللہ کی حمد کا بہت جامع کلمہ وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ پاک کا آغاز کیا ہے۔ اور وہ ہے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ احادیث مبارکہ میں بھی بعض جامع کلماتِ تسبیح وتحمید کا ذکر آیا ہے۔ جن میں سے بعض کلمات کا ہم یہاں ذکر کرتے ہیں:

۱: پہلے ذکر ہوا ہے ((سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ)) یہ چار کلمات اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑے محبوب، بڑے افضل اور بڑی خیر وبرکات کے حامل ہیں۔ معراج کی رات حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آپ ﷺ سے فرمایا تھا کہ میرا سلام اپنی امت کو دینا اوران کلمات کو پڑھنے کا بتلانا۔[1]

ایک صحابی نے صحیح طور پر قرآن پاک نہ پڑھ سکنے کا عذر پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ کچھ کلمات بتلا دیجیے جو قرآنِ پاک نہ پڑھنے کی کمی کو کفایت کرسکیں۔ تو آپ ﷺ نے انہی کلماتِ اربعہ کے پڑھنے کا حکم دیا۔[2]

بعض روایات میں ان کے ساتھ ''ولا حول ولا قوۃ الا باللہ'' کا ذکر بھی آیا ہے۔

۲: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دو کلمے رحمٰن کے ہاں بڑے محبوب ہیں، پڑھنے میں نہایت آسان ہیں، میزان میں بڑے بھاری ہیں:

'سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ، سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ'[3]

---

① ترمذی، الصحیحۃ: 1550 ② احمد: 4/356,353، ابوداود، صحیح الترغیب: 1561، الارواء: 2/12 ③ بخاری: 7563 وغیرہ

''اللہ پاک ہے اپنی حمد کے ساتھ، پاک ہے اللہ عظمت والا۔''

۳: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص صبح وشام سو، سو مرتبہ یوں کہے: 'سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ' پاک ہے اللہ اپنی حمد کے ساتھ، تو قیامت کے روز کوئی شخص اس کے عمل سے افضل عمل لے کر نہیں آئے گا سوائے اس شخص کے جس نے اس کے برابر یا اس سے زیادہ مرتبہ یہ کلمہ کہا ہوگا۔[1] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ جو کوئی روزانہ سو مرتبہ 'سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ' پڑھتا ہے۔ اللہ اس کے (صغیرہ) گناہ معاف کردیتے ہیں اگرچہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔[2]

صحیح مسلم[3] میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ سب سے افضل کلام کون سا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا وہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے لیے منتخب کیا ہے اور وہ ہے: ((سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ))

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے عرش کا طواف کرنے والے فرشتوں کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ﴾[4]

''اور تو فرشتوں کو دیکھے گا عرش کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے اپنے ربّ کی حمد کے ساتھ تسبیح کررہے ہیں۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ مَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ﴾[5]

''وہ (فرشتے) جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو اس کے اردگرد ہیں اپنے ربّ کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔''

---

[1] مسلم: 2692 وغیرہ [2] مسلم: 2691 وغیرہ

[3] مسلم: 2731 [4] الزمر: 75 [5] غافر: 7

۴: حضرت سیّدہ جویریہ امّ المومنین رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز کے بعد میرے گھر سے باہر تشریف لے گئے میں (گھر کی) مسجد میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ضحیٰ کے وقت کے بعد واپس تشریف لائے اور میں بیٹھی ذکر اللہ میں مصروف تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب سے میں گیا ہوں تم اسی حالت میں بیٹھی ہوئی ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: میں نے تمہارے پاس سے جانے کے بعد چار کلمات تین دفعہ کہے ہیں اگر ان کا وزن اس ذکر سے کیا جائے جو آج تو نے کیا ہے تو ان تین مرتبہ کہے ہوئے چار کلمات کا وزن بڑھ جائے۔ وہ کلمات حسبِ ذیل ہیں:

((سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ عَدَدَ خَلْقِهٖ، وَرِضَا نَفْسِهٖ، وَزِنَةَ عَرْشِهٖ وَمِدَادَ كَلِمَاتِهٖ.))[1]

"اللہ پاک ہے اپنی حمد کے ساتھ جو اس کی مخلوق کی تعداد کے برابر اور اس کی رضا کے مطابق، اور اس کے عرش کے وزن کے برابر اور اس کے کلمات کی سیاہی کے برابر۔"

تسبیح وتحمید کے ان کلمات پر غور فرمایئے، ان سے مقصود اللہ تعالیٰ کی بے حد و بے شمار حمد وثنا ہے، کہ یہ اللہ کی مخلوق کے برابر، وہ کہاں کہاں ہے اور کیا ہے خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرما دیا ہے ﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ﴾ تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہ تحمید وتسبیح اس قدر کہ اللہ تعالیٰ اس پر راضی ہو جائے، یہ تحمید وتسبیح اللہ کے عرش کے وزن کے برابر، کرسی جو زمین اور اس کے اوپر ساتوں آسمانوں کو گھیرے ہوئے ہے عرش کے مقابلے میں ایسے ہے جیسے صحرا میں لوہے کا چھلاّ۔ پھر یہ تحمید وتسبیح اس کے کلمات کی سیاہی کے برابر، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا: کہ

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ

[1] مسلم: 2726 وغیرہ

تَنۡفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيۡ وَ لَوۡ جِئۡنَا بِمِثۡلِهٖ مَدَدًا ○ ﴾[1]

"کہہ دے اگر سمندر میرے ربّ کی باتوں کے لیے سیاہی بن جائے تو یقیناً سمندر ختم ہو جائے گا اس سے پہلے کہ میرے ربّ کی باتیں ختم ہوں، اگرچہ ہم اس کے برابر اور سیاہی لے آئیں۔"

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے کلمات ختم کیوں کر ہوں، نہ ابتدا نہ ان کی کوئی انتہا، جب کہ مخلوق کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی، لہٰذا مخلوق تو ختم ہو جائے گی مگر حی اور قیوم کے کلمات ختم نہیں ہوں گے۔ نیز فرمایا:

﴿وَ لَوۡ اَنَّ مَا فِي الۡاَرۡضِ مِنۡ شَجَرَةٍ اَقۡلَامٌ وَّ الۡبَحۡرُ يَمُدُّهٗ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ سَبۡعَةُ اَبۡحُرٍ مَّا نَفِدَتۡ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ○ ﴾[2]

"اور اگر واقعی ایسا ہو کہ زمین میں جو بھی درخت ہیں قلمیں ہوں اور سمندر کی سیاہی ہو، جس کے بعد سات سمندر اور ہوں تو بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی، یقیناً اللہ سب پر غالب کمال حکمت والا ہے۔"

یوں ساری مخلوق مل کر نہ اللہ کے کلمات کا احاطہ کر سکتی ہے نہ عرشِ الٰہی کے وزن کا اندازہ ہو سکتا ہے، نہ اللہ کی رضا کی برابری کا اور نہ ہی اللہ کی مخلوق کا شمار وقطار ہو سکتا ہے۔ اللہ کے کلمات تو لامحدود اور لامتناہی ہیں، لامحدود کمالات کا مالک لامحدود کلمات کے ذریعہ اپنے کمالات کا اظہار کرتا رہتا ہے تو کسی محدود کو کیا یارا ہے کہ ان کا احاطہ کر پائے......!

۵: حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: کہ ایک صاحب نماز کے لیے صف میں کھڑے ہوئے اس کی سانس تیز تیز تھی اس نے "اللہ اکبر" یعنی تکبیر تحریمہ کے بعد کہا:

((اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ حَمۡدًا كَثِيرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيهِ))[3]

---

[1] الکہف: 109 [2] لقمان: 27 [3] مسلم: 600 وغیرہ

''سب تعریفیں اللہ کے لیے، بہت زیادہ پاکیزہ اور بابرکت تعریفیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے یہ کلمات کہنے والا کون ہے؟ تو اس آدمی نے کہا میں ہوں، آپ نے فرمایا: میں نے بارہ فرشتوں کو دیکھا وہ جلدی کرتے تھے کہ ان میں سے کون ان کلمات کو اٹھائے۔

۶: حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے ایک ساتھی کو رکوع کے بعد چھینک آئی تو اس نے کہا:

'اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْدًا كَثِيرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيهِ، مُبَارَكًا عَلَيْهِ كَمَا يُحِبُّ رَبُّنَا وَيَرْضَى'[1]

بخاری شریف[2] میں چھینک آنے کا ذکر نہیں ہے اور الفاظ الحمد للہ کی جگہ 'ربنا ولك الحمد' الخ ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چھینک رکوع کے بعد آئی ہو اور یہ کلماتِ حمد پڑھے ہوں، یوں دونوں روایات میں تطبیق ہوجاتی ہے۔ رسولِ کریم ﷺ نے جب یہ کلمات سنے تو فرمایا: یہ کلمات کہنے والا کون تھا؟ کسی نے جواب نہ دیا آپ ﷺ نے تین بار یہی سوال دہرایا تو حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا میں نے یہ کلمات کہے ہیں۔

آپ نے فرمایا: ''میں نے تیس سے زائد فرشتوں کو دیکھا وہ ان کو لکھنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے رہے تھے کہ کون انہیں پہلے لکھتا ہے۔''

۷: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بتلایا:

'اِنَّ عَبْداً مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ قَالَ: ''يَا رَبِّ! لَكَ الْحَمْدُ كَمَا يَنْبَغِي لِجَلَالِ وَجْهِكَ وَلِعَظِيمِ سُلْطَانِكَ''

''اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے نے کہا: اے میرے رب! سب تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں۔ جیسے آپ کی عظمت وجلال کے اور آپ کی عظیم بادشاہت

---

[1] النسائی: 932 وغیرہ [2] بخاری: 799 وغیرہ

دو فرشتے بہت جلدی کر رہے تھے اور نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ ان کو کیوں کر لکھیں۔ وہ آسمان پر گئے تو اللہ ربّ العزت سے کہنے لگے :اے اللہ! تیرے ایک بندے نے ایک بات کہی ہے ہم نہیں سمجھتے کہ اسے کیوں کر لکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اس کے بندے نے کیا کہا ہے۔) میرے بندے نے کیا کہا ہے؟ انہوں نے کہا اے اللہ! اس نے یوں کہا ہے: ''یَا رَبِّ! لَكَ الْحَمْدُ كَمَا يَنْبَغِيْ لِجَلَالِ وَجْهِكَ وَلِعَظِيْمِ سُلْطَانِكَ ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

((اَكْتُبَاهَا كَمَا قَالَ عَبْدِيْ حَتّٰى يَلْقَانِيْ فَاَجْزِيَه' بِهَا)) [1]

''جس طرح میرے بندے نے کہا تم اسی طرح لکھ دو، جب وہ مجھے ملے گا تو میں اسے اس کی جزا دوں گا۔''

علامہ المنذری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے : اس کی سند متصل اور راوی ثقہ ہیں، مگر صدقہ بن بشیر کے بارے میں جرح وتعدیل مجھے مستحضر نہیں۔ علامہ البانی نے ضعیف الترغیب میں اسے ذکر کر کے صدقہ کو مجہول قرار دیا ہے۔ حالاں کہ امام ابن ماکولا نے الاکمال [2] میں اسے ثقہ کہا ہے۔ لہٰذا یہ روایت ضعیف نہیں بلکہ صحیح ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا پر مشتمل ایک دعا قبل ازیں ''الحمد للہ کہنا بہت بڑی نعمت'' کے ضمن میں بھی نقل کر آئے ہیں۔ ہم انہی کلمات کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔ شائقین الترغیب والترہیب اور ادعیہ مسنونہ پر مشتمل دیگر کتب کی مراجعت فرمائیں۔

(۱۱) الحمد للہ کہنے کے بارے میں اسلاف کا عمل

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حمد وثنا کا کس قدر اہتمام فرماتے تھے اس کا بقدر ضرورت ذکر ہم نے کیا۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہر حال میں اللہ کی حمد وثنا کرتے، با کثرت تحمید وتسبیح پڑھنے کی ترغیب دیتے، مختلف اور اچھے سے اچھے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی تعریف میں رطب اللسان رہنے کی تلقین وتاکید فرماتے تھے۔

---

[1] ابن ماجه :3801، طبراني : 13297، التهذيب للمزي : 75/9 [2] الاكمال :290/1

حمد وثنا کے اہتمام اور کبر ونخوت سے اجتناب کا جو نسخۂ شافی آپ نے بتلایا ہے اگر وہ پیشِ نگاہ رہے تو انسان کا سر ہمیشہ شکر وامتنان میں جھکا رہتا ہے اور زبان اس منعم کے انعامات پر ثنا خوانی کیے بغیر نہیں رہتی۔ چناں چہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اُنْظُرُوْا اِلٰی مَنْ هُوَ اَسْفَلَ مِنْكُمْ، وَلَا تَنْظُرُوْا اِلٰی مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ)) ①

''اپنے سے اوپر والے کی طرف مت دیکھو بلکہ اپنے سے نیچے والے کی طرف دیکھو۔''

انسان جس طبقہ سے تعلق رکھتا ہے یا جس حالت میں زندگی بسر کرتا ہے اسے اپنے سے نیچے کی طرف دیکھنا چاہیے۔ اگر کوئی غریب ہے تو اپنے سے زیادہ غریب کو دیکھ کر اللہ کا شکر کرنا چاہیے۔ اگر کوئی بیمار ہے تو اپنے سے زیادہ بیمار کو دیکھ کر اللہ کا شکر کرنا چاہیے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ نے پہلے فراوانی عطا فرمائی پھر اس سے یہ نعمت چھین لی تو وہ اس پر بھی اللہ کی حمد وثنا کرتا تھا۔ غربت ومسکنت میں اس کی حالت یہ ہوگئی کہ سوائے بوریے بستر کے اور کوئی چیز اس کے پاس نہ رہی مگر اس حالت میں بھی وہ اللہ کی حمد وثنا کرتا تھا۔ دوسرے صاحبِ ثروت نے اسے کہا: بستر کے سوا تیرے پاس اور کچھ بھی نہیں تو حمد وثنا کس نعمت کی بنا پر کرتا ہے؟ اس نے کہا: میں اللہ کی تعریف اس لیے کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اگر مجھے وہ کچھ عطا فرمائے جو دوسروں کو دے رکھا ہے تو میں شاید وہ کسی اور کو نہ دے سکوں۔ اس نے کہا: کیا مطلب؟ اس نے کہا: تیری آنکھ، تیری زبان، تیرے ہاتھ اور پاؤں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ②

یعنی یہ کوئی کم نعمتیں ہیں، کیا ان پر اللہ کا شکر نہ کروں؟

① مسلم: 2963 وغیرہ ② عدۃ الصابرین: 132

امام محمد بن واسع رحمہ اللہ کا شمار بصرہ کے کبار اہلِ علم میں ہوتا ہے۔ ان کے علم وفضل اور زہد وتقویٰ کا اس سے اندازہ لگایئے کہ سلیمان تیمی رحمہ اللہ جیسے محدث اور شب زندہ دار امام فرماتے تھے: میں اللہ تعالیٰ سے ملوں تو میرا نامۂ اعمال محمد بن واسع رحمہ اللہ جیسا ہونا چاہیے۔[1]

عبدالعزیز بن ابی داود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام محمد بن واسع رحمہ اللہ کے ہاتھ پر بڑا خوف ناک زخم ہوا تو میں انہیں ملنے کے لیے گیا تو انہوں نے میری پریشانی دیکھ کر فرمایا: کیا آپ کو علم ہے کہ ہاتھ پر زخم کی وجہ سے اللہ کا مجھ پر کس قدر احسان ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ زخم میری ٹھوڑی، میری زبان یا میری شرمگاہ پر نہیں۔ اس لیے اس زخم کی کوئی ایسی فکر نہیں۔[2]

لہٰذا کسی بیماری یا پریشانی پر فکر مندی گو ایک طبعی امر ہے مگر اس حالت میں بھی یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے بڑی یا اس سے بھی خوفناک مصیبت میں مبتلا نہیں کیا۔ یوں یہ تکلیف بڑی تکلیف کے مقابلے میں نعمت ہے۔ بلکہ اس تکلیف میں اگر خوش نصیب کو لذتِ مناجات کی نعمت حاصل ہوجائے یا توبہ واستغفار کی توفیق مل جائے تو اس بیماری کے نعمت ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے؟

بسا اوقات کوئی تکلیف کسی بڑی مصیبت سے بچاؤ کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے۔ عثمان بن ہیثم بصری رحمہ اللہ عبیداللہ بن زیاد کے عہدِ گورنری میں سپہ سالار تھے۔ ایک روز اچانک مکان کی چھت سے گرے تو دونوں پاؤں ٹوٹ گئے۔ امام عبداللہ بن زید ابوقلابہ رحمہ اللہ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے تو تسلی دیتے ہوئے فرمایا امید ہے اس میں بھی اللہ کے ہاں کوئی بہتری ہوگی۔ عثمان کہنے لگے کیا بہتری؟ پاؤں تو دونوں ٹوٹ گئے ہیں۔ امام ابوقلابہ رحمہ اللہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے بہت سی حقیقتوں کو تم سے چھپا رکھا ہے۔ ابھی تین دن نہیں گزرے تھے کہ عبید اللہ بن زیاد کا پیغام آیا کہ حضرت سیّدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے خلاف لڑائی کے لیے تیار ہوجاؤ۔ عثمان نے اپنی معذوری ظاہر کردی اور قاصد کو صورتِ حال سے آگاہی کا کہہ دیا۔ عثمان کہتے ہیں

[1] تہذیب: 500/9 [2] عدۃ الصابرین: 140

سات دن گزرے تھے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر مل گئی۔ عثان کہا کرتے تھے 'رَحِمَ اللّٰهُ اَبَا قِلَابَةَ لَقَدْ صَدَقَ أنَّه' کَانَ خَيْرَةً لِّيْ' ابوقلابہ پر اللہ کی رحمتیں ہوں انہوں نے سچ فرمایا تھا کہ پاؤں ٹوٹ جانے میں بھی میرے لیے بہتری ہے۔[1]

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے کہ

﴿وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾[2]

''اور یقیناً ہم انہیں قریب ترین عذاب کا کچھ حصہ سب سے بڑے عذاب سے پہلے ضرور چکھائیں گے تاکہ وہ پلٹ آئیں۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اس سے دنیا کے مصائب وآلام اور بیاری مراد ہے۔ ان سے اگر عبرت ونصیحت حاصل ہوجائے اور توبہ کی توفیق مل جائے تو یہ مصیبت وبیاری بھی نعمت اور باعثِ رحمت بن جاتی ہے۔

امام ابوقلابہ عبداللہ بن زید رحمہ اللہ بصرہ کے کبار فقہاء ومحدثین اور اہل اللہ میں شمار ہوتے ہیں۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے کتاب الثقات میں ان کے آخری دور کا عجیب واقعہ ذکر کیا ہے۔ انہیں عہدۂ قضا پیش کیا گیا تو وہ بصرہ چھوڑ کر مصر کے قریب جا بسے تھے۔ عبداللہ بن محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں ساحلِ سمندر کے پاس ایک رباط کے پاس سے گزرا تو ایک خیمہ میں ایک شخص کو دیکھا بیاری سے اس کے ہاتھ اور پاؤں ضائع ہوگئے تھے۔ سماعت وبینائی اور اس کے دیگر اعضاء کمزور ہوگئے تھے۔ میں نے سنا وہ کہہ رہا تھا:

((اَللّٰهُمَّ اَوْزِعْنِیْ اَنْ اَحْمَدَكَ حَمْدًا اُكَافِئُ بِهٖ شُكْرَ نِعْمَتِكَ الَّتِیْ اَنْعَمْتَ بِهَا عَلَیَّ وَفَضَّلْتَنِیْ عَلٰی كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْتَ تَفْضِيْلًا))

---

[1] ابن عساکر: 308,307/28 [2] السجدہ: 21

''اے اللہ! میری اعانت فرما کہ میں تیری ایسی حمد کہوں جو تیری ان نعمتوں کے شکر پر پورا اتر پائے جو آپ نے مجھ پر کر رکھی ہیں اور اپنی بہت سی مخلوق پر مجھے فضیلت عطا فرمائی ہے۔''

عبداللہ بن محمد رحمہ اللہ کہتے ہیں میں نے کہا اس سے مجھے ضرور ملنا چاہیے اور پوچھنا چاہیے کہ یہ کلمات تم نے کہیں سے سیکھے ہیں یا تمہیں ان کا الہام ہوا ہے۔ چناں چہ میں اس کے پاس گیا اور اس سے دعائیہ کلام کے بارے میں پوچھا اور یہ بھی دریافت کیا کہ آپ کس نعمت پر حمد وشکر ادا کرتے ہیں اور اللہ نے کس فضیلت سے آپ کو نوازا ہے؟ تو اس نے کہا میری حالت تو تم دیکھ رہے ہو۔ اگر اللہ آسمان سے آگ برسا کر مجھے راکھ کر دے، پہاڑوں کو حکم دے اور وہ مجھے پیس کر رکھ دیں، دریا کو حکم دے اور وہ مجھے پانی میں غرق کر دے، زمین کو حکم دے تو وہ مجھے اپنے اندر دھنسا دے لیکن میری زبان پر جو نعمت جاری ہے اس کی بنا پر تو میں اللہ کا شکر ہی کروں گا۔

پھر اس نے کہا: عبداللہ تم آئے ہو تو ایک کام کر دو، میں یہاں بے کار پڑا ہوں میرا بیٹا تھا جو مجھے نماز کے لیے وضو کروا دیتا تھا۔ میرے کھانے پینے میں معاون تھا۔ تین دن سے وہ میرے پاس نہیں آیا اگر ہوسکتا ہے تو اسے تلاش کرو۔ میں نے کہا اس سے بڑی خدمت اور کیا ہوگی اور کسی انسان کی خدمت میں اس سے بڑا اجر وثواب اور کیا ہوگا۔ چناں چہ میں تلاش کے لیے نکل پڑا۔ میں تھوڑی ہی دور گیا تو کیا دیکھتا ہوں ایک انسان کو درندہ نوچ رہا ہے۔ میں نے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھا اور واپس پلٹ آیا۔ میں نے انہیں سلام کہا، انہوں نے سلام کا جواب دیا، پھر فرمایا میرے کام کا کیا بنا؟ میں نے ان سے کہا آپ یہ بتلائیں کہ آپ اللہ کے ہاں مکرم ہیں یا حضرت ایوب علیہ السلام؟ انہوں نے کہا ایوب علیہ السلام، میں نے کہا آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے کیا معاملہ کیا تھا اور ان کے مال، آل اولاد کے ذریعے سے کیسے آزمایا تھا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں کیسا پایا؟ وہ فرمانے لگے: ((وَجَدَهُ صَابِرًا شَاكِرًا

حَامِداً)) اللہ نے انہیں صابر، شاکر، حامد پایا۔ میں نے کہا آپ کا بیٹا دو ٹیلوں کے مابین درندہ جانور کے قبضہ میں دیکھا گیا اور وہ گوشت نوچ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر کی توفیق دے اور اس عظیم صدمہ کا اجر عطا فرمائے۔ یہ سن کر اس نے کہا:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَمْ یَخْلُقْ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ خَلْقاً یَعْصِیْهِ فَیُعَذِّبَهٗ بِالنَّارِ، ثُمَّ اسْتَرْجَعَ وَشَهِقَ شَهْقَةً فَمَاتَ))

''سب تعریفیں اللہ کے لیے جس نے میری اولاد میں کسی کو اپنا نافرمان نہیں بنایا کہ وہ اسے آگ میں ڈال دے پھر اس نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھا، سسکی لی اور فوت ہو گئے۔''

میں نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھا، پریشان ہو گیا کہ اب کیا کروں انہیں چھوڑ جاتا ہوں تو درندے انہیں بھی کھا جائیں گے۔ اگر پاس بیٹھوں تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے کپڑے سے ڈھانپ دیا اور ان کے پاس بیٹھا رونے لگا۔ اسی اثنا میں چار آدمی آئے انہوں نے کہا: عبداللہ کیا معاملہ ہے؟ میں نے سارا قصہ انہیں سنا دیا۔ انہوں نے کہا: اس کا چہرا دکھاؤ۔ میں نے کپڑا چہرے سے اٹھایا تو وہ اس کی آنکھوں اور ہاتھوں کو چومنے لگے۔ میں نے کہا: یہ کون ہیں؟ انہوں نے بتلایا: یہ ابوقلابہ الجرمی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں۔ اللہ سے اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے والے تھے۔ ہم نے ان کے غسل وکفن کا انتظام کیا اور دفن کر دیا۔ اور میں اپنے رباط کی طرف لوٹ آیا۔ رات کو سویا تو کیا دیکھتا ہوں وہی ابوقلابہ رحمہ اللہ جنت کے باغوں میں ہیں جنت کا ریشمی لباس پہنے ہوئے ہیں اور کہہ رہے ہیں:

﴿سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾ [1]

[1] الرعد: 24

"سلام ہو تم پر اس کے بدلے جو تم نے صبر کیا، سو اچھا ہے اس گھر کا انجام۔"

میں نے کہا: آپ وہی صاحب ہیں؟ کہنے لگے: ہاں۔ میں نے کہا یہ مقام کیسے حاصل ہوا؟ فرمانے لگے:

'اِنَّ لِلّٰهِ دَرَجَاتٍ لَا تَنَالُ اِلَّا بِالصَّبْرِ عِنْدَ الْبَلَاءِ، وَالشُّكْرِ عِنْدَ الرَّخَاءِ مَعَ خَشْيَةِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ'

"اللہ کے ہاں بہت سے درجات ہیں جنہیں مصائب میں صبر کرنے، آسائش میں شکر بجا لانے کے ساتھ ساتھ ظاہر و باطن میں اللہ سے ڈرتے رہنے سے حاصل ہوتے ہیں۔"

امام ابن حبان رحمہ اللہ نے یہ قصہ الثقات[1] میں امام ابوقلابہ رحمہ اللہ کے ترجمہ میں ذکر کیا ہے۔

اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے سیر اعلام النبلاء[2] میں بھی اختصاراً اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر حال میں ہمیں بھی اپنی حمد اور اپنے شکر کی توفیق عطا فرمائے اور آفات وبلیات سے محفوظ رکھے۔ اور ہمیں کسی آزمائش وامتحان میں مبتلا نہ کرے۔ اور اپنی بخشش ومغفرت سے نوازے، آمین۔

فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

حمد وثنا، شکر وسپاس اس اللہ کے لیے جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے۔ "فَاطِر" یہ "فَطَرَ" سے اسم فاعل ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسمائے صفاتیہ میں سے ایک اسم ہے۔ "فَطَرَ" کے معنی پھٹن اور شگاف کے ہیں۔ اسی سے اس کی جمع "فطور" ہے۔

① الثقات: 5/3-5 ② اعلام النبلاء: 4/474

قرآنِ مجید میں ہے:

﴿الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ هَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ ۝﴾ [1]

''وہ جس نے سات آسمان اوپر نیچے پیدا فرمائے، رحمان کے پیدا کیے ہوئے میں تو کوئی کمی بیشی نہیں دیکھے گا۔ پس نگاہ کو لوٹا، کیا تجھے کوئی کٹی پھٹی جگہ نظر آتی ہے۔''

''کمأۃ'' (کھمبی) ایک پودا ہے جس کو ''فَطَرٌ'' بھی کہتے ہیں کیوں کہ وہ زمین کو پھاڑ کر باہر نکلتا ہے۔ اسی سے فطر وافطار، روزہ افطار کرنا کہا جاتا ہے۔ ایک سورت کا نام ''الانفطار'' ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ﴾ ''جب آسمان پھٹ جائے گا۔''

آج جس آسمان میں کوئی پھٹن، کوئی شگاف وخلل نظر نہیں آتا۔ ایک وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا۔

''فَطَرَ'' کے معنی ابتدا ومبتدا کے بھی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ میں ''فاطر'' کے معنی نہیں سمجھتا تھا۔ دو اعرابی آئے دونوں ایک کنویں کے بارے میں باہم اختلاف کر رہے تھے ان میں سے ایک نے کہا: ''اَنَا فَطَرۡتُهَا'' میں نے اس کی ابتدا کی ہے، میں نے اسے کھودا ہے۔ جس سے ''فاطر'' کے معنی کی وضاحت ہوگئی۔ [2]

لیکن اس کی سند صحیح یا حسن نہیں، سفیان بن وکیع ضعیف اور ابراہیم بن مہاجر البجلی متکلم فیہ ہے۔ تاہم ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی معنی مراد لیے ہیں، انہوں نے فرمایا ہے: 'فَاطِرِ السَّمٰوَاتِ' کے معنی 'بَدِیۡعُ السَّمٰوَاتِ' ہیں۔ یعنی آسمانوں کی ابتدا کرنے والا۔ [3]

بعض نے فاطر کے معنی ''خالق'' بھی کیے ہیں۔ بہر حال جب اللہ تعالیٰ کی

---

[1] الملك: 3 [2] ابن جریر: 101/7، ابن کثیر: 721/3 [3] ابن کثیر وغیرہ

طرف سے فَاطِرٌ، جَاعِلٌ کے الفاظ کہے جائیں تو اس سے مراد، پیدا کرنے والا، بنانے والا، ابتدا کرنے والا ہے۔

''فاطر'' میں ایک اور لغوی معنویت بھی پائی جاتی ہے۔ چناں چہ قرآنِ پاک میں آسمانوں اور زمین کے بارے میں آیا ہے:

﴿اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا﴾ ①

''بے شک سارے آسمان اور زمین آپس میں ملے ہوئے تھے تو ہم نے انہیں (پھاڑ کر) الگ کیا۔''

رَتْقٌ کے معنی یکجا، ایک دوسرے سے ملا ہوا ہونے کے ہیں۔ اور فَتْقٌ کے معنی جدا جدا اور پھاڑنے کے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان اور زمین باہم ایک مادہ کی صورت میں ملے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے پھاڑ کر دونوں کو جدا جدا کر دیا۔ ایک نے آسمان کی شکل دھار لی اور دوسرے نے زمین کی۔ ایسی صورت میں لفظ ''فاطر'' میں ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ قرآنِ پاک میں اور ادعیۂ مسنونہ میں اللہ تعالیٰ کی اسی صفت ''فاطر'' کے توسط سے دعا کرنے کا ذکر آیا ہے۔ اور دعا میں بھی ایک حالت سے دوسری حالت میں بدل جانا مطلوب ہوتا ہے۔ جیسے بیماری کی بجائے صحت وتندرستی، فقر ومسکنت کی جگہ تونگری اور آسودگی، بے چینی وبیقراری کی بجائے اطمینان وسکون وغیرہ۔

قرآنِ مجید میں چھ مقامات پر اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا ذکر ہوا ہے۔ چناں چہ ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ ②

''ان کے رسولوں نے کہا، کیا اللہ کے بارے میں کوئی شک ہے جو آسمانوں اور زمین کو بنانے والا ہے۔''

① الانبیاء: 30 ② ابراھیم: 10

کوئی چیز اپنے خالق وصانع کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔ ایک معمولی چیز جب صانع کے بغیر خود بخود نہیں بن سکتی تو یہ آسمان اور زمین بغیر کسی صانع اور خالق کے خود بخود وجود میں کیسے آ گئے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی تو انہوں نے فرمایا:

﴿قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الَّذِىْ فَطَرَهُنَّ وَ اَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ۝﴾ [1]

"کہا: بلکہ تمہارا رب، آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ جس نے انہیں پیدا کیا اور میں اس پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں۔"

حضرت سیّدنا یوسف علیہ السلام کی دعا کے الفاظ ہیں:

﴿رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِىْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِىْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَنْتَ وَلِىّٖ فِى الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ج تَوَفَّنِىْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِىْ بِالصّٰلِحِيْنَ۝﴾ [2]

"اے میرے ربّ! بے شک تو نے مجھے حکومت سے حصہ دیا اور باتوں کی اصل حقیقت میں سے کچھ سکھایا، آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے! دنیا اور آخرت میں تو ہی میرا یارومددگار ہے، مجھے مسلم ہونے کی حالت میں فوت کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔"

حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ سے کچھ طلب کرنے سے پہلے، اللہ کے انعامات واحسانات کا اعتراف کیا پھر اللہ تعالیٰ کی صفت ﴿فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ سے دعا کی۔ مولائے کریم! آپ زمین وآسمان بنانے اور انہیں سنوارنے پر قادر ہیں۔ میری حالت بھی سنوار دے، میرے حالات سازگار بنا دے، آپ ہی دنیا وآخرت میں

[1] الانبياء: 56 [2] يوسف: 101

میرے معاون ومددگار ہیں۔ اس دعا کی جامعیت دیکھئے کہ اس میں توحید کا اقرار، ربّ تعالیٰ کی اطاعت کا اظہار، اپنی بے بسی اور مسکنت کا اعتراف، غیر اللہ سے لاتعلقی کا اظہار، اسلام پر موت کی اور صالحین کی رفاقت کی طلب، اس کی طلب اللہ سے کہ جو موت وحیات کا مالک ہے۔ اور قیامت کا بھی اس میں اعتراف۔ ملخصاً [1]

اللہ تعالیٰ کی اسی صفت فاطر کا ذکر قرآنِ مجید میں دیگر مقامات پر بھی آیا ہے۔ [2] ادعیۂ مسنونہ میں بھی اس کا ذکر ہے۔ چناں چہ صدیقۂ کائنات حضرت عائشہ امّ المومنین رضی اللہ عنہا سے حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ جب رات کی نماز پڑھتے تو اس کی ابتدا میں کیا پڑھتے تھے؟ انہوں نے فرمایا:

((كَانَ اِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ افْتَتَحَ صَلَاتَهُ: اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَائِيلَ وَمِيكَائِيلَ وَاِسْرَافِيلَ، فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ، عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ، اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيمَا كَانُوْا فِيهِ يَخْتَلِفُوْنَ، اِهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ اِنَّكَ تَهْدِيْ مِنْ تَشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ)) [3]

’’جب رات کو اٹھتے نماز کی ابتدا (ان کلمات سے) کرتے، اے اللہ! جبرائیل، میکائیل، اسرافیل کے ربّ، آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے، غائب اور حاضر کو جاننے والے، اپنے بندوں کے مابین آپ ہی اس چیز کے متعلق فیصلہ کریں گے جس میں وہ اختلاف کرتے تھے، حق کی جن باتوں میں اختلاف ہوگیا آپ اپنے حکم سے مجھے حق کی ہدایت عطا فرما دیں، آپ جسے چاہتے ہیں سیدھی راہ کی طرف ہدایت دیتے ہیں۔‘‘

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل روایت میں ہے کہ آپ

---

[1] الفوائد لابن قیم: 190 [2] الزمر:46، الشوریٰ:11 [3] مسلم: 770

جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو یوں فرماتے:

وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ الخ ①

''میں نے اپنا چہرہ یک طرفہ ہوکر اس ہستی کی طرف پھیر لیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکوں میں سے نہیں۔ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی، میری موت اللہ ربّ العالمین کے لیے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، مجھے یہی حکم دیا گیا ہے اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔'' الخ

ایک اور روایت میں جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اسی صفت کے حوالے سے دعا کے الفاظ مروی ہیں، جنہیں صبح وشام اور سوتے وقت پڑھنے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے:

'اَللّٰهُمَّ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ، فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ، رَبَّ كُلِّ شَيْءٍ وَمَلِيْكَهٗ، اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِيْ وَمِنْ شَرِّ الشَّيْطَانِ وَشِرْكِهٖ' ②

''اے اللہ! غیب اور حاضر کو جاننے والے، آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے، ہر چیز کے پروردگار اور مالک، میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، میں تیری پناہ مانگتا ہوں اپنے نفس کے شر اور شیطان کے شر اور اس کے شرک سے۔''

''السمٰوٰت'' سماء کی جمع ہے جس کا اطلاق ہر چیز کے بالائی حصہ پر ہوتا ہے۔ آسمان، زمین اور اس پر بسنے والی مخلوق، بلکہ آسمان کے نیچے کی ہر چیز سے اوپر ہے اسی لیے اس کو آسمان کہتے ہیں۔ قرآنِ پاک ہی میں ''السماء'' کا اطلاق بارش پر بھی

---

① مسلم: 771 ② ترمذی: 3392، الصحیحۃ: 2753

ہوا ہے۔ کیوں کہ وہ بھی اوپر سے آتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا﴾ ①

''اور ہم نے ان پر موسلا دھار بارش برسائی۔''

حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ اللہ سے بخشش طلب کرو۔ ﴿يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا﴾ ② ''وہ تم پر بہت برستی ہوئی بارش اتارے گا۔'' یہ بارش اوپر سے آتی ہے اس لیے اسے ''السماء'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور کبھی اسے آسمان سے نازل ہونے سے تعبیر کیا گیا ہے جیسا کہ اکثر قرآنِ پاک میں وارد ہوا ہے۔

''السمٰوٰت'' جمع کا لفظ ہے اور قرآنِ مجید میں وضاحت ہے کہ وہ سات ہیں۔ چناں چہ ارشاد فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَ هُوَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ۝﴾ ③

''وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے سب تمہارے لیے پیدا کیا، پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا، پس انہیں درست کر کے سات آسمان بنا دیا اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''

اس کے علاوہ سات آسمانوں کا ذکر فصلت:۱۲، المؤمنون:۸۶، الطلاق:۱۲، الملک:۳، نوح:۱۵ میں بھی ہے جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ آسمان منتہائے نظر کا نام نہیں۔

یہ ساتوں آسمان ایک دوسرے کے اوپر ہیں۔

﴿اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝﴾ ④

''کیا تم نے دیکھا نہیں کہ کس طرح اللہ نے سات آسمانوں کو اوپر تلے پیدا فرمایا۔''

① الأنعام: 6 ② نوح: 11 ③ البقرة: 29 ④ نوح: 15

آسمان ہی کے بارے میں فرمایا:

﴿وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا﴾ ①

''اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا۔

گویا یہ بڑی مضبوط چھت ہے۔ اس میں بڑے مضبوط برج یعنی قلعے ہیں۔ قرآن میں ایک سورۃ کا نام ہی اس مناسبت سے ''البروج'' ہے۔ ﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ﴾ ''قسم ہے برجوں والے آسمان کی۔'' ان قلعوں کی حیثیت یوں محسوس ہوتی ہے کہ یہ آسمان کی چھت کی مضبوطی کا باعث بھی ہیں۔ جیسے زمین پر پہاڑ ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ الْجِبَالَ اَوْتَادًا﴾ ②

''اور کیا ہم نے پہاڑوں کو میخیں نہیں بنا دیا۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَ اَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ﴾ ③

''اور اس نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے کہ وہ تمھیں ہلا نہ دے۔''

اس کی گردش اور رفتار میں انضباط رہے۔ اور غیر طبعی حرکت سے بربادی نہ ہو۔ غالباً اسی انداز پر آسمانوں میں بروج ہیں۔ اور یہ اس لیے بھی کہ یہ ''بروج'' آسمان کے خطوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کا سبب بنیں۔ (واللہ اعلم)

آسمان میں جیسے علیحدہ علیحدہ خطوں میں برجوں میں اس طرح اس میں آنے جانے کے لیے بہت سے دروازے بھی ہیں۔ چناں چہ ارشاد فرمایا:

﴿وَ لَوْ فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِیْهِ یَعْرُجُوْنَ﴾ ④

''اور اگر ہم ان پر آسمان سے کوئی دروازہ کھول دیں، پس وہ دن بھر اس

① الانبیاء: 32 ② النبا: 7 ③ النحل: 15 ④ الحجر: 14

میں چڑھتے رہیں۔"

حدیث معراج میں ہے کہ جب مجھے آسمان کی طرف لے جایا گیا:

' فَضَرَبَ بَابًا مِنْ اَبْوَابِهَا، فَنَادَاهُ أَهْلُ السَّمَاءِ مَنْ هَذَا؟ فَقَالَ: جِبْرِيْلُ قَالُوْا: وَمَنْ مَّعَكَ؟ قَالَ: مَعِيَ مُحَمَّدٌ 'الحديث ①

"تو جبریل علیہ السلام نے آسمان کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کھٹکھٹایا تو آسمان والے فرشتوں نے کہا: کون؟ تو کہا: جبریل، انہوں نے کہا: آپ کے ساتھ اور کون ہے؟ جبریل علیہ السلام نے کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔"

آسمان کے دروازوں کے بارے میں اور احادیث بھی ہیں۔

آسمان محض ایک مضبوط چھت ہی نہیں بلکہ یہ چھت اپنی خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ٥﴾ ②

"اور قسم ہے آسمان کی جو راستوں والا ہے۔"

"الحبک" کے معنی راستے بھی ہیں اور ان لہروں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو تیز ہوا سے ریت کے ٹیلوں پر بن جاتی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی کے معنی "الخلق الحسین" خوب صورت مخلوق کیے ہیں۔ ③

آسمان کو تاروں سے مزین کیا، جس کا ذکر قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر ہے۔ بادلوں کی مختلف شکلیں اور ان میں سے آسمان کا منظر عجیب سماں باندھتا ہے۔

سات آسمانوں کے علاوہ زمین کے بارے میں قرآنِ مجید میں صرف ایک مقام پر اشارۃً فرمایا گیا ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴾ ④

"اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور زمین سے بھی ان کی مانند۔"

---

① بخاری: 7517 ② الذاريات: 7 ③ فتح الباری: 293/6، البداية: 30/1 ④ الطلاق: 12

بعض مفسرین نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ مثلیت کا تعلق آسمانوں کی تعداد سے نہیں بلکہ اس کا تعلق ''خلق'' سے ہے کہ اللہ تعالیٰ جس طرح آسمانوں کا خالق ہے اسی طرح زمین کا بھی وہی خالق ہے۔ ①

جب کہ بعض نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد سات زمینیں ہیں بلکہ یہ بھی کہ جیسے اس زمین پر انسان بستے ہیں اور ان کی ضروریاتِ زندگی اس سے پوری ہو رہی ہیں اسی طرح باقی زمینوں پر بھی آبادی ہے۔ چناں چہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جب ان کے تلمیذ رشید امام مجاہد رحمہ اللہ نے اسی آیت کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: اگر میں اس کی تفسیر لوگوں کے سامنے بیان کروں تو لوگ کافر ہو جائیں گے اور ان کا کفر اس حقیقت کا انکار ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح کا قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ ②

بلکہ امام ابن جریر رحمہ اللہ وغیرہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

'سَبْعُ اَرَضِيْنَ فِيْ كُلِّ اَرْضٍ نَبِيٌّ كَنَبِيِّكُمْ وَآدَمُ كَآدَمَ وَنُوْحٌ كَنُوْحٍ وَاِبْرَاهِيْمُ كَاِبْرَاهِيْمَ وَعِيْسٰى كَعِيْسٰى' ③

''سات زمینیں ہر زمین پر تمہارے نبی جیسا نبی ہے آدم جیسا آدم، نوح جیسا نوح، ابراہیم جیسا ابراہیم اور عیسیٰ جیسا عیسیٰ علیہم السلام۔''

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ نے تو اس کو صحیح قرار دیا بلکہ فرمایا ہے کہ اس کو صحیح ماننے میں نہ عقلاً کوئی چیز مانع ہے نہ شرعاً۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ ہر زمین میں ایک مخلوق ہے جو ایک اصل کی طرف لوٹتی ہے جس طرح اولادِ آدم ہماری زمین میں آدم علیہ السلام کی طرف لوٹتی ہے۔ اور ان میں ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو دوسروں کی نسبت ممتاز ہیں جیسے ہمارے ہاں نوح اور ابراہیم وغیرہما علیہما السلام ہیں۔ ④

---

① روح المعانی ② ابن کثیر: 494/4

③ ابن جریر: 153/28 ④ روح المعانی: 125/8

بلکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری[1] میں اور امام حاکم[2] رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے تلخیص المستدرک میں اگرچہ کوئی کلام نہیں کیا مگر کتاب العلو میں اس پر نقد کیا ہے اور فرمایا ہے:

((هَذِهِ بَلِيَّةٌ تُحَيِّرُ السَّامِعَ، كَتَبْتُهَا اسْتِطْرَاداً لِلتَّعَجُّبِ وَهُوَ مِنْ قَبِيلِ وَاسْمَعْ وَاسْكُتْ))[3]

"یہ ایسی بلیہ ہے جو سننے والے کو حیران کر دیتی ہے، میں نے اسے اظہارِ تعجب کے لیے لکھا ہے اور یہ اس نوعیت کی ہے کہ سن لے اور خاموش رہ۔"

امام احمد نے بھی اس کا انکار کیا ہے۔[4]

امام بیہقی رحمہ اللہ نے الاسماء والصفات میں فرمایا ہے:

إِسْنَادُ هٰذَا عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا صَحِيحٌ وَهُوَ شَاذٌّ بِمَرَّةٍ[5]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ سند صحیح ہے مگر بالکل شاذ ہے مجھے معلوم نہیں کہ ابوالضحی کی کسی نے متابعت کی ہو۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی امام بیہقی رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔[6] اور البدایہ[7] میں فرمایا ہے کہ یہ اسرائیلیات میں سے ہے۔ ملا علی قاری نے الموضوعات الکبیر[8] میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے اس قول کے بعد فرمایا ہے: یہ اور اس جیسے دوسرے اقوال، جب ان کی رسولِ معصوم صلی اللہ علیہ وسلم تک سند صحیح نہیں تو وہ مردود ہیں۔ یہ بات دراصل علامہ سخاوی رحمہ اللہ نے المقاصد الحسنہ[9] میں کہی ہے۔ غالباً انہی سے علامہ علی قاری نے یہ بات اخذ کی ہے۔

---

① فتح الباری: 293/6 ② المستدرك: 493/2 ③ العلو: 593/1 دارالوطن ④ المنتخب من العلل للخلال: 125 ⑤ الاسماء والصفات: 132/2 ⑥ تفسیر ابن کثیر: 495/4
⑦ البدایہ: 21/1 ⑧ الموضوعات الکبیر: 31 ⑨ المقاصد الحسنة، رقم: 81

ماضی قریب میں برصغیر کے علماء میں یہ اثر بڑا موضوعِ بحث بنا رہا۔ نواب صدیق حسن خان مرحوم نے دلیل الطالب اور ابجد العلوم میں اس پر نقد کیا تو مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے اثبات میں تین رسالے لکھے۔ دو اردو زبان میں، ایک 'دافع الوسواس فی اثر ابن عباس' دوسرا 'الآیَاتُ الْبَیِّنَاتُ عَلٰی وُجُوْدِ الْاَنْبِیَآءِ فِی الطَّبْقَاتِ' کے نام سے اور ایک رسالہ عربی میں ''زَجْرُ النَّاسِ عَلٰی اِنْکَارِ اَثَرِ ابْنِ عَبَّاسٍ'' کے نام سے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے دیگر ہم نواؤں نے بھی اس کا اثبات کیا ہے مگر امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کے تبصرہ کے بعد اس کو صحیح قرار دینا درست نہیں۔ شیخ ابوغدہ نے بھی مولانا لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ظفر الامانی [1] کی تحقیق وتعلیق میں اس کو ضعیف اور شاذ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے سنداً ومعناً شاذ قرار دے کر ضعیف ہی قرار دیا ہے۔ اور ابن حجر ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی موقف ہے جیسا کہ علامہ العجلونی رحمۃ اللہ علیہ نے کشف الخفاء [2] میں ذکر کیا ہے۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کا مفصل کلام الحاوی [3] میں دیکھا جاسکتا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے ابجد العلوم [4] میں بھی علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کا مکمل کلام نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ علامہ قسطلانی اور علامہ الحلبی وغیرہ سے بھی اس کی تضعیف نقل کی ہے تمام اقوال کی تفصیل یہاں ضروری نہیں۔ شائقین محولہ کتب کی مراجعت فرمائیں۔ [5]

جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس اثر کے بارے میں اہلِ علم کی آرا مختلف ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک راجح قول اکثر اہلِ علم ہی کا ہے کہ یہ شاذ اور ضعیف ہے۔ اور اس پر کسی عقیدہ کی بنیاد درست نہیں۔

---

① ظفر الامانی: 571,570 ② کشف الخفاء: 123/1 ③ الحاوی: 386/1 ④ ابجد العلوم: 441/1

⑤ علامہ ابوحیان نے البحر المحیط، ج:8، ص: 287 میں کہا ہے کہ اس کے موضوع ہونے میں کوئی شک نہیں اور یہ واقدی کذاب کی روایات سے ہے۔ انہی کے حوالے سے یہ بات علامہ آلوسی نے روح المعانی، ج:8، ص:125 اور پیر کرم شاہ صاحب نے ضیاء القرآن، ج:5، ص:288 میں کہی حالانکہ ''المستدرك'' اور ''الأسماء والصفات'' کی روایت قطعاً واقدی سے منقول نہیں ہے۔

قرآنِ پاک کی اس آیت سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ سات آسمانوں کی طرح زمینیں بھی سات ہیں۔ مگر یہ کہاں اور کیسی ہیں، ان پر کوئی آبادی ہے یا نہیں، اگر ہے تو کس نوعیت کی ہے۔ آسمانوں کی طرح ان کے مابین کوئی فاصلہ ہے یا نہیں، قرآنِ مجید ان امور سے ساکت ہے، البتہ احادیثِ مبارکہ میں واضح الفاظ سے منقول ہے کہ سات زمینیں ہیں۔ چناں چہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'مَنْ اَخَذَ شَیْئًا مِنَ الْاَرْضِ بِغَیْرِ حَقِّهٖ خُسِفَ بِهٖ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اِلٰی سَبْعِ اَرَضِیْنَ' ①

''جو زمین کے معمولی حصہ پر ناحق قبضہ کرتا ہے قیامت کے روز سات زمینوں میں دھنسایا جائے گا۔''

اسی طرح حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے:

'مَنْ ظَلَمَ مِنَ الْاَرْضِ شَیْئًا طُوِّقَهٗ مِنْ سَبْعِ اَرَضِیْنَ' ②

''جس نے کسی پر ظلم کرکے معمولی سی زمین چھینی، اس کے گلے میں اسی قدر ساتوں زمینوں کا طوق بنا کر ڈالا جائے گا۔''

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے خلاف اَروٰی نامی عورت نے استغاثہ کیا کہ سعید نے میری کچھ زمین پر قبضہ کرلیا ہے۔ انہوں نے اس کا انکار کیا اور فرمایا کہ میں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے میں یہ غلطی کیسے کرسکتا ہوں! انہوں نے دعا کی ،کہ اے اللہ! یہ عورت کہتی ہے کہ مجھ پر ظلم ہوا ہے یہ جھوٹی ہے اسے اندھا کردے اور اسی کے کنویں میں اسے گرا دے۔ اور مسلمانوں کو نور کی طرح دکھا دے کہ میں نے اس پر ظلم نہیں کیا۔ چند دن بعد وہ اندھی ہوگئی اپنی زمین میں پھر رہی تھی کہ کنویں میں گر کر مرگئی۔ ③

---

① بخاری: 2454 ② بخاری: 2452 ③ الاصابة: 97/3 وغیرہ

حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے علاوہ اس نوعیت کی روایات متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں حتیٰ کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

((هٰذِهِ الْاَحَادِيْثُ كَالْمُتَوَاتِرَةِ))

البدایۃ[1]، ترمذی[2] اور مسند امام احمد[3] وغیرہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ آسمانوں کی طرح ساتوں زمینیں بھی اوپر نیچے ہیں اور ایک زمین کا دوسری زمین سے فاصلہ پانچ سو سال کی مسافت کا ہے۔ مگر یہ روایت ضعیف ہے۔[4]

اس کے علاوہ کسی صحیح روایت میں زمینوں کے مابین دوری کا ذکر نہیں۔ مفسرین کی آرا اس بارے میں نہایت مختلف ہیں۔ بعض نے سات اقلیم مراد لی ہیں، بعض نے سات پر سات تہیں مراد لی ہیں، بعض سات علیحدہ علیحدہ براعظم مراد لیتے ہیں، بعض نے یہ تاویل کی کہ آسمان بلندی کو کہتے ہیں۔ بایں طور زمین کے اوپر آسمان یہ ان کے اوپر کے آسمان کے لیے بمنزلہ زمین ہے یوں سات آسمان اور ان کے نیچے سات زمینیں ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ ہماری زمین کی طرح فضا میں دیگر زمینوں کا انکار ممکن نہیں۔ سائنس دانوں نے فلکی مشاہدات میں بعض سیاروں میں زمین سے ملتے جلتے آثار اور ان میں زندگی کے امکان کو تسلیم کیا ہے۔ مگر صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہم سات آسمانوں کی طرح سات زمینوں کو تسلیم کریں۔ ان کی آسمانوں کی طرح کوئی تفصیل قرآنِ پاک اور احادیثِ صحیحہ میں منقول نہیں اس لیے ہم حتمی بات کہنے کے نہ مجاز ہیں نہ اس تکلف کی کوئی ضرورت ہے۔

ہم اس کے تو مکلّف ہیں: کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق وتکوین پر ایمان لائیں مگر جن امور کی تفصیل اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہیں فرمائی اس میں رائے زنی سے اجتناب ہی سلامتی کی راہ ہے۔ جب ہم اللہ تعالیٰ کی مخلوق کا احاطہ نہیں کرسکتے تو اس کی تفصیلات کو کیوں کر جان سکتے ہیں۔

---

① البدایۃ : 20/1 ② ترمذی : 193/4 مع التحفۃ ③ مسند امام احمد : 370/2 ④ العلل المتناھیۃ: 14,13/2، ظلال الجنۃ :254/1

((جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِیٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ))

''فرشتوں کو قاصد بنانے والا ہے جو دو دو اور تین تین اور چار چار پروں والے ہیں۔''

الملائکۃ: اللہ سبحانہ وتعالٰی کی ایک مخلوق ''الملائکہ'' یعنی فرشتے ہیں۔ جنہیں اللہ تعالٰی نے نور سے پیدا کیا ہے۔

چناں چہ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'خُلِقَتِ الْمَلَائِکَۃُ مِنْ نُّوْرٍ، وَخُلِقَ الْجَانُّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ وَخُلِقَ آدَمُ مِمَّا وُصِفَ لَکُمْ' ①

''فرشتوں کو نور سے، جنات کو آگ کے شعلہ سے پیدا کیا گیا ہے اور آدم علیہ السلام کو اس سے جس سے تمہیں آگاہ کیا گیا ہے۔''

یہ فرشتے، جن وانس کی طرح نر ومادہ پر مشتمل نہیں، نہ وہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں۔ نہ ان کی شادی ہوتی ہے نہ اولاد۔ نور سے بنے ہوئے یہ لطیف اجسام رکھتے ہیں اللہ تعالٰی نے انہیں مختلف اشکال بدلنے کی قدرت دے رکھی ہے، ان کی تعداد حدِ شمار وقطار سے خارج ہے۔ اللہ تعالٰی نے فرشتوں کے تذکرہ میں فرمایا:

﴿وَ مَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ﴾ ②

''تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

حدیث معراج میں بیت المعمور کے ذکر میں آیا ہے کہ وہ ساتویں آسمان پر ہے ہر روز اس میں ستر ہزار فرشتے نماز ادا کرتے ہیں جس نے ایک بار حاضری دے دی اس کی دوبارہ باری نہیں آئے گی۔ ③

بلکہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے تو فرمایا ہے کہ یہ بھی ساتویں آسمان پر رہنے والے

① مسلم: 2996، الصحیحۃ: 459 ② المدثر: 31 ③ بخاری: 3207

فرشتے مراد ہیں۔ [1]

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کچھ میں دیکھتا ہوں تم نہیں دیکھتے، جو کچھ میں سنتا ہوں تم نہیں سنتے، آسمان بوجھ سے چر چر کرتا ہے اسے یوں کرنا چاہیے کیوں کہ اس پر چار انگلیوں کی جگہ بھی ایسی نہیں جس پر فرشتہ سجدہ ریز نہ ہو۔ [2]

طبرانی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے ایک قدم، ایک بالشت اور ایک ہاتھ جتنی جگہ بھی نہیں مگر وہاں کوئی فرشتہ سجدہ میں، کوئی رکوع میں، کوئی قیام میں کھڑا اللہ کی تسبیح وتہلیل میں مصروف ہے قیامت کے روز وہ کہیں گے 'سُبْحَانَكَ مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ' اللہ تو پاک ہے ہم سے تیری بندگی کا حق ادا نہیں ہوسکا البتہ ہم نے کسی کو تیرا شریک نہیں بنایا۔ [3]

آسمانوں کے علاوہ زمین وآسمان کے مابین اپنی اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے والے فرشتے اس پر مستزاد ہیں انہی میں بالخصوص انسانوں کا نامۂ اعمال لکھنے والے، ان کی روح قبض کرنے والے بھی ہیں۔ کچھ فرشتے حاملینِ عرش ہیں اور ان کے بارے میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک کا وجود اتنا بڑا ہے کہ کان سے کندھے تک کا فاصلہ سات سو سال کی مسافت کے برابر ہے۔ [4]

کچھ وہ ہیں جو عرش کے طواف میں مصروف ہیں، ان کو اَلْمُقَرَّبُوْنَ کہا گیا ہے۔ انہی میں جبریل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل علیہم السلام ہیں، عزرائیل علیہ السلام ملک الموت ہے اس کا نام صحیح احادیث میں تو نہیں البتہ بعض آثار میں یہ نام آیا ہے۔ [5]

فرشتوں کی ذمہ داریوں کے حوالے سے متعدد احادیث منقول ہیں۔ جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ فرشتوں میں بھی درجہ ومرتبہ کے اعتبار سے درجہ بندی ہے سب سے افضل جبرائیل علیہ السلام جن کا ذکر قرآنِ مجید اور بہت سی احادیث میں آیا

---

[1] البدایۃ: 42/1 [2] مسند احمد: 173/5، ترمذی: 2312 وحسنہ [3] طبرانی، ابن کثیر: 472/2 [4] ابو داود: 4727، الصحیحۃ، رقم: 151 [5] البدایہ: 47/1

ہے۔ پھر 'مُقَرَّبِيْنَ' ہیں جن میں میکائیل، اسرافیل، عزرائیل علیہم السلام، حاملین عرش اور عرش کا طواف کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴾ ①

"مسیح (علیہ السلام) ہرگز اس سے عار نہیں رکھے گا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ مقرب فرشتے ہی۔"

حضرت رفاعہ بن رافع الزرقی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور پوچھا:

((مَا تَعُدُّوْنَ اَهْلَ بَدْرٍ فِيْكُمْ؟ قَالَ: مِنْ اَفْضَلِ الْمُسْلِمِيْنَ، قَالَ وَ كَذٰلِكَ مَنْ شَهِدَ بَدْرًا مِنَ الْمَلَائِكَةِ)) ②

"آپ اپنے اندر اہلِ بدر کو کیسا سمجھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: مسلمانوں میں سے سب سے افضل، جبریل علیہ السلام نے کہا اسی طرح جو فرشتے بدر میں شریک ہوئے وہ دوسروں سے افضل ہیں۔"

بدر میں شریک ہونے والوں میں حضرت جبریل، حضرت میکائیل اور حضرت اسرافیل علیہم السلام کا نام تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں آیا ہے۔ ③

جبریل علیہ السلام کا قرآنِ پاک میں "روح القدس، روح الامین، رسول کریم، ذو قوۃ، متین، مطاع، امین" کے القاب سے ذکر ہوا ہے۔

تمام فرشتوں پر ایمان ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۫ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۫ ﴾ ④

"رسول اس پر ایمان لایا جو اس کے ربّ کی جانب سے اس کی طرف

---

① النساء : 172 ② بخاری : 3992 ③ فتح الباری : 313/8 ④ البقرة : 285

نازل کیا گیا اور سب مؤمن بھی، ہر ایک اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا، ہم اس کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان فرق نہیں کرتے۔"

ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ﴾ ①

"نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو، اور لیکن اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ اور یومِ آخرت اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے۔"

جس طرح فرشتوں پر ایمان کو ایمان و نیکی قرار دیا گیا ہے اسی طرح ان کے انکار پر کفر کا اطلاق ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا﴾ ②

"اور جو شخص اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور یومِ آخرت (کے ساتھ) کفر کرے تو یقیناً وہ گمراہ ہوا بہت دور گمراہ ہونا۔"

یہود حضرت جبریل علیہ السلام کو اپنا دشمن سمجھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ۝﴾ ③

① البقرۃ : 177 ② النساء : 136 ③ البقرۃ : 98

''جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکال کا دشمن ہو تو بے شک اللہ کافروں کا دشمن ہے۔''

گویا جو جبرئیل علیہ السلام کا دشمن وہ تنہا جبرئیل کا نہیں بلکہ اللہ کا اور تمام فرشتوں کا تمام رسولوں کا دشمن ہے۔ جس طرح ایک رسول کا انکار تمام رسولوں کے انکار کے مترادف ہے اسی طرح ایک فرشتے کا انکار تمام فرشتوں کا انکار ہے۔

احادیث میں بھی فرشتوں پر ایمان لانے کا ذکر ہے چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک صاحب (یعنی جبریل علیہ السلام) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ایمان کیا ہے؟ آپ نے جواباً ارشاد فرمایا:

((اَلْاِیْمَانُ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَبِلِقَائِهٖ وَرُسُلِهٖ وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ)) ①

''ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی ملاقات پر، اس کے رسولوں پر اور قبروں سے اٹھائے جانے پر ایمان لائے۔''

صحیح مسلم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب سے تقریباً یہی روایت مروی ہے۔ جس میں سائل کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ)) ②

''ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، آخرت کے دن پر، اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لائے۔''

ان دونوں احادیث سے بھی واضح ہوتا ہے کہ فرشتوں پر ایمان لانا ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ ان کا نورانی وجود اور ذاتی تشخص ہے۔ اور یہ ایمان بالغیب کا تقاضا ہے۔ ملحدین ان کا انکار کرتے ہیں۔ بعض نے کواکب کو فرشتے قرار دیا اور بعض

① بخاری: 50 ② مسلم: 8

نے انسان کی قوتِ ملکوتی کو فرشتہ قرار دیا۔ جیسا کہ سرسیّد احمد خان نے اپنی ''تفسیر القرآن'' میں کہا ہے۔ مگر یہ قطعاً غلط اور قرآن وسنت کی نصوصِ صریحہ سے انحراف ہے۔

انہی فرشتوں کے بارے میں یہاں فرمایا گیا ہے کہ یہ اللہ کے قاصد ہیں۔ جس طرح زمین اور آسمان کو اللہ نے بنایا ہے اسی طرح فرشتوں کو اس نے اپنا قاصد اور پیغامبر بنایا ہے۔ یہ دراصل کفارِ مکہ پر تعریض ہے کہ انھوں نے تو انہیں اللہ کی بیٹیاں بنا کر ان کی عبادت و پرستش شروع کر رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ جَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَ يُسْئَلُوْنَ۝﴾ [1]

''اور انہوں نے فرشتوں کو وہ جو رحمان کے بندے ہیں، عورتیں بنا دیا، کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے؟ ان کی گواہی ضرور لکھی جائے گی اور وہ پوچھے جائیں گے۔''

امام ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں مانتے تھے، ان کی تصویریں عورتوں کی شکل پر بناتے تھے اور کہتے تھے یہ فرشتوں کی صورتیں ہیں جو اللہ کی لڑکیاں ہیں اور ان کی عبادت سے ہمارا مقصد اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہے۔ [2]

سورۃ النجم میں ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى۝﴾ [3]

''بے شک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے یقیناً وہ فرشتوں کے نام عورتوں کے ناموں کی طرح رکھتے ہیں۔''

---

[1] الزخرف: 19 [2] ابن کثیر: 739/1 [3] النجم: 27

مشرکینِ مکہ کتنے خودغرض تھے کہ اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے تھے اور اگر ان کے اپنے گھر میں بیٹی پیدا ہونے کی اطلاع ملتی تو مارے شرم کے منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹیوں کا اعتقاد رکھتے تھے۔ اسی تناظر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ○ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى﴾ ①

''کیا تمہارے لیے لڑکے ہیں اور اس کے لیے لڑکیاں؟ یہ تو اس وقت ناانصافی کی تقسیم ہے۔''

یہی بات ایک دوسرے اسلوب میں سورۃ الصافات ② اور تفصیل سے النحل ③ میں کہی گئی ہے۔ فرشتوں کی پرستش کے نتیجہ ہی میں قیامت کے روز ان سے اس بارے میں سوال کیا جائے گا:

﴿وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ○ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ○﴾ ④

''جس دن وہ سب کو جمع کرے گا، پھر فرشتوں سے کہے گا: کیا یہ لوگ تمہاری ہی عبادت کیا کرتے تھے؟ وہ کہیں گے: تو پاک ہے تو ہمارا دوست ہے نہ کہ وہ، بلکہ وہ جنوں کی عبادت کیا کرتے تھے، ان کے اکثر انہی پر ایمان رکھنے والے تھے۔''

کہ مشرکین واقعی تمہاری عبادت کرتے رہے ہیں؟ تو وہ عرض کریں گے: بالکل نہیں آپ ہر قسم کے شریک وسہیم سے پاک ہیں یہ ہماری نہیں بلکہ شیاطین جنوں کی عبادت کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے ہی انہیں یہ پٹی پڑھائی کہ وہ ہمارے ناموں پر بت تراشیں اور ان کی پرستش کریں۔

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا:

① النجم: 22,21 ② سورة الصافات: 154,149 ③ سورة النحل: 59,58 ④ سبا: 41,40

﴿اِنْ یَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا وَ اِنْ یَّدْعُوْنَ اِلَّا شَیْطٰنًا مَّرِیْدًاo﴾ ①

''وہ اس کے سوا نہیں پکارتے مگر مؤنثوں کو اور نہیں پکارتے مگر سرکش شیطان کو۔''

گویا مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں بنا کر ان کی تصوراتی مورتیاں بنا کر، ان کی پرستش کرتے تھے اور ان سے یہ پرستش سرکش شیاطین کرواتے تھے۔ اس لیے اصل پوجا پاٹ تو شیاطین کی ہے۔ بت، فرشتے یا صالحین تو محض نام ہیں۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: 'مع كل صنم جنية' ہر بت کے ساتھ جنّی ہے۔ ②

قیامت کے روز اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

﴿اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَیْكُمْ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌo﴾ ③

''کیا میں نے تمھیں تاکید نہیں کی تھی اے اولادِ آدم! کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔''

مشرکین کے اسی عقیدہ کے تناظر میں فرمایا گیا ہے کہ فرشتے تو اللہ کے مکرم بندے ہیں، اور اللہ کے قاصد ہیں نہ کہ معبود۔

''رسلاً'' سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام فرشتے قاصد ہیں۔ مگر قرآنِ مجید ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذمہ داری تمام فرشتوں کی نہیں چنانچہ سورۃ الحج میں ارشاد فرمایا:

﴿اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌo﴾ ④

''اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے چنتا ہے اور لوگوں سے بھی، بے شک اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

① النساء: 117 ② ابن كثير: 612/1 ③ يس: 60 ④ الحج: 75

لٰہذا کچھ فرشتے اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیائے کرام علیہم السلام کے مابین پیغام رسانی کی ذمہ داری نبھاتے رہے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو پوری کائنات کے بارے میں احکام لے جانے اور ان کی تنفیذ کرنے والے ہیں۔ جو ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی ہے اسے بجا لانے میں سرِ موکوتاہی نہیں کرتے اور یہ قاصدین اپنی مرضی سے بھی نہیں آتے جاتے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے کہا:

'مَا يَمْنَعُكَ أَنْ تَزُوْرَنَا أَكْثَرَ مِمَّا تَزُوْرُنَا؟ فَنَزَلَتْ: ﴿وَ مَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَ مَا خَلْفَنَا ①﴾، ②

''جس قدر آپ ہماری ملاقات کے لیے آتے ہیں اس سے زیادہ آنے میں کیا امر مانع ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ: اور ہم نہیں اترتے مگر تیرے رب کے حکم کے ساتھ اسی کا ہے جو ہمارے آگے ہے اور جو ہمارے پیچھے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری ③ میں اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ ④ نے عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم سے نقل کیا ہے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ چالیس روز تک جبریل علیہ السلام نہ آئے، ان کے آنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے جبریل! تم تب آئے ہو جب میرا اشتیاق بڑھا ہے۔ جبریل علیہ السلام نے کہا: میں بھی آپ کی ملاقات کا مشتاق تھا لیکن ''میں مامور'' ہوں۔ اپنی مرضی سے نہیں آتا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا تھا: کہ سب سے اچھی جگہ اور سب سے بری جگہ اللہ کے ہاں کون سی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نہیں جانتا۔ جبریل علیہ السلام سے اس بارے میں پوچھوں گا تو اس موقعہ پر جبریل علیہ السلام کے آنے میں تاخیر ہوئی۔ اسی طرح جب قریشِ مکہ نے اصحابِ کہف کے

---

① مریم: 64 ② بخاری: 4731 ③ فتح الباری: 429/9

④ تفسیر ابن کثیر: 174/3

بارے میں پوچھا تو پندرہ دن تک سلسلۂ وحی منقطع رہا۔ جبریل علیہ السلام آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم نے آنے میں تاخیر کی ہے۔[1] ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ جب کفارِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روح، ذوالقرنین اور اصحابِ کہف کے بارے میں پوچھا، پندرہ دن گزرنے کے بعد جب جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جبریل علیہ السلام اتنے دن آنے سے رکے رہے مجھے تو برا گمان ہونے لگا تھا۔ تو جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا: ہم تیرے رب کے حکم سے نازل ہوتے ہیں:[2] غور فرمایئے کہ جو فرشتے اپنی مرضی سے آنے جانے کی سکت نہیں رکھتے وہ انسانوں کی بگڑی بنانے پر کیونکر قادر ہو سکتے ہیں؟

اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ: یہ فرشتے چوں کہ اللہ ذوالعرش المجید کے، انسانوں کی طرف، قاصد اور پیغامبر ہیں اس لیے اوپر سے نیچے تعمیلِ ارشاد کے لیے جلد از جلد اور فی الفور پہنچنے کے لیے اللہ نے انہیں پَر دیئے ہیں۔ کیوں کہ زمین وآسمان کے مابین فضائے بسیط کو قدم در قدم طے کرنا مشکل بھی ہے اور تعمیل امر میں تاخیر کا باعث بھی۔

'اَجْنِحَة' جَنَاحٌ کی جمع ہے۔ 'جَنَاح' انسان کے بازوؤں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جیسا کہ قرآنِ مجید ہی میں ہے:

﴿وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾[3]

"اور رحم دلی سے ان کے لیے تواضع کا بازو جھکا دے۔"

کسی چیز کی جانب اور پہلو کو بھی جناح کہتے ہیں۔ مثلاً "جناح السفینۃ" سفینہ کا پہلو یا "جناح العسکر" لشکر کی جانب۔ اسی معنی میں انسان کے پہلو کو جناح الانسان کہا جاتا ہے۔ قرآنِ پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یدِ بیضاء کے حوالے سے آیا ہے: ﴿وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ﴾[4] "اپنا ہاتھ اپنے پہلو کی طرف ملا۔"

---

[1] تفسیر ابن کثیر: 174,99/3 [2] ابن ہشام: 302/1، سبل الهدى: 346/2

[3] الاسراء: 24 [4] طٰهٰ: 22

''جناح'' کا لفظ پرندوں کے پروں کے لیے بھی وارد ہوا ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طَآئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ﴾ ①

''اور زمین میں نہ کوئی چلنے والا ہے، اور نہ کوئی اڑنے والا، جو اپنے دو پروں سے اڑتا ہے، مگر تمہاری طرح امتیں ہیں۔''

یہاں یہ لفظ فرشتوں کے پروں کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن ان پروں کی کیفیت کی بجائے کمیت کو ذکر کیا ہے کہ وہ دودو پروں والے، بعض تین تین پروں والے اور بعض چار چار پروں والے ہیں۔ اور اس سے مقصود غالباً ان کی مختلف قوتِ پرواز اور سرعتِ رفتار کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ سب کے سب یکساں نہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے مختلف مراتب ہیں جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر آئے ہیں۔

یہاں فرشتوں کے پروں کے حوالے سے زیادہ سے زیادہ چار چار پروں کا ذکر ہوا ہے۔ لیکن یہ تعداد بس اتنی ہی نہیں۔ احادیث میں جبریل علیہ السلام کے چھ سو پروں کا ذکر بھی آیا ہے۔ چناں چہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سدرۃ المنتہی پر حضرت جبریل علیہ السلام کو دیکھا ان کے چھ سو پر تھے اور اس نے پورے افق کو گھیر رکھا تھا۔ ②

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو ان کی اصلی صورت میں دیکھا، وہ چھ سو پروں کے ساتھ پورے افق پر چھائے ہوئے تھے۔ ③

يزيد في الخلق ما يشاء: ''وہ اپنی مخلوق میں جیسا اضافہ چاہتا ہے کر دیتا ہے۔'' چار چار پروں پر ہی کیا، اس سے زیادہ بھی اضافہ کرنے پر قادر ہے بلکہ بعض مفسرین نے ''الخلق'' کو عام رکھتے ہوئے مخلوق میں تمام مستحسن امور کو شامل کیا ہے

---

① الانعام: 38 ② بخاری: 3232، 4856 وغیرہ ③ ترمذی: 3278، بخاری: 3235

بارے میں پوچھا تو پندرہ دن تک سلسلۂ وحی منقطع رہا۔ جبریل علیہ السلام آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم نے آنے میں تاخیر کی ہے۔[1] ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ جب کفارِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روح، ذوالقرنین اور اصحابِ کہف کے بارے میں پوچھا، پندرہ دن گزرنے کے بعد جب جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جبریل علیہ السلام اتنے دن آنے سے رکے رہے مجھے تو برا گمان ہونے لگا تھا۔ تو جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا: ہم تیرے رب کے حکم سے نازل ہوتے ہیں:[2] غور فرمایئے کہ جو فرشتے اپنی مرضی سے آنے جانے کی سکت نہیں رکھتے وہ انسانوں کی بگڑی بنانے پر کیونکر قادر ہوسکتے ہیں؟

اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ: یہ فرشتے چوں کہ اللہ ذوالعرش المجید کے، انسانوں کی طرف، قاصد اور پیغامبر ہیں اس لیے اوپر سے نیچے تعمیلِ ارشاد کے لیے جلد از جلد اور فی الفور پہنچنے کے لیے اللہ نے انہیں پَر دیئے ہیں۔ کیوں کہ زمین وآسمان کے مابین فضائے بسیط کو قدم درقدم طے کرنا مشکل بھی ہے اور تعمیل امر میں تاخیر کا باعث بھی۔

'اَجْنِحَة' جَنَاحٌ کی جمع ہے۔ 'جَنَاح' انسان کے بازوؤں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جیسا کہ قرآنِ مجید ہی میں ہے:

﴿وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾[3]

''اور رحم دلی سے ان کے لیے تواضع کا بازو جھکا دے۔''

کسی چیز کی جانب اور پہلو کو بھی جناح کہتے ہیں۔ مثلاً ''جناح السفینۃ'' سفینہ کا پہلو یا ''جناح العسکر'' لشکر کی جانب۔ اسی معنی میں انسان کے پہلو کو جناح الانسان کہا جاتا ہے۔ قرآنِ پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ید بیضاء کے حوالے سے آیا ہے: ﴿وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ﴾[4] ''اپنا ہاتھ اپنے پہلو کی طرف ملا۔''

---

① تفسیر ابن کثیر: 174,99/3 ② ابن ھشام: 302/1، سبل الھدی: 346/2
③ الاسراء: 24 ④ طٰہٰ: 22

''جناح'' کا لفظ پرندوں کے پروں کے لیے بھی وارد ہوا ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَّطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ﴾ ①

''اور زمین میں نہ کوئی چلنے والا ہے، اور نہ کوئی اڑنے والا، جو اپنے دو پروں سے اڑتا ہے، مگر تمہاری طرح امتیں ہیں۔''

یہاں یہ لفظ فرشتوں کے پروں کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن ان پروں کی کیفیت کی بجائے کمیت کو ذکر کیا ہے کہ وہ دودو پروں والے، بعض تین تین پروں والے اور بعض چار چار پروں والے ہیں۔ اور اس سے مقصود غالبًا ان کی مختلف قوتِ پرواز اور سرعتِ رفتار کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ سب کے سب یکساں نہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے مختلف مراتب ہیں جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر آئے ہیں۔

یہاں فرشتوں کے پروں کے حوالے سے زیادہ سے زیادہ چار چار پروں کا ذکر ہوا ہے۔ لیکن یہ تعداد بس اتنی ہی نہیں۔ احادیث میں جبریل علیہ السلام کے چھ سو پروں کا ذکر بھی آیا ہے۔ چناں چہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سدرۃ المنتہی پر حضرت جبریل علیہ السلام کو دیکھا ان کے چھ سو پر تھے اور اس نے پورے افق کو گھیر رکھا تھا۔ ②

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو ان کی اصلی صورت میں دیکھا، وہ چھ سو پروں کے ساتھ پورے افق پر چھائے ہوئے تھے۔ ③

یزید فی الخلق ما یشاء: ''وہ اپنی مخلوق میں جیسا اضافہ چاہتا ہے کر دیتا ہے۔'' چار چار پروں پر ہی کیا، اس سے زیادہ بھی اضافہ کرنے پر قادر ہے بلکہ بعض مفسرین نے ''الخلق'' کو عام رکھتے ہوئے مخلوق میں تمام مستحسن امور کو شامل کیا ہے

① الانعام: 38 ② بخاری: 3232، 4856 وغیرہ ③ ترمذی: 3278، بخاری: 3235

کہ ایک خوب صورت ڈھانچہ ہی نہیں بنایا بلکہ حسنِ خلق، حسنِ صوت، حسنِ خط، جودۃ العقل والفہم، حلاوتِ لسان اور دیگر اوصافِ حسنہ سے بھی انہیں نوازا ہے اور ان کے درجات بھی مختلف ہیں۔ گویا ''الخلق'' کا عموم جمالِ ظاہری اور جمالِ باطنی دونوں کو شامل ہے بلکہ اس کے عموم میں کائنات کی تجدید وتوسیع بھی شامل ہے کہ اس میں عجائبات اور نئے نئے سیاروں کو پیدا کرتا رہتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾

''اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔''

کوئی چیز اس کے دستِ قدرت سے خارج نہیں، جسے چاہے، جیسا چاہے، پیدا کرنے پر قادر ہے۔ اپنی مخلوق کی صفات وصلاحیتوں میں کمی بیشی کا اسی کو اختیار ہے، جسے چاہے معتدل شکل وصورت عطا فرمائے، جسے چاہے کوتاہ قامت بنا دے، جسے چاہے قوت وطاقت عطا فرمائے، جسے چاہے کمزور وناتواں بنا دے، چاہے تو جوانی میں کچھ نہ دے، چاہے تو یاس وناتوانی میں اولاد سے نواز دے، جسے چاہے بیٹے دے، جسے چاہے بیٹیاں دے، بادشاہت اسی کی ہے وہی قادرِ مطلق ہے اور وہی سب پر غالب ہے۔ جس کے بارے میں جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے کسی کو دم مارنے کی جا نہیں۔ تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا یَصِفُوْنَ

:: :: ::

﴿مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَ مَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ (فاطر:۲)

"جو کچھ اللہ لوگوں کے لیے رحمت میں سے کھول دے تو اسے کوئی بند کرنے والا نہیں اور جو بند کردے تو اس کے بعد اسے کوئی کھولنے والا نہیں اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ ہی کا بیان ہے اور مشرکین کو خبردار کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ فرشتے ہوں یا جن، یا دیگر تمام معبودانِ باطلہ جن کی تم عبادت کرتے ہو وہ کسی نفع ونقصان کے مالک نہیں۔ ان کو نافع وضار سمجھنا محض تمہاری اختراعات ہیں۔

﴿مِنْ رَّحْمَةٍ﴾ کہ اپنی رحمتوں میں سے کوئی رحمت یا اس کا کوئی حصہ، وہ رزق ہو، بارش ہو، صحت وعافیت ہو، مال ہو، اولاد ہو، یا رحمتِ سماوی ہو یا ارضی۔ ہر قسم کی رحمت ونعمت کو شامل ہے۔ حتیٰ کہ رسول کا بھیجنا بھی رحمت، ہدایت اور صراطِ مستقیم کی توفیق بھی رحمت، معاصی کے بعد توبہ کی توفیق بھی رحمت، حیاتِ جسمانی کے ساتھ حیاتِ قلبی بھی رحمت ونعمت۔

﴿اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً﴾ [1]

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے تمہاری خاطر مسخر کردیا ہے اور تم پر اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں پوری کردیں۔"

---

[1] لقمان: 20

یہ سب نعمتیں اور رحمتیں دینے والا صرف اللہ ہے۔ وہ یہ رحمتیں کسی کو دینا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا اور اگر ان رحمتوں کا دروازہ بند کر دے تو کوئی کھولنے والا نہیں ہے۔ یہی حقیقت سورۂ یونس میں یوں بیان ہوئی ہے:

﴿وَ اِنۡ یَّمۡسَسۡكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ وَ اِنۡ یُّرِدۡكَ بِخَیۡرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضۡلِهٖ یُصِیۡبُ بِهٖ مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ﴾ ①

''اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو اُس کے سوا اسے کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ کرلے تو کوئی اس کے فضل کو ہٹانے والا نہیں، وہ اسے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے پہنچا دیتا ہے۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿قُلۡ اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ اَرَادَنِیَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلۡ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوۡ اَرَادَنِیۡ بِرَحۡمَةٍ هَلۡ هُنَّ مُمۡسِكٰتُ رَحۡمَتِهٖ﴾ ②

''اے نبی! آپ انہیں کہیں: کیا تم نے دیکھا کہ وہ ہستیاں جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے تو کیا وہ اس نقصان کو ہٹانے والی ہیں؟ یا وہ مجھ پر کوئی مہربانی کرنا چاہے تو کیا وہ اس کی رحمت کو روکنے والی ہیں؟''

یہی بات اللہ تعالیٰ نے سورۂ الانعام، الاحزاب، الفتح میں بھی بیان فرمائی ہے۔ ③ اور اسی حقیقت کا اظہار رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعاؤں میں کیا ہے۔ چناں چہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز سے فارغ ہوتے تو یہ دعا پڑھتے:

---

① یونس: 107 ② الزمر: 38 ③ الانعام: 17، الاحزاب: 17، الفتح: 11

((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ.)) ①

''اللہ کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، بادشاہت اسی کی اور حمد اسی کی، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اے اللہ! آپ جو کچھ دینا چاہیں اسے کوئی روکنے والا نہیں، اور جس چیز کو روک لیں اسے کوئی دینے والا نہیں۔ اور تیرے مقابلے میں کسی دولت مند کو اس کی دولت فائدہ نہیں دے سکتی۔''

''ذَاالْجَدِّ'' سے مراد مالدار، بزرگی والا، بادشاہ، مرتبہ ودرجہ والا سبھی مراد ہیں کہ یہ انعام واکرام کام نہیں آئیں گے کام صرف اپنی نیکی آئے گی۔ حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رکوع سے سر اٹھاتے تو یہ دعا پڑھتے:

((رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ، مِلْءَ السَّمَاوَاتِ وَمِلْءَ الْاَرْضِ، وَمِلْءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ، اَللّٰهُمَّ اَهْلَ الثَّنَاءِ وَالْمَجْدِ، اَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ وَكُلُّنَا لَكَ عَبْدٌ، اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ)) ②

''اے ہمارے ربّ! حمد تیرے ہی لیے ہے، آسمان اور زمین کے بھراؤ کے برابر، اور جس چیز کے بھراؤ کے برابر آپ چاہتے ہیں، اے اللہ! ثنا وبزرگی کا تو ہی مستحق ہے، بندے نے جو کہا وہ سب سے زیادہ حق ہے اور ہم سب تیرے بندے ہیں، اے اللہ آپ جو کچھ دینا چاہیں اسے کوئی روکنے والا نہیں، اور جس چیز کو روک لیں اسے کوئی دینے والا نہیں، اور تیرے مقابلے میں کسی دولتمند کی دولت مندی اسے فائدہ نہیں دیتی۔''

① بخاری: 6615، مسلم: 593 وغیرہ ② مسلم: 477

یہ اس لیے کہ ﴿وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ وہ سب پر غالب ہے۔

﴿وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [1]

''اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

علامہ راغب رحمہ اللہ نے فرمایا ہے ''العزیز'' وہ ہے جو غالب ہو مغلوب نہ ہو۔[2] لہٰذا اس کے فیصلوں کو کوئی روک نہیں سکتا۔ اور غالب ہونے کے ساتھ ساتھ ''حکیم'' بھی ہے کہ اس کا جو بھی فیصلہ ہوتا ہے حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ کسی کو دینے میں بھی حکمت ہے اور نہ دینے میں بھی۔ بلکہ انسان کے اعضا، ان کی بناوٹ، اور ان کو مناسب جگہ پر رکھنے میں بڑی حکمتیں ہیں۔ کائنات میں پھیلی ہوئی تمام مخلوق حتی کہ شجر وحجر کو بنانا بھی حکمت سے خالی نہیں۔ غرض یہ کہ حکیم کا کوئی فعل وامر حکمت سے خالی نہیں مگر انسان اس کی حکمتوں کو جاننے سے قاصر ہے۔ یاد رہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے جو غالب وحکیم ہے۔ ورنہ ہر غالب، حکیم نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ درندگی پر اتر آتا ہے۔ امریکہ کی تازہ مثال ہمارے سامنے ہے۔ البتہ جسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حکمت ودانائی کی توفیق عطا فرمائی ہو وہ اس قسم کی حماقتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ سیّدِ کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اس کی ایک روشن مثال ہے۔

جب اللہ ہی غالب وحکیم ہے اور اس کے فیصلہ کو کوئی ردّ بھی نہیں کرسکتا ہے تو چاہیے کہ جو کچھ طلب کیا جائے اسی سے طلب کیا جائے۔ مسلمانوں کا جب تک اسی غالب ہستی سے واسطہ رہا عزت پاتے رہے اور جب اس سے ناطہ توڑا ذلیل ہوئے۔

عزیزیکہ ہرگز درش سر بتافت
بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

وہ ایسا غالب ہے کہ جس نے اس کے دروازے سے سر پھیرا، وہ جس دروازے پر بھی پہنچا اس نے کوئی عزت نہ پائی۔

---

[1] یوسف :21 [2] مفردات القرآن

حفاظت کا وظیفہ

امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے حضرت عامر رضی اللہ عنہ بن عبد قیس سے نقل کیا ہے: کہ قرآنِ مجید کی جب چار آیات پڑھ لیتا ہوں تو صبح وشام تمام امور سے بے پروا ہو جاتا ہوں۔

١۔ ﴿مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَ مَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ﴾ ①

٢۔ ﴿وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ وَ اِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ﴾ ②

٣۔ ﴿سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا﴾ ③

٤۔ ﴿وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ ④ ⑤

---

① فاطر: 3 ② یونس: 107 ③ الطلاق: 7

④ هود: 6، ⑤ الدر المنثور: 244/5

﴿يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ○﴾ (فاطر:۳)

''اے لوگو! اللہ کی نعمت یاد کرو جو تم پر ہے، کیا اللہ کے سوا کوئی پیدا کرنے والا ہے، جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہو؟ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو تم کہاں بہکائے جاتے ہو؟''

پہلے جملہ میں تمام انسانوں سے خطاب ہے، گو اس کے اوّلین مخاطب مشرکینِ قریش تھے، کہ اللہ نے تمہارے اوپر جس قدر انعامات کیے ہیں انہیں یاد کرو، نعمتوں کو یاد کرنے کا حکم صرف زبان سے نہیں بلکہ زبان کے ساتھ ساتھ دل سے بھی ان کا اعتراف کرو کہ اللہ ہی ولیِ نعمت ہے کوئی اور نہیں، اور کفرانِ نعمت سے بھی بچو کہیں ایسا نہ ہو کہ نعمت تم سے چھن جائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ○﴾ [1]

''اور تمہارے پاس جو بھی نعمت ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے، پھر جب تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو اسی کی طرف تم گڑگڑاتے ہو۔''

یہ نعمت رزق ہو، صحت وعافیت ہو، مال واولاد ہو، فتح ونصرت ہو، علم اور عملِ صالح ہو یہ سب اللہ ہی کی مہربانی سے حاصل ہوتا ہے، تکلیف پہنچتی ہے تو اس کا ازالہ بھی اللہ تعالیٰ کرتے ہیں۔ غرضیکہ نعمتِ نفع ہو یا نعمتِ دفع، سب اللہ سبحانہ وتعالیٰ

[1] النحل : 53

کی طرف سے ہے۔ یہ تو منکرین ومشرکین کا طریقہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا ولی نعمت سمجھتے ہیں اور اس سے نعمت کے طلب گار بنتے ہیں، یا اس کے حصول کا سبب اپنے تدبر، لگن اور علم کو قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ ①

”پھر جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے، پھر جب ہم اسے اپنی طرف سے کوئی نعمت عطا کرتے ہیں تو کہتا ہے یہ مجھے ایک علم کی بنیاد ہی پر دی گئی ہے۔ بلکہ وہ ایک آزمائش ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔“

قارون کو جب موسیٰ علیہ السلام نے سمجھایا کہ دنیا کے پیچھے اپنی آخرت کو فراموش نہ کرو، اللہ نے تمہارے اوپر احسان کیا ہے تو تم احسان سے پیش آؤ اور زمین میں اپنے مال ودولت کے نشہ میں فتنہ وفساد نہ پھیلاؤ، تو اس نے کہا:

﴿قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ﴾ ②

”مجھے تو یہ ایک علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو میرے پاس ہے۔“

میرے اندر یہ اور یہ صلاحیتیں ہیں، تجارت اور حصولِ مال کا مجھے ڈھب آتا ہے۔ اسی گھمنڈ میں وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مال ودولت دی تو میں اس کا مستحق ہوں اور اللہ مجھ سے راضی ہے۔ کفار عموماً اسی گھمنڈ میں مبتلا تھے اور کہتے تھے:

﴿وَ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ﴾ ③

”اور انہوں نے کہا: ہم اموال اور اولاد میں زیادہ ہیں اور ہم ہرگز عذاب دیئے جانے والے نہیں ہیں۔“

---

① الزمر: 49 ② القصص: 78 ③ سبا: 35

اللہ کے ہاں اگر ہم مقہور و معتوب ہوتے تو مال و اولاد کی نعمت ہمیں میسر نہ آتی۔ حالاں کہ یہ مال و اولاد، اور یہ آرام و آسائش تو فتنہ ہے۔ ان کے مقابلے میں مومن تمام نعمتوں کو اللہ کی ہی عطا سمجھتا ہے اور اس کا شکر وسپاس بجا لاتا ہے۔ سیدِ کائنات محمد رسول اللہ ﷺ نے فتحِ مکہ کے موقعہ پر اپنی حکمتِ عملی یا اپنے رفقاء کی وفا شعاری اور قوت بازو کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ سر جھکائے ہوئے فرمائے جارہے تھے۔

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَصَرَ عَبْدَهٗ وَصَدَقَ وَعْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ))[1]

''سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے اپنے بندے کی مدد کی، اپنا وعدہ سچا کر دکھایا اور اس اکیلے نے ہی تمام لشکروں کو مار بھگایا۔''

یہی اعتراف حقیقی ذکرِ نعمت اور شکرِ نعمت ہے۔ اسی کا اظہار بعد کے الفاظ میں ہے: ﴿هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ﴾ کہ کیا اللہ کے سوا کوئی پیدا کرنے والا ہے۔ ''من'' زائدہ ہے خالق مبتدا ہے، یعنی ﴿هَلْ خَالِقٌ غَيْرُ اللّٰهِ﴾ کیا اللہ کے علاوہ کوئی خالق ہے؟[2]

امام رازی رحمہ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں اس میں ''نعمتِ ایجاد'' کی طرف اشارہ ہے کہ ان نعمتوں کا کوئی اور موجد ہے؟ بلکہ اللہ تعالیٰ ہی سب کا خالق ہے نعمتوں کا موجد بھی وہی ہے اور وہی عبادت کا مستحق ہے۔ جیسا کہ سورۃ البقرہ میں دعوتِ توحید کا عنوان یہی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۝﴾[3]

''اے لوگو! اپنے ربّ کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم بچ جاؤ۔''

---

① سنن النسائی: 4803 ②فتح القدیر ③ البقرۃ: 21

جب سب کا وہی خالق ہے اور سب اسی کی مخلوق ہیں تو کوئی بھی عبادت کا استحقاق نہیں رکھتا۔ بلکہ مشرکین اس بات کے معترف تھے کہ اللہ کے علاوہ کوئی خالق نہیں۔

﴿وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰہُ﴾ ①

''اور بلاشبہ اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور ہی کہیں گے کہ اللہ نے۔''

اسی موضوع کی دیگر آیات العنکبوت ②، النمل ③، المومنون ④ وغیرہ سورتوں میں ہیں۔ مگر اس اعترافِ حقیقت کے باوجود وہ اللہ خالق و مالک کے سوا مخلوق کی عبادت کرتے تھے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اٰلِـہَۃً لَّا یَخۡلُقُوۡنَ شَیۡئًا وَّ ہُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ وَ لَا یَمۡلِکُوۡنَ لِاَنۡفُسِہِمۡ ضَرًّا وَّ لَا نَفۡعًا وَّ لَا یَمۡلِکُوۡنَ مَوۡتًا وَّ لَا حَیٰوۃً وَّ لَا نُشُوۡرًا ۝﴾ ⑤

''اور انہوں نے اس کے سوا کئی اور معبود بنا لیے، جو کوئی چیز پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ اور اپنے لیے نہ کسی نقصان کے مالک ہیں اور نہ نفع کے اور نہ کسی موت کے مالک ہیں اور نہ زندگی کے اور نہ اٹھائے جانے کے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَالَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ لَا یَخۡلُقُوۡنَ شَیۡئًا وَّ ہُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ ۝ اَمۡوَاتٌ غَیۡرُ اَحۡیَآءٍ ۚ وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ ۙ اَیَّانَ یُبۡعَثُوۡنَ ۝﴾ ⑥

''اور وہ لوگ جنہیں وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، وہ کچھ بھی پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ مردے ہیں زندہ نہیں ہیں اور وہ نہیں جانتے کب اٹھائے جائیں گے۔''

① لقمان : 25 ② العنکبوت : 63,61 ③ النمل :59, 60 ④ المومنون : 85,84 ⑤ الفرقان : 3 ⑥النحل : 21,20

بلکہ یہ بھی فرمایا:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ ۝﴾ [1]

''اے لوگو! ایک مثال بیان کی گئی ہے سو اسے غور سے سنو! بے شک وہ لوگ جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، ہرگز ایک مکھی پیدا نہیں کریں گے، خواہ وہ اس کے لیے جمع ہو جائیں اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے وہ اسے اس سے چھڑا نہ پائیں گے، کمزور ہے مانگنے والا اور وہ بھی جس سے مانگا گیا۔''

علامہ شہاب الدین سیّد محمود آلوسی رحمہ اللہ مفتیِ بغداد، اپنی معروف تفسیر روح المعانی میں اسی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس آیت میں ان غالیوں کے غلو کی مذمت کی طرف اشارہ ہے جو وہ اولیائے کرام کے بارے میں کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ سے غافل ہو کر مشکلات میں ان سے مدد مانگتے ہیں۔ ان کی نذر ومنت مانتے ہیں۔ ان میں جو کچھ عقل مند ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ بزرگ اللہ کے ہاں ہمارا وسیلہ ہیں، ہم نذر اللہ کی مانتے ہیں اور اس کا ثواب بزرگوں کو پہنچاتے ہیں۔ اور یہ کوئی پوشیدہ بات نہیں کہ وہ اپنے پہلے دعویٰ میں بتوں کی پرستش کرنے والوں کے مشابہ ہیں۔ جو کہتے تھے کہ ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیتے ہیں۔

اور ان کے دوسرے دعویٰ میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ وہ ان سے اپنے مریضوں کی شفا یا ان کے گم شدہ کو لوٹانے وغیرہ جیسے معاملات کو ان سے طلب نہ کریں۔ اور ان کے حال سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایسے امور ان سے طلب کرتے ہیں۔ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اگر انھیں کہا جائے کہ وہ اللہ کی نذر مانیں اور اس کا ثواب

---

[1] الحج: 73

اپنے والدین کو پہنچائیں جو اولیائے کرام سے اس ثواب کے زیادہ مستحق ہیں تو ایسا وہ نہیں کریں گے۔ میں نے ان میں سے اکثر کو دیکھا جو اولیائے کرام کی قبروں کی چوکھٹ پر سجدہ کرتے ہیں، ان میں سے بعض وہ ہیں جو قبروں میں پڑے بزرگوں میں تصرف ثابت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حسبِ مراتب ان میں تصرف کے مراتب ودرجات مختلف ہیں۔ اور جو ان میں پڑھے لکھے ہیں وہ چار یا پانچ بزرگوں میں تصرف کے قائل ہیں۔ اور جب ان سے اس بارے میں دلیل طلب کی جائے تو کہتے ہیں کہ یہ سب بذریعہ کشف ثابت شدہ حقیقت ہے۔

((قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى مَا اَجْهَلَهُمْ وَاَكْثَرَ اِفْتِرَآءَ هُمْ)) اللہ انہیں ہلاک وبرباد کرے کس قدر ان کی جہالت اور ان کا افترا ہے۔ اور بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ یہ بزرگ قبروں سے نکل کر مختلف شکلیں اختیار کرلیتے ہیں۔ اور ان کے علماء کہتے ہیں کہ ان کی ارواح مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہیں اور جہاں چاہتے ہیں آتے جاتے ہیں۔ بسا اوقات وہ شیر اور ہرن کی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔ یہ سب باتیں باطل ہیں۔ کتاب وسنت میں اور سلف کے کلام میں اس کی کوئی بنیاد نہیں، ان لوگوں نے سادہ لوح انسانوں کے دین میں فساد پیدا کردیا ہے۔ یہود ونصاریٰ اور دہریوں کے نزدیک دین کو مذاق بنا دیا ہے ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے عفو وعافیت کے طلب گار ہیں۔ [1]

﴿يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ﴾ یہ مبتدا کی خبر ہے یا جملہ مستانفہ ہے یا ''خالق'' جو مبتدا واقع ہوا ہے، کی دوسری صفت ہے اور خبر محذوف ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ 'يَرْزُقُكُمْ' مضارع کے صیغہ میں نعمتِ رزق کے آخر تک باقی رہنے کی طرف اشارہ ہے۔ شکمِ مادر سے آخری لمحات تک رزق دینے والا اللہ ہے۔

گویا اللہ تعالیٰ ہی نعمت عطا کرنے والے اور اسے آخری لمحات تک باقی رکھنے والے ہیں۔ نہ کوئی اس کے علاوہ نعمت دینے والا ہے اور نہ ہی اللہ کی دی ہوئی نعمت کو اس کے سوا کوئی ختم کرنے والا ہے۔ آسمان سے بارش برسا کر زمین سے تمہارے

[1] روح المعانی : 193/17

رزق کا سامان تیار کرنے والا صرف اللہ ہی ہے۔ جیسا کہ قرآنِ مجید میں توحید کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ ①

''جس نے تمہارے لیے زمین کو ایک بچھونا اور آسمان کو ایک چھت بنا دیا اور آسمان سے کچھ پانی اتارا پھر اس کے ساتھ کئی طرح کے پھل تمہاری روزی کے لیے پیدا کیے، پس اللہ کے لیے کسی قسم کے شریک نہ بناؤ، جب کہ تم جانتے ہو۔''

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿وَ فِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَ مَا تُوْعَدُوْنَ﴾ ②

''اور آسمان ہی میں تمہارا رزق ہے اور وہ بھی جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو۔''

''سماء'' سے مراد بارش بھی ہے یعنی آسمان سے بارش کے باعث تمھیں رزق مل رہا ہے۔ جیسا کہ اوپر سورۃ البقرہ کی آیت میں ہے۔ اس سے آسمان پر اللہ کے ہاں لوحِ محفوظ میں درج رزق بھی مراد ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ یَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ﴾ ③

''اور زمین میں کوئی چلنے والا (جاندار) نہیں مگر اس کا رزق اللہ ہی پر ہے اور وہ اس کے ٹھہرنے کی جگہ اور اس کے سونپے جانے کی جگہ کو جانتا ہے، سب کچھ ایک واضح کتاب میں درج ہے۔''

① البقرۃ: 22 ② الذاریات: 22 ③ ھود: 6

زمین پر ہر جاندار کو، وہ چھوٹا ہو یا بڑا، سمندروں اور دریاؤں میں ہو یا جنگلوں اور صحراؤں میں، سب کو اللہ کی طرف سے رزق مل رہا ہے وہی جانتا ہے کہ ان کا مستقر کہاں ہے اور عارضی ٹھکانا کہاں ہے۔ جہاں کہیں بھی کوئی ہے اسے قسمت کا رزق مل رہا ہے۔ اس کے ساتھ سورۃ العنکبوت بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔ ①

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'اِنَّ الرِّزْقَ لَیَطْلُبُ الْعَبْدَ کَمَا یَطْلُبُهٗ اَجَلُهٗ.' ②

''رزق بندے کو اسی طرح تلاش کرتا ہے جیسے اسے اس کی موت تلاش کرتی ہے۔''

ایک روایت میں ہے کہ اگر کوئی اپنے رزق سے بھاگے تو رزق اسے جا لیتا ہے جیسے موت جا لیتی ہے۔ ③

اسی لیے آپ نے فرمایا: لوگو! اللہ سے ڈرو رزق کی تلاش میں اچھا طریقہ اختیار کرو، ہر ایک اپنے مرنے سے پہلے اپنا رزق پالے گا گو وہ کچھ مؤخر ہو جائے۔ ④

اس موضوع کی مزید روایات کے لیے الترغیب والترہیب ⑤ ملاحظہ فرمائیں۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس کا اعتراف مشرکینِ مکہ کو بھی تھا۔ چناں چہ سورۂ یونس میں ہے:

﴿قُلْ مَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اَمَّنْ یَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ مَنْ یُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ یُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَ مَنْ یُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَیَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ﴾ ⑥

''کہہ دے کون ہے جو تمھیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یا کون ہے جو کانوں اور آنکھوں کا مالک ہے؟ اور کون زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟ اور کون ہے جو ہر کام کی تدبیر کرتا ہے؟ تو وہ ضرور

① العنکبوت:60 ② ابن حبان: 98/5 ③ طبرانی ④ ابن ماجہ، الحاکم

⑤ الترغیب والترہیب: 535,534/2 ⑥ یونس: 31

کہیں گے اللہ، تو کہہ: پھر کیا تم ڈرتے نہیں؟''

یہاں بھی بالکل یہی اسلوب ہے ان سے پوچھا جاتا ہے: کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے؟ کیا کوئی اور ہے جو آسمان وزمین سے رزق دے رہا ہے؟ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ نہ کوئی اللہ کے سوا خالق ہے اور نہ ہی رازق، تو 'لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ' معبود بھی وہی ہے لہٰذا تم اسے چھوڑ کر کہاں پھر رہے ہو؟ ﴿فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ﴾ پھر تمھیں دھوکا کہاں سے لگا ہے اور کہاں سے بہکائے جارہے ہو کہ خالق ورازق تو ہو اللہ، مگر تم اس کے سوا دوسروں کو معبود بناتے ہو۔ توحید کی جگہ شرک، سچائی کی بجائے جھوٹ کی طرف پھر رہے ہو۔

''الافک'' ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنے صحیح رخ سے پھیر دی گئی ہو۔ اسی بنا پر ان ہواؤں کو جو اپنا اصلی رخ چھوڑ دیں ''مُؤْتَفِكَاتٌ'' کہا جاتا ہے۔ جھوٹ بھی چوں کہ حقیقت سے پھرا ہوا ہوتا ہے اس لیے اس پر بھی ''افک'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اللہ کو رازق تسلیم کرنے کے باوجود شرک کی راہ چلنا جھوٹ کی پیروی کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّ تَخْلُقُوْنَ اِفْكًا اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَ اعْبُدُوْهُ وَ اشْكُرُوْا لَهٗ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۝﴾ [1]

''تم اللہ کے سوا چند بتوں ہی کی تو عبادت کرتے ہو اور تم سراسر جھوٹ گھڑتے ہو۔ بلاشبہ اللہ کے سوا جن کی تم عبادت کرتے ہو تمھارے لیے کسی رزق کے مالک نہیں ہیں، سو تم اللہ کے ہاں ہی رزق تلاش کرو اور اس کی عبادت کرو اور اس کا شکر بجا لاؤ، اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔''

[1] العنکبوت: 17

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ شَيْئًا وَّ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ﴾ ①

''اور وہ اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انہیں آسمانوں اور زمین سے کچھ بھی رزق دینے کے مالک ہیں اور نہ وہ (اس کی) طاقت رکھتے ہیں۔''

مشرکینِ مکہ بتوں کی ہی نہیں فرشتوں کی بھی عبادت کرتے تھے اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرتے تھے۔ اس آیت سے ان تمام کی نفی ہوگئی کہ جن کی بھی اللہ کے سوا عبادت کی جاتی ہے وہ نہ کسی کے رزق کے مالک ہیں نہ ہی ان میں یہ طاقت وقدرت ہے کہ کسی کو رزق دے سکیں۔ ان سے پہلے کی مخلوق کو رزق کون دیتا ہے؟ لہٰذا جب اللہ کے سوا کوئی رازق نہیں تو بندگی بھی اسی کی ہونی چاہیے اِدھر اُدھر سر مارنے کی بجائے اسی کو اپنا معبود ماننا چاہیے۔

:: :: ::

① النحل : 73

﴿وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ○ ﴾ (فاطر:٤)

"اور اگر وہ تمہیں جھٹلائیں تو یقیناً تم سے پہلے کئی رسول جھٹلائے گئے اور سب کام اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔"

سابقہ آیت میں دعوتِ توحید کے بعد اس آیت میں رسالت کے بارے میں ان کی ہٹ دھری پر آپ ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ کو جھٹلانا کوئی نیا نہیں پہلے انبیائے کرام علیہم السلام کو بھی ان کی امتوں نے جھٹلایا تھا۔ آپ فکر مند نہ ہوں بلکہ صبر واستقلال سے اپنے مشن کو جاری رکھیں جیسا کہ پہلے انبیائے کرام علیہم السلام کا عمل رہا ہے:

﴿وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰى اَتٰهُمْ نَصْرُنَا ﴾ ①

"اور بلاشبہ یقیناً تجھ سے پہلے کئی رسول جھٹلائے گئے تو انہوں نے اس پر صبر کیا کہ وہ جھٹلائے گئے اور ایذا دیے گئے، یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد آ گئی"

رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے کے یہ معنی قطعاً نہیں کہ وہ معاذ اللہ یہ کہتے تھے کہ آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ بلکہ وہ آپ کو صادق وامین کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے:

﴿قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِىْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ○ ﴾ ②

"بے شک ہم جانتے ہیں کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ یقیناً تجھے وہ بات

① الانعام : 34 ② الانعام : 33

غمگین کرتی ہے جو وہ کہتے ہیں، تو بے شک وہ تمہیں نہیں جھٹلاتے، لیکن وہ ظالم اللہ کی آیات ہی کا انکار کرتے ہیں۔"

ابوجہل نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا:

((إِنَّا لَا نُكَذِّبُكَ، وَلٰكِنْ نُكَذِّبُ مَا جِئْتَ بِهِ)) [1]

"ہم آپ کو جھوٹا نہیں کہتے بلکہ جو کچھ آپ لے کر آئے ہیں اس کی تکذیب کرتے ہیں۔"

بلکہ اخنس بن شریق نے جب ابوجہل سے آپ کے بارے میں پوچھا تب بھی اس نے کہا: اللہ کی قسم، محمد صادق ہیں انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، ہم نے بنو عبد مناف کا ہر میدان میں ہر پہلو سے مقابلہ کیا، اب وہ کہتے ہیں کہ ہم میں سے نبی مبعوث ہوا ہے تو ہم یہ سعادت کیسے پا سکتے ہیں؟ ایک روایت میں ہے کہ سقایہ، حجابہ، لواء اور نبوت بنو قصی لے جائیں تو قریش کے پاس کیا بچے گا اس لیے ہم اس کو جھٹلاتے ہیں۔ [2]

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے مفتاح دار السعادۃ [3] میں ذکر کیا ہے کہ ابوجہل نے اسی نوعیت کی بات حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے کہی تھی مگر یہ درست نہیں حضرت مسور رضی اللہ عنہ تو ہجرت کے دوسرے سال پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے ابوجہل کی ان سے ایسی گفتگو قطعاً بے محل ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے بنیادی تین اصول تھے اور وہ ان تینوں کو جھٹلاتے تھے۔ ان میں سے ایک یہ کہ آپ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ صاف صاف کہتے تھے ﴿لَسْتَ مُرْسَلًا﴾ [4] آپ رسول نہیں ہیں۔ انہیں اس پر یقین نہیں آتا تھا کہ ہم ہی میں سے کوئی رسول کے مرتبہ پر سرفراز ہو سکتا ہے۔

﴿بَلْ عَجِبُوٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا

① الحاکم، ابن کثیر: 176/2 ② ابن کثیر: 177/2 ③ مفتاح دارالسعادۃ: 97/1 طبع اولیٰ ۱۳۲۳ھ ④ الرعد: 23

شَیْءٌ عَجِیْبٌ ۝﴾ [1]

''بلکہ انھوں نے تعجب کیا کہ ان کے پاس انھی میں سے ایک ڈرانے والا آیا۔ یہ ایک عجیب چیز ہے''

یہی اعتراض پہلی قوموں کو بھی تھا:

﴿فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ اِنَّآ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ۝﴾ [2]

''پس انہوں نے کہا کیا ایک آدمی جو ہمیں سے ہے اکیلا، ہم اس کے پیچھے لگ جائیں؟ یقیناً ہم تو اس وقت بڑی گمراہی اور دیوانگی میں ہوں گے۔''

یہی بات سورۃ التغابن [3] میں بھی بیان ہوئی ہے کہ وہ تعجب کرتے تھے اسی طرح وہ یہ بھی کہتے تھے:

﴿وَ قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ یَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ لَوْ لَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَلَكٌ فَیَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِیْرًا ۝﴾ [4]

''اور انہوں نے کہا: اس رسول کو کیا ہے کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اس کی طرف کوئی فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا کہ اس کے ساتھ ڈرانے والا ہوتا۔''

اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَیَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ یَمْشُوْنَ فِی الْاَسْوَاقِ ﴾ [5]

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجے مگر بلاشبہ وہ یقیناً کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔''

دوسرا اس اعتبار سے جھٹلاتے تھے کہ تمہاری یہ بات کہ اللہ کے سوا عبادت کا کوئی

[1] ق : 2 [2] القمر : 24 [3] سورة التغابن: 6 [4] الفرقان : 7 [5] الفرقان : 20

مستحق نہیں، بالکل غلط ہے۔ ان دونوں کا ذکر ایک ہی مقام پر یوں آیا ہے:

﴿وَ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ۝ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰـهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ۝﴾ [1]

''اور انہوں نے اس پر تعجب کیا کہ ان کے پاس انہی میں سے ایک ڈرانے والا آیا اور کافروں نے کہا: یہ ایک سخت جھوٹا جادوگر ہے۔ کیا اس نے تمام معبودوں کو ایک ہی معبود بنا ڈالا؟ بلاشبہ یہ یقیناً بہت عجیب بات ہے۔''

تیسرا سبب یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ روزِ قیامت سے انہیں ڈراتے تھے مگر وہ کہتے تھے:

﴿ءَ اِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِیْدٌ۝﴾ [2]

''کیا جب ہم مر گئے اور ہم مٹی ہو گئے؟ یہ واپس لوٹنا بہت دور ہے۔''

حضرت خباب رضی اللہ عنہ بن ارت لوہار تھے۔ مشہور صحابی حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کے باپ عاص بن وائل نے ان سے تلوار بنوائی تھی۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے مزدوری کا مطالبہ کیا تو اس نے کہا: جب تک محمد ﷺ کا انکار نہیں کرو گے تمہیں مزدوری نہیں دوں گا۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم مر کر دوبارہ زندہ ہو جاؤ تب بھی آپ ﷺ کا دامن نہیں چھوڑوں گا۔ عاص نے کہا: کیا مر کر زندہ ہونا ہے؟ انہوں نے فرمایا: بالکل، عاص نے کہا: اچھا وہیں میرا مال و متاع ہوگا وہیں رقم دے دوں گا۔ [3]

بلکہ وہ قسمیں کھا کھا کر قیامت کا انکار کرتے تھے:

﴿وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ لَا یَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ یَّمُوْتُ بَلٰی وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۝﴾ [4]

---

[1] ص: 5,4 [2] ق: 3 [3] بخاری: 4732 وغیرہ [4] النحل: 38

”اور انھوں نے اپنی پکی قسمیں کھاتے ہوئے اللہ کی قسم کھائی کہ اللہ اسے نہیں اٹھائے گا جو مر جائے۔ کیوں نہیں! وعدہ ہے اس کے ذمے سچا اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“

قیامت کا انکار منکرین کی طرف سے ہر دور میں ہوا ہے جس کا بیان قرآنِ مجید میں کئی مقامات پر ہوا ہے۔① انبیائے کرام میں یہ تینوں عقیدے مشترک رہے ہیں۔ اور مخاطبین ان تینوں کا انکار کرتے تھے۔ کفارِ مکہ بھی اپنے پیش رو کی طرح ان تینوں کے منکر تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی حوالے سے ان کی اس ضد اور ہٹ دھرمی پر آپ کی تسلی وتشفی کے طور پر فرمایا ہے: کہ آپ سے پہلے بھی کئی رسول جھٹلائے گئے ہیں۔ جیسے ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ﴾②

”تجھے نہیں کہا جائے گا مگر وہی جو ان رسولوں سے کہا گیا جو تجھ سے پہلے تھے۔“

اس لیے ان کی تکذیب سے آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوں، صبر واستقلال سے اپنا فریضہ پورا کرتے رہے۔ ﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ فیصلہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس تکذیب کا وہ عنقریب مزہ چکھ لیں گے۔ جس مالک کے حکم سے آپ اپنی ذمہ داری پوری کررہے ہیں۔ سارے معاملات اس کے سامنے ہیں اور انجامِ کار بھی اسی کے پاس ہے، نیک اور بد سب اسی کے حضور حاضر ہونے والے ہیں۔ ہر ایک کو اس کے کیے کا بدلا ملے گا آپ اللہ کے بھروسہ پر اپنی ذمہ داری نبھاتے رہیں۔ یہاں ﴿تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ سے مراد تمام امور کی تدبیر نہیں بلکہ فیصلہ ہے کہ فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗ اِلَى اللّٰهِ﴾③ ”اور وہ چیز جس میں تم نے اختلاف کیا کوئی بھی چیز ہو تو اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔“

① ملاحظہ فرمائیں: یٰس: 78,77، الانعام: 29، الصافات: 16، المومنون: 37,33، الواقعۃ: 47، الاسراء: 98,49، سبا: 3 ② فصلت: 43 ③ الشوریٰ: 10

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا وَ لَا يَغُرَّنَّكُمۡ بِاللّٰهِ الۡغَرُوۡرُ۝﴾(فاطر:۵)

''اے لوگو! یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے، کہیں دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے، اور کہیں وہ دھوکے باز تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکا نہ دے جائے۔''

﴿وَعۡدَ اللّٰهِ﴾ سے مراد قیامت، حشر ونشر، حساب وکتاب اور جنت ودوزخ کا وعدہ ہے۔ جس کی طرف پہلی آیت کے اختتام میں بھی اشارہ ہے ﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ﴾ کہ تمام معاملات کا انجام اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، بالآخر فیصلہ اسی کا ہوگا۔ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ یہ فیصلہ حق ہے جو بہر نوع ہو کے رہے گا۔

﴿فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ﴾ تمہیں دنیا کی آسائش اور مال ودولت کی فراوانی دنیاوی لذت وسرور، اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت سے اور آخرت سے غافل نہ کر دے۔ ورنہ قیامت کے روز کفِ افسوس ملو گے۔

﴿اَنۡ تَقُوۡلَ نَفۡسٌ يّٰحَسۡرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطۡتُّ فِىۡ جَنۡۢبِ اللّٰهِ وَ اِنۡ كُنۡتُ لَمِنَ السّٰخِرِيۡنَ۝﴾[1]

''کہ کوئی شخص کہے ہائے افسوس! اس کوتاہی پر جو میں نے اللہ کی جناب میں کی اور بے شک میں تو مذاق کرنے والوں میں سے تھا۔''

منکرینِ قیامت بھی اپنے آپ پر افسوس کریں گے:

﴿قَدۡ خَسِرَ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِلِقَآءِ اللّٰهِ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتۡهُمُ السَّاعَةُ بَغۡتَةً قَالُوۡا يٰحَسۡرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطۡنَا فِيۡهَا وَ هُمۡ يَحۡمِلُوۡنَ

[1] الزمر: 56

اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ﴾ ①

''یقیناً خسارے میں رہے وہ لوگ جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا، یہاں تک کہ جب ان کے پاس قیامت اچانک آ پہنچے گی کہیں گے ہائے ہمارا افسوس! اس پر جو ہم نے اس میں کوتاہی کی، اور وہ اپنے بوجھ اپنی پشتوں پر اٹھائیں گے، سن لو! برا ہے جو وہ بوجھ اٹھائیں گے۔''

انسان موت کے وقت مہلت کی آرزو کرے گا تاکہ نیک عمل کرے مگر اسے مہلت نہ دی جائے گی۔ ②

اور قیامت کے روز بھی پکارے گا: ﴿يٰلَيْتَنِىْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِىْ﴾ اے کاش! میں نے اپنی زندگی کے لیے آگے بھیجا ہوتا۔ مگر

ع اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ الدُّنْيَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ، وَاِنَّ اللّٰهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيْهَا فَيَنْظُرُ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ، فَاتَّقُوا الدُّنْيَا وَاتَّقُوا النِّسَاءَ)) ③

''بے شک دنیا میٹھی سرسبز وشاداب ہے اور اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس میں خلیفہ بنایا ہے پس وہ دیکھتا ہے تم کیسے عمل کرتے ہو، دنیا سے بچو اور عورتوں سے بچو۔''

یعنی مال ودولت اور عورت کے فتنہ سے بچو۔ کتنے ہیں جو مال ودولت کے نشہ میں مبتلا ہیں اور کتنے ہیں جنھیں عورت کے فتنہ نے برباد کردیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ

① الانعام: 31 ② المنافقون: 11،10 ③ مسلم: 2742

الْحَرْثِ ط ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ﴾ ①

’’لوگوں کے لیے نفسانی خواہشوں کی محبت مزین کی گئی ہے، جو عورتوں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے اور نشان لگائے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی ہیں۔ یہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور اللہ ہی ہے جس کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔‘‘

دنیا کے سارے مال ودولت ہی کے بارے میں فرمایا:

﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ج وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى﴾ ②

’’کہہ دے: دنیا کا سامان بہت تھوڑا ہے اور آخرت اس کے لیے بہتر ہے جو متقی بنے۔‘‘

حضرت سہل رضی اللہ عنہ بن سعد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَا سَقٰى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةَ مَآءٍ‘ ③

’’اگر دنیا کی حیثیت اللہ کے ہاں مچھر کے پر کے برابر ہوتی تو کافر کو ایک بار بھی پانی نہ پلاتا۔‘‘

دنیا کی مذمت میں متعدد احادیث ہیں شائقین الترغیب والترہیب میں باب الترغیب فی الزھد فی الدنیا ملاحظہ فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ مسلمان اور کافر، دونوں میں سے جسے چاہتے ہیں دنیا سے نواز دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی یہ تقسیم بھی ایک حکمت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتے تو تمام کفار کو دنیا سے نواز دیتے مگر ایسا نہیں، اور یہ اس لیے کہ نادان مال وزر کی بہتات کو ہی اللہ تعالیٰ

① آلِ عمران : 14 ② النساء : 77 ③ ترمذی : 2320، ابن ماجہ

کی محبت اور رضا کا ذریعہ نہ سمجھ لیں اور یوں وہ کہیں کفر کی راہ ہی اختیار نہ کرلیں۔
کفارِ مکہ اسی غلط فہمی کا شکار تھے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہے۔ چناں چہ کہتے ہیں۔

﴿وَ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۝ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ [1]

''اور انہوں نے کہا ہم اموال واولاد میں زیادہ ہیں، اور ہم ہرگز عذاب دیے جانے والے نہیں ہیں۔ کہہ دے بے شک میرا ربّ رزق فراخ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کردیتا ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

سورۃ الکہف میں دو دوستوں کا ذکر ہے، ان میں سے ایک کو اللہ تعالیٰ نے مال وزر سے نوازا تھا۔ انگوروں کے دو باغوں کا مالک تھا۔ دونوں باغ پھل دیتے تھے۔ درمیان میں نہر جاری تھی۔ کسی قسم کی کوئی کمی نہ تھی۔ ایک روز اس نے اپنے سے کمزور اورغریب دوست سے کہا:

﴿اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ۝ وَ دَخَلَ جَنَّتَهٗ وَ هُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۝ وَّ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّ لَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝﴾ [2]

''میں تجھ سے مال میں زیادہ اور نفری کے لحاظ سے زیادہ باعزت ہوں۔ اور وہ اپنے باغ میں اس حال میں داخل ہوا کہ وہ اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا۔ کہا: میں گمان نہیں کرتا کہ یہ کبھی برباد ہوگا۔ اور نہ میں قیامت کو گمان کرتا ہوں کہ قائم ہونے والی ہے۔ اور واقعی اگر مجھے میرے ربّ کی طرف لوٹایا گیا تو یقیناً میں ضرور اس سے بہتر لوٹنے کی جگہ پاؤں گا۔''

---
① سبا: 36,35 ② الکہف: 34-36

مال ودولت کی فراوانی کو، اپنی تمام تر معصیتوں کے باوجود سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر راضی ہے۔ بالفرض قیامت قائم ہو بھی جائے تو اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ بہتر معاملہ فرمائے گا۔ حالاں کہ مال ودولت کی یہ تقسیم اللہ تعالیٰ کی منشا اور ایک خاص حکمت پر مبنی ہے۔ چناں چہ مال وزر کی اس تقسیم کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا وَ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ○ وَ لَوْ لَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ○ وَ لِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ○ وَ زُخْرُفًا ؕ وَ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ ﴾ [1]

”ہم نے خود ان کے درمیان ان کی معیشت دنیا کی زندگی میں تقسیم کی اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں بلند کیا، تاکہ ان کا بعض، بعض کو تابع بنا لے اور تیرے ربّ کی رحمت ان چیزوں سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ اور اگر یہ نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی امت ہو جائیں گے تو یقیناً ہم ان لوگوں کے لیے جو رحمان کے ساتھ کفر کرتے ہیں، ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور سیڑھیاں بھی، جس پر وہ چڑھتے ہیں۔ اور ان کے گھروں کے دروازے اور تخت بھی، جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں۔ (چاندی کے بنا دیتے) اور سونے کے، اور یہ سب کچھ دنیا کی زندگی کے سامان کے سوا کچھ نہیں اور آخرت تیرے ربّ کے ہاں متقی لوگوں کے لیے ہے۔“

یہ مال ودولت کفار کے نزدیک تو بڑی عزت واحترام کا باعث ہے۔ مگر اللہ

[1] الزخرف: 32-35

تعالیٰ کے نزدیک اس کی حیثیت ایک مردار اور مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں۔ اللہ چاہتے تو تمام کفار کے گھروں کو، ان کے مکانوں کی سیڑھیوں کو سونے چاندی کا بنوا دیتے مگر ایسا اس لیے نہیں کیا کہ انسان اسی کو اپنی معراج سمجھتے ہوئے راہِ کفر اختیار نہ کر لیں۔ اور اس لیے بھی کہ یہ ایک دوسرے کے معاملات میں باہم معاون اور مددگار بن جائیں۔ ایک کارخانہ اور فیکٹری چلانے کے لیے مالک کو فورمین کی، مزدور کی، اور نگران کی ضرورت ہوتی ہے۔ سبھی مالک ومختار ہوں تو کاروبارِ زندگی ہی معطل ہو کر رہ جائے۔ اللہ کے ہاں یہی حکمتیں معیشت کی تقسیم میں کارفرما ہیں۔ بندۂ مومن کو دنیا کی فراوانی پر فریفتہ نہیں ہونا چاہیے۔ اور اس کے پیچھے پڑ کر ایمان اور عمل صالح کی زندگی ترک نہیں کرنی چاہیے۔

یاد رہے کہ دنیا میں انسان اللہ کی عبادت واطاعت کے لیے آیا ہے۔ اور یہ زادِ آخرت کا ذریعہ ہے۔ جو یہاں زادِ آخرت تیار نہیں کرتا بلکہ اسے لہو ولعب میں گزارتا ہے اسی کے لیے یہ دھوکے کا سامان ہے۔ مال ودولت اللہ تعالیٰ کی عطا اور ''فضل'' ہے۔ اس لیے اللہ کے فضل کی مذمت بے جا ہے۔ قابلِ مذمت تو وہ ہے جو اللہ کے فضل پر حمد وشکر کی بجائے تمرد اختیار کرتا ہے اور ناشکری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اسے اللہ کے حکم کی تعمیل میں خرچ نہیں کرتا بلکہ حرام راہوں میں اُڑاتا ہے اور جہنم کا ایندھن بنتا ہے جب کہ بندۂ مومن اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر کے جنت خرید لیتا ہے۔ اس لیے دنیا طلبی دھوکا نہیں، نہ ہی یہ باعثِ مذمت ہے۔ مومن دنیا وآخرت دونوں کی بہتری وبھلائی کا طلب گار ہے۔

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً﴾ [1]

''اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھی بھلائی دے۔''

باعثِ مذمت تو یہ ہے کہ وہ اس میں مگن ہو کر دنیا میں آنے کا مقصد ہی بھول

[1] البقرۃ :201

جائے اور اپنے انجام سے بے پروا ہو جائے۔ انھی لوگوں کے لیے دنیا دھوکے کا باعث ہے۔ انھی کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ ﴾ (1)

"تمھیں ایک دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی حرص نے غافل کر دیا ۔یہاں تک کہ تم نے قبرستان جا دیکھے۔"

"تکاثُر" کے معنی زیادت اور کثرت کے ہیں۔ یہ مال و دولت کے حصول میں ہو، عیش و عشرت کے سامان میں ہو، قوت و اقتدار اور جاہ و جلال میں ہو۔ جس میں مگن ہو کر اور اسی کو مقصدِ حیات سمجھ کر انسان اپنی زندگی کا اصل مقصد بھول جاتا ہے۔ یہی دنیا کا دھوکہ ہے دنیا کے بارے میں اسی "تکاثُر" کی بیماری کا ذکر ایک اور اسلوب میں بھی ہوا ہے:

"جان لو کہ بے شک دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل ہے اور دل لگی ہے اور بناؤ سنگار ہے اور تمھارا آپس میں ایک دوسرے پر بڑائی جتانا اور اموال اور اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے۔ اس بارش کی طرح ہے جس سے اگنے والی کھیتی نے کاشتکاروں کو خوش کر دیا، پھر وہ پک جاتی ہے، پھر تو دیکھتا ہے کہ زرد ہے پھر وہ چورا بن جاتی ہے اور آخرت میں بہت سخت عذاب ہے اور اللہ کی طرف سے بڑی بخشش اور خوشنودی ہے اور دنیا کی زندگی دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں۔" (2)

"تکاثُر" کے اسی روگ کی نشاندہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں فرمائی ہے:

((لَوْاَنَّ ابْنَ آدَمَ أُعْطِيَ وَادِيًا مِلأً مِّنْ ذَهَبٍ اَحَبَّ اِلَيْهِ ثَانِياً، وَلَوْ أُعْطِيَ ثَانِيًا اَحَبَّ اِلَيْهِ ثَالِثًا وَلَا يَسُدُّ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ اِلَّا التُّرَابُ)) (3)

(1) التکاثر: 2,1 (2) الحدید: 20 (3) بخاری: 6438

''اگر آدم کے بیٹے کو ایک وادی سونے کی دی جائے تو وہ دوسری کی محبت کرے گا، اور اگر دوسری وادی بھی سونے کی دے دی جائے تو وہ تیسری کی محبت کرے گا۔ آدم کے بیٹے کے پیٹ کو مٹی ہی بھرے گی۔''

مگر ان کے مقابلے میں وہ خوش نصیب بھی ہیں۔ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ﴾ [1]

''وہ مرد جنھیں اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے سے نہ کوئی تجارت غافل کرتی ہے اور نہ کوئی خرید وفروخت۔''

وہ دنیا کے مشاغل میں مصروف ہوتے ہوئے بھی اپنی زندگی کے مقصد سے غافل نہیں۔ ایسے ہی خوش بختوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے جسے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ:

'نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ' [2]

''نیک آدمی کے لیے پاکیزہ مال بہت اچھا ہے۔''

وہ اس مال کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں صرف کرتا ہے۔ اس لیے حلال مال کی طلب باعث مذمت نہیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں اگر فقراء صحابہ ابوذر، صہیب، بلال اور ابوہریرۃ رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے تو عثمان، عبدالرحمٰن بن عوف، زبیر بن عوام رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے امراء صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی تھے۔

﴿وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ﴾ اور نہ ہی تمھیں دھوکے باز اللہ رحمان ورحیم کے بارے میں دھوکے میں مبتلا کردے۔ ''الغرور'' دھوکے باز، یہ ''الغرر'' سے ہے اور اس کے معنی ہیں ''دھوکا۔'' اور ''الغرور'' سے مراد یہاں شیطان ہے جیسا کہ حضرت

---

[1] النور: 37 [2] مسند احمد: 197/4، الادب المفرد 299 وغیرہ

نے فرمایا ہے۔اگلی آیت مبارکہ میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اسی دھوکا باز نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلوایا ہے:

﴿فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ﴾ ①

''پس اس نے دونوں کو دھوکے سے نیچے اتار لیا۔''

قسمیں کھا کر یقین دلاتا تھا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ آدم علیہ السلام کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ کوئی اللہ کی قسم کھا کر جھوٹ بول سکتا ہے وہ اس کے بھرّے میں آ گئے اور جس درخت کے قریب جانے سے روکا گیا تھا اس کا پھل کھا لیا۔ جس کے نتیجے میں جنتی لباس اتر گیا اور جنت سے بھی نکال دیئے گئے۔ شیطان کا ''غرور'' یہ ہے وہ معصیت میں مبتلا کر کے یہ دلاسا دیتا ہے کہ اللہ بڑا غفور رحیم ہے۔ وہ چھوٹے بڑے سب گناہ اپنی کریمی ورحیمی سے معاف کردے گا۔ کبھی کہتا ہے کہ ابھی بڑا وقت ہے جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ عیش وعشرت سے زندگی بسر کرو، اس کے بعد توبہ کر لینا۔ کسی مسئلہ میں علماء کے جائز وناجائز ہونے میں اختلاف کو بہانہ بنا کر ناجائز کام کرواتا ہے۔ کبھی صغیرہ وکبیرہ کی تقسیم کی بنا پر گناہ کرواتا ہے۔ اور کبھی شفاعت کے دلاسے دیتا ہے۔

قیامت کے دن مومن اپنے نورِ ایمان میں چلتے ہوئے جنت میں جائیں گے۔ ان کے اور منافقوں کے مابین دیوار حائل ہوجائے گی، منافق کہیں گے کیا ہم دنیا میں تمہارے ساتھ نہ تھے:

﴿قَالُوْا بَلٰى وَ لٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَ تَرَبَّصْتُمْ وَ ارْتَبْتُمْ وَ غَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ﴾ ②

''مؤمن کہیں گے کیوں نہیں، لیکن تم نے اپنے آپ کو فتنہ میں ڈالا، تم انتظار کرتے رہے اور تم نے شک کیا اور (جھوٹی) آرزوؤں نے تمہیں

① الاعراف: 22 ② الحدید: 14

دھوکا دیا۔ یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ گیا اور اس دغا باز نے تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکا دیا۔"

شیطان نے منافقوں کو جن آرزوؤں میں مبتلا کیا اس کا خلاصہ اس آیت میں بیان ہوا۔ انتظار کرو، محمد کی پیروی میں جلدی کیا ہے۔ اہل کفر کو غلبہ حاصل ہوا تو ان کے ہو رہنا۔ محمد (ﷺ) کامیاب ہوئے تو تم بھی انہیں تسلیم کر لینا، شیطان نے انہیں اس شک میں بھی مبتلا کر دیا تھا کہ دیکھو محمد (ﷺ) سچے ہیں یا نہیں۔ ان کی دعوت سچی ہے یا نہیں، اسی طرح قرآن اور آخرت کے بارے میں بھی شک میں مبتلا کر دیے گئے تھے۔ اسی کشمکش میں انہیں موت نے آ لیا اور دھوکے باز کے دھوکے میں پھنس کر اپنی آخرت برباد کر لی۔

اسی دھوکا باز کی پیروی کے انجام سے خبردار کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ○ يَعِدُهُمْ وَ يُمَنِّيْهِمْ ؕ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ○ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ز وَ لَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا○﴾ [1]

"اور جو کوئی شیطان کو اللہ کے سوا دوست بنائے تو یقیناً اس نے خسارہ اٹھایا، واضح خسارہ۔ وہ انہیں وعدے دیتا ہے اور انہیں آرزوئیں دلاتا ہے اور شیطان انہیں دھوکے کے سوا کچھ وعدہ نہیں دیتا۔ یہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ اس سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں پائیں گے۔"

شیطان کے علاوہ ہر وہ چیز جو انسان کو دھوکے اور فریب میں مبتلا کر دے اس پر بھی "غرور" کا اطلاق ہوتا ہے چنانچہ دنیا، خواہشِ نفس، مال و جاہ میں پھنس کر انسان عموماً صراطِ مستقیم سے بھٹک جاتا ہے۔ شیطان کے ساتھ شیاطین نما انسان بھی یہی کردار ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آخری سورت میں "من الجنة و الناس" جنوں اور انسانوں سے پناہ طلب کی گئی ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

[1] النساء : 119-121

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا﴾ ①

''اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسانوں اور جنوں کے شیطانوں کو دشمن بنا دیا، ان کا بعض، بعض کی طرف ملمع کی ہوئی بات دھوکا دینے کے لیے دل میں ڈالتا ہے۔''

مختلف اسانید سے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((يَا أَبَا ذَرٍّ ! هَلْ تَعَوَّذْتَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيَاطِيْنِ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ؟ قُلْتُ: لَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، وَهَلْ لِلْإِنْسِ مِنْ شَيَاطِيْنَ؟ قَالَ! نَعَمْ هُمْ شَرٌّ مِنْ شَيَاطِيْنِ الْجِنِّ)) ②

''اے ابوذر رضی اللہ عنہ! کیا تو نے شیاطینِ انس وجن سے اللہ کی پناہ طلب کی ہے؟'' میں نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا انسانوں میں شیاطین ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں، وہ شیاطین جن سے برے ہیں۔''

جس طرح شیاطین، انسان کو گمراہ کرتے ہیں اسی طرح بعض انسان، انسانوں کی گمراہی کا سبب بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صالحین کی ہم نشینی کی ترغیب دی ہے اور برے اور معصیت میں پھنسے ہوئے لوگوں سے بچنے کی تاکید کی ہے۔

شیطان جہاں کفر وشرک میں مبتلا کرتا ہے کبائر اور معصیتوں میں پھنساتا ہے وہاں افضل عمل چھڑوا کر مفضول اعمال میں انسان کو خوش رکھتا ہے۔ سنت کی جگہ بدعت پر آمادہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کے مکر وفریب سے محفوظ رکھے۔ شیطان کے مکائد کیا ہیں اور کن کن صورتوں میں وہ گمراہی میں مبتلا کرتا ہے۔ شائقین اس کی تفصیل علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ کی ''تلبیس ابلیس'' اور حافظ ابن قیم کی ''اغاثۃ اللهفان'' میں ملاحظہ فرمائیں۔

---

① الانعام : 112 ② ابن کثیر : 186/2

﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ○﴾ (فاطر:٦)

"بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے اسے دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو اپنے گروہ والوں کو صرف اس لیے بلاتا ہے کہ وہ بھڑکتی آگ والوں سے ہو جائیں۔"

جس بڑے دھوکے باز کا پہلی آیت میں ذکر ہے اسی کے بارے میں خبردار کیا گیا ہے کہ یہ شیطان تمہارا دشمن ہے اس کی اطاعت سراسر گھاٹے کا سودا ہے اور آخرت میں جہنم جانے کا سبب ہے۔ اس نے تمہارے باپ آدم اور ماں حوا کو جنت سے نکلوایا، پھر اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر آدم کی اولاد کو گمراہ کرنے کا یوں عزم ظاہر کیا:

﴿لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شَاكِرِيْنَ○﴾[1]

"میں ضرور ان کے لیے تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا۔ پھر میں ہر صورت ان کے آگے سے ان کے پیچھے سے اور ان کی دائیں طرفوں سے اور ان کی بائیں طرفوں سے آؤں گا اور تو ان کے اکثر کو شکر کرنے والا نہیں پائے گا۔"

ایک اور مقام پر اس کی اسی جسارت کا ذکر یوں ہے:

﴿وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا○ وَلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

[1] الاعراف : 17,16

فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِينًا ﴾ [1]

"اور اس نے کہا میں ہر صورت تیرے بندوں سے ایک مقرر حصہ ضرور لوں گا۔ اور یقیناً میں انہیں ضرور گمراہ کروں گا اور یقیناً میں انہیں ضرور آرزوئیں دلاؤں گا اور یقیناً میں انہیں ضرور حکم دوں گا تو یقیناً وہ ضرور چوپاؤں کے کان کاٹیں گے اور یقیناً میں انہیں ضرور حکم دوں گا تو یقیناً وہ ضرور اللہ کی پیدا کی ہوئی صورت بدلیں گے۔ اور جو کوئی شیطان کو اللہ کے سوا دوست بنائے تو یقیناً اس نے خسارہ اٹھایا، واضح خسارہ۔"

یہ تیری اطاعت کریں گے تو میری اطاعت بھی کریں گے۔ یہ تیرے لیے سر بسجود ہوں گے تو میرے کہنے پر قبروں اور بتوں کو بھی سجدہ کریں گے۔ یہ تیرے گھر کا طواف کریں گے تو قبروں اور بتوں کا طواف بھی کریں گے، تیری نذر و منت دیں گے تو بزرگوں کی نذر و منت بھی پوری کریں گے۔ یوں یہ سب کو راضی رکھنے کی کوشش کریں گے۔ حافظ شیرازی نے بھی تو کہا ہے:

حافظ کہ وصل خواہی صلح کن بخاص و عام
بامسلماں اللہ اللہ بابرہمن رام رام

جس نے یوں روزِ اوّل ہی سے تمہیں بہر نوع گمراہ کرنے کی ٹھان رکھی ہے اور قسمیں کھا کر کہا:

﴿فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴾ [2]

"تیری عزت کی قسم میں ضرور بالضرور ان سب کو گمراہ کروں گا۔"

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ابلیس نے کہا تھا:

---

[1] النساء: 119,118 [2] ص: 82

((وَعِزَّتِكَ لَا اَبْرَحُ اُغْوِیْ عِبَادَكَ مَا دَامَتْ اَرْوَاحُهُمْ فِیْ اَجْسَادِهِمْ)) ①

''اے اللہ! تیری عزت کی قسم، میں ہمیشہ انہیں گمراہ کروں گا جب تک ان کی روحیں ان کے جسموں میں ہوں گی۔''

جس دشمن نے یوں قسمیں کھا کر اولادِ آدم کو بدراہ کرنے کا عزم کر رکھا ہو، اس کی دشمنی میں بھی کوئی شک ہوسکتا ہے؟ اس نے تو اولادِ آدم کے خلاف اعلانِ عداوت کر رکھا ہے یہ باغی اللہ تعالیٰ کا تھا مگر دشمنی اولادِ آدم سے ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ آدم علیہ السلام کی وجہ سے راندۂ درگا بنا ہے۔ اسی قرآنِ مجید میں اسے آٹھ بار ﴿عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ﴾ اور ایک جگہ ﴿عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ﴾ کہا ہے کہ وہ کھلم کھلا گمراہ کرنے والا دشمن ہے۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّیَّتَهٗۤ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا﴾ ②

''تو کیا تم اسے اور اس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر دوست بناتے ہو، حالاں کہ وہ تمہارے دشمن ہیں، وہ (شیطان) ظالموں کے لیے بطور بدل بُرا ہے۔''

یعنی شیطان اور اس کے پیروکار تمہارے دشمن ہیں۔ میں نے تو تمہارے باپ آدم کو فرشتوں سے سجدہ کروا کے عزت بخشی اور شیطان نے تمہارے باپ کی تعظیم وتکریم سے انکار کردیا۔ اور الٹا متکبرانہ انداز میں ہمیشہ مقابلے کی اور اولادِ آدم سے دشمنی کی ٹھان لی۔ اندریں حالات تم مجھے چھوڑ کر شیطان کے دوست بن جاؤ تو تمہارا یہ تبادلہ بہت برا ہے۔ دوستی کا حق دار میں ہوں نہ کہ شیطان، بھلا کوئی عقل مند اپنے دشمن سے بھی دوستی کا تصور کرسکتا ہے؟

① مسند احمد، حاکم ② الکھف : 50

پھر ایک دشمن تو وہ ہوتا ہے جو انسان کے مدِ مقابل ہوتا ہے انسان اس سے بچنے کی کوئی نہ کوئی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مگر شیطان ایسا دشمن ہے جو نظر نہیں آتا پھر بھی اس کی اثر پزیری کا یہ عالم ہے کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ

((اِنَّ الشَّیُطَانَ یَجُرِیُ مِنَ الْاِنُسَانِ مَجُرَی الدَّمِ)) ①

”شیطان انسان میں یوں گردش کرتا ہے جیسے رگوں میں خون گردش کرتا ہے۔“

ایسے خطرناک پوشیدہ دشمن سے بچاؤ اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں یہی وجہ ہے کہ شیطان سے بچنے کے لیے استعاذہ کا حکم ہے۔ چناں چہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِمَّا یَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ۝﴾ ②

”اگر کبھی شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ تجھے ابھار ہی دے تو اللہ کی پناہ طلب کر، بلاشبہ وہی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَ قُلۡ رَّبِّ اَعُوۡذُ بِكَ مِنۡ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیۡنِ ۝ وَ اَعُوۡذُ بِكَ رَبِّ اَنۡ یَّحۡضُرُوۡنِ۝﴾ ③

”اور تو کہہ: اے میرے ربّ! میں شیطانوں کی اکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ اور اے میرے رب! میں اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آ موجود ہوں۔“

قرآنِ مجید کی تلاوت کے وقت بالخصوص حکم فرمایا:

﴿فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ۝﴾ ④

---

① بخاری: 2038، مسلم: 2174 ② فصلت: 36

③ المؤمنون: 98,97 ④ النحل: 98

''پس جب تو قرآن پڑھے تو مردود شیطان سے اللہ کی پناہ طلب کر۔''

قرآن دل کی بیماریوں کی شفا ہے۔ اور شیطانی وساوس وشہوات کی دوا ہے۔ تلاوتِ قرآن سے پہلے استعاذہ کا حکم اس لیے کہ دل شیطانی وساوس سے اللہ کی پناہ میں آجائے اور قلبِ خالص اس دوائے شافی سے صحیح طور پر مستفید ہوسکے۔

یہ حکم اس لیے بھی ہے کہ جس طرح پودوں کی نشوونما پانی سے ہوتی ہے اسی طرح ایمان کی نشوونما اور تمام امورِ خیر کی بنیاد قرآنِ مجید سے ہے۔ شیطان نہیں چاہتا کہ قرآن کی بدولت دل میں ایمان اور عمل صالح کی بہار آئے وہ بہرصورت اس کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے تلاوت سے پہلے استعاذہ کا حکم ہے۔

قرآن پڑھتے ہوئے فرشتے قاریِ قرآن کے قریب آتے اور تلاوت سنتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت اسید رضی اللہ عنہ بن حضیر نے اپنا واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا کہ میں رات کو سورۂ بقرہ پڑھ رہا تھا، پاس ہی میرا گھوڑا بندھا ہوا تھا، اچانک وہ اچھلنے لگا۔ میں پڑھنے سے رک گیا تو وہ بھی ٹھہر گیا۔ میں پھر پڑھنے لگا تو گھوڑا پھر چکر لگانے لگا۔ میں پھر خاموش ہوگیا تو گھوڑا بھی کھڑا ہوگیا۔ میں پھر پڑھنے لگا تو گھوڑا پھر اچھلنے کودنے لگ گیا۔ پھر میں نے پڑھنا ختم کردیا۔ میرا بیٹا گھوڑے کے قریب سو رہا تھا مجھے ڈر ہوا کہ گھوڑے کے یوں اچھلنے کودنے سے اسے نقصان نہ پہنچے۔ اور جب میں اسے وہاں سے اٹھا کر دور کرنے لگا میں نے آسمان کی طرف سر اٹھایا تو دیکھتا ہوں کہ بادل کی مانند کوئی چیز ہے اور اس میں ایسے ہے جیسے چراغ روشن ہوں۔ آپ نے فرمایا: ''تم پڑھتے ہی رہتے، ابن حضیر تم پڑھتے ہی رہتے۔'' میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرا بیٹا بھی قریب ہی تھا مجھے خوف ہوا کہ وہ کہیں اسے کچل ہی نہ دے۔ اس لیے میں نے پڑھنا بند کردیا۔ آپ نے فرمایا:

((تِلْكَ الْمَلٰئِكَةُ دَنَتْ لِصَوْتِكَ وَلَوْ قَرَأْتَ لَأَصْبَحَتْ يَنْظُرُ النَّاسُ إِلَيْهَا))[1]

---

[1] بخاری: 5018، مسلم: 796

''یہ فرشتے تھے جو تیری تلاوت سننے کے لیے تیرے نزدیک آئے تھے اگر تو پڑھتا رہتا تو صبح کو لوگ انہیں دیکھ لیتے۔''

شیطان فرشتوں کی ضد اور ان کا دشمن ہے تلاوتِ قرآن کے وقت تعوذ کا حکم اس لیے بھی ہے کہ قاریِ قرآن سے شیطان دور رہے اور فرشتے اس کے پاس حاضر ہوں۔ نیز شیطان چوں کہ پوری کوشش کرتا ہے کہ تلاوت کرنے والے کو انہماک اور تدبر و تفکر سے روک دے اور تلاوت کے مقصد سے غافل کر دے تاکہ وہ اس سے صحیح فائدہ حاصل نہ کر سکے، یہ اور اسی نوعیت کے دیگر فوائد کی بنا پر تلاوت سے پہلے تعوذ کا حکم ہے۔ مزید تفصیل کے لیے اغاثۃ اللہفان [1] ملاحظہ فرمائیں۔

نماز میں بھی شیطان وسوسے ڈال کر نمازی کو نماز سے غافل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی لیے دعائے استفتاح کے بعد، قراءت سے پہلے تعوذ پڑھنا رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا۔ حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! شیطان میرے اور میری نماز و قراءت کے مابین حائل ہو جاتا ہے اور مجھ پر قراءت خلط ملط کر دیتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

ذَاكَ شَيْطَانٌ يُقَالُ لَهُ خِنْزَبٌ فَإِذَا أَحْسَسْتَهُ فَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْهُ وَ اتْفُلْ عَنْ يَسَارِكَ ثَلَاثًا، قَالَ: فَفَعَلْتُ ذٰلِكَ فَأَذْهَبَهُ اللّٰهُ عَنِّي. [2]

''یہ شیطان ہے جسے ''خنزب'' کہا جاتا ہے جب تم اسے محسوس کرو تو اس سے اللہ کی پناہ طلب کرو اور اپنی بائیں طرف تین مرتبہ تھوک لو۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے ایسے ہی کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو مجھ سے دور کر دیا۔''

شیطان اتنا دشمن ہے کہ انسان جب تھکا ماندہ رات کو سوتا ہے تو وہ پھر بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ خوفناک اور ناپسندیدہ خواب کے ذریعے سے اسے پریشان کرتا ہے۔ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا فرماتے تھے:

[1] اغاثۃ اللہفان: 1/109 [2] مسلم: 2203

”اچھے خواب من جانب اللہ ہوتے ہیں اور برے خواب شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں۔ جب کوئی ناپسندیدہ خواب دیکھے تو وہ بیدار ہوتے ہی تین بار تعوّذ پڑھے اور تین بار اپنی بائیں جانب پھونک مارے۔“[1]

ایک اور روایت میں ہے: ”کہ پھر وہ اپنا پہلو بدل لے، اس کا کسی سے ذکر نہ کرے، تو اس خواب سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔“

بلکہ شیطان کسی وقت بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اس کے پیدا ہوتے ہی اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَامِنْ بَنِیْ آدَمَ مَوْلُوْدٍ اِلَّا یَمَسُّهُ الشَّیْطَانُ حِیْنَ یُوْلَدُ فَیَسْتَهِلُّ صَارِخاً مِنْ مَّسِّ الشَّیْطَانِ غَیْرَ مَرْیَمَ وَابْنِهَا ثُمَّ یَقُوْلُ اَبُوْهُرَیْرَةَ ﴿وَاِنِّیْ اُعِیْذُهَابِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ﴾[2]

”آدم کی اولاد سے کوئی بچہ ایسا پیدا نہیں ہوتا جس کو پیدا ہوتے وقت شیطان نہ چھوئے، شیطان کے چھونے ہی سے وہ روتا ہے، مگر مریم علیہا السلام اور اس کے بیٹے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو شیطان نہ چھوسکا۔ یہ حدیث بیان کر کے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سورۂ آل عمران[3] کی یہ آیت پڑھتے تھے کہ (مریم علیہا السلام کی والدہ نے کہا:) میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔“

اسی لیے میاں بیوی کے ملاپ کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا پڑھنے کی تلقین فرمائی ہے۔

((بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّیْطَانَ مَارَزَقْتَنَا))[4]

”اللہ کے نام سے، اے اللہ! ہمیں شیطان سے بچا اور جو اولاد ہمیں عطا

[1] بخاری: 5748 [2] بخاری: 3431 و مسلم 2366

[3] آلِ عمران: 36 [4] بخاری: 3271 و مسلم

فرمائے (اسے بھی) شیطان سے بچائے رکھ۔"

آپ ﷺ نے فرمایا جو یہ دعا پڑھ لیتا ہے اور اس ملاپ سے اللہ اولاد عطا فرمادیتا ہے تو شیطان اسے نقصان نہیں پہنچاتا۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس دشمن کی دشمنی کا عالم کیا ہے۔ یہ دشمن ہر لحظہ اسی تاک میں رہتا ہے کہ انسان کو بہر نوع نقصان پہنچایا جائے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ الشَّيْطَانَ يَحْضُرُ اَحَدَكُمْ عِنْدَ كُلِّ شَيْءٍ مِنْ شَأْنِهِ، حَتّٰى يَحْضُرَهُ عِنْدَ طَعَامِهِ، فَإِذَا سَقَطَتْ مِنْ اَحَدِكُمُ اللُّقْمَةُ فَلْيُمِطْ مَا كَانَ بِهَا مِنْ أَذًى ثُمَّ لِيَأْكُلْهَا وَلَا يَدَعْهَا لِلشَّيْطَانِ)) [1]

"شیطان تمہارے ہر ایک کے ساتھ ہر کام کے وقت موجود ہوتا ہے حتی کہ اس کے کھانے کے وقت بھی۔ لہٰذا اگر کسی کا لقمہ گر جائے تو اسے مٹی وغیرہ سے صاف کرے پھر اسے کھا لے اور اسے شیطان کے لیے نہ چھوڑے۔"

یہ شیطان یوں ہر حال میں انسان کے درپے ہے اور ہر لحظہ اسے گمراہی میں مبتلا کرنے اور صراطِ مستقیم سے بھٹکانے میں کوشاں ہے اسی کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ یہ تمہارا دشمن ہے اسے اپنا دشمن ہی سمجھو اور کبھی اس سے خیر کی توقع نہ رکھو۔ اس سے ہمیشہ خبردار رہو وہ تو اسی کوشش میں ہے کہ

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

وہ چاہتا ہے کہ لوگ میرے ہمنوا بنیں میری پارٹی میں شامل ہو کر میرے ساتھ جہنم کا ایندھن بنیں۔

---

[1] مسلم: 2033

﴿اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ وَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ کَبِیْرٌ ۝﴾ (فاطر:۷)

''وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کیے ان کے لیے بڑی بخشش اور بہت بڑا اجر ہے۔''

اس آیت میں ''الغرور'' دھوکا باز کے دھوکا میں مبتلا ہو جانے والے کے حتمی انجام سے خبردار کیا گیا ہے۔ کہ قیامت کا انکار کرنے والے اور شیطان کے دھوکے میں مبتلا ہونے والے اس کے چیلے اور یہ کفار کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں یقیناً قیامت آئے گی اور وہ بہر نوع عذاب شدید میں مبتلا ہوں گے۔ کفار کے لیے آخرت میں عذاب کے بارے میں کہیں عذابِ الیم، کہیں عذابِ عظیم، کہیں عذابِ مہین، کہیں عذابِ غلیظ، کہیں عذاب سعیر، کہیں عذابِ حمیم، اور کہیں عذابِ شدید کے الفاظ ہیں۔ جہنم کا عذاب ان تمام صفات پر مشتمل ہے۔

''شدید'' کا مصدر ''شدّ'' ہے جس کے معنی ہیں مضبوط گرہ لگانا، باندھنا، کسنا۔ کفار کے لیے جہنم کا عذاب بایں معنی شدید ہے کہ انہیں زنجیروں میں مضبوطی سے باندھ دیا جائے گا۔ چناں چہ فرمایا:

﴿خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ ۝ ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُکُوْهُ ۝ اِنَّهٗ کَانَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِیْمِ﴾ [1]

''اسے پکڑو، پس اسے طوق پہنا دو۔ پھر اسے بھڑکتی ہوئی آگ میں

[1] الحاقة: 30-33

جھونک دو۔ پھر ایک زنجیر میں، جس کی پیمائش ستر ہاتھ ہے، اسے داخل کردو۔ بلاشبہ وہ بہت عظمت والے اللہ پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔"

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ستر ہاتھ سے مراد فرشتوں کے ہاتھ کا ناپ ہے۔ ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی کھوپڑی کے برابر شیشہ آسمان سے پھینکا جائے تو وہ ایک رات سے پہلے زمین پر آئے گا، اور اگر اسی کو جہنمیوں کے باندھنے کی زنجیر کے ایک سرے سے چھوڑا جائے تو دوسرے سرے تک پہنچنے میں چالیس سال لگ جائیں گے۔ ①

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔ جہنم میں کافر کا جسم دنیوی جسم کی مانند نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے جسم کا چمڑا ستر ہاتھ، اس کا دانت احد پہاڑ کی مانند اور اس کے ٹھہرنے کا دائرہ مدینۂ طیبہ سے ربذہ مقام تک ہوگا۔ ②

اور ایک روایت میں ہے کہ وہ بیٹھنے میں اتنی جگہ گھیرے گا جتنی تین دن کی مسافت تک ہو۔ ③

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس زنجیر کو اس کی دبر میں ڈال کر اس کی ناک سے نکالا جائے گا کہ کھڑا نہ ہو سکے۔ یہ ہوگی اس "عذابِ شدید" کی صورت، (اعاذنا اللہ منہ) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ﴾ ④ "بے شک تیرے رب کی پکڑ یقیناً بہت سخت ہے۔" ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ ۝ وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ﴾ ⑤ "پس اس دن اس کے عذاب جیسا عذاب کوئی نہیں کرے گا اور نہ اس کے باندھنے جیسا کوئی باندھے گا۔"

ان کے مقابلے میں جنہوں نے ایمان قبول کیا، شیطان کی پیروی کی بجائے نیک عمل کیے ان کے لیے بخشش ہے اور بہت بڑا اجر ہے۔ گویا ایمان کے نتیجہ میں مغفرت ہے کوئی مومن گناہ گار ہونے کے باوجود ہمیشہ کے لیے جہنم میں نہیں رہے

---

① مسند احمد، ترمذی: 2588 ② مسند احمد: 2/328 ③ مجمع الزوائد: 10/391 وغیرہ ④ البروج: 12 ⑤ الفجر: 25، 26

گا اس کے لیے بہرحال بخشش ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو بغیر کسی عذاب کے بھی بخش دے گا۔ بخشش اس کا مقدر ہے۔ اور عملِ صالح کے نتیجہ میں ''اجرِ کبیر'' ہے اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ جس قدر حسنات زیادہ ہوں گی اسی قدر اجر بھی زیادہ ہوگا۔ درجاتِ جنت انہی حسنات کی بنا پر ملیں گے۔

دوسرا یہ کہ ''اجرِ کبیر'' ان حسنات اور اعمالِ صالحہ کے برابر ہی نہیں ہوگا بلکہ بہت بڑا اجر ہوگا۔ جہنمیوں کو تو ان کے اعمال کے برابر سزا ملے گی جیسا کہ ان کے بارے میں فرمایا:

﴿جَزَآءً وِّفَاقًاؕ﴾ [1] ''پورا پورا بدلہ دینے کے لیے۔''

مگر جنتیوں کے بارے میں فرمایا:

﴿جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًاۙ﴾ [2]

''تیرے ربّ کی طرف سے بدلے میں ایسا عطیہ جو کافی ہوگا۔''

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَلَا یُجْزٰۤی اِلَّا مِثْلَهَا وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ﴾ [3]

''جو شخص نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لیے اس جیسی دس نیکیاں ہوں گی، اور جو کوئی برائی لے کر آئے گا اسے جزا نہیں دی جائے گی، مگر اسی کی مثل اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا ربّ عزوجل بڑا رحیم ہے۔ جو کوئی نیکی کا ارادہ کرتا ہے اس کی ایک نیکی لکھی جاتی ہے اگر نیت کے مطابق عمل کرے تو دس سے سات سو سے زائد نیکیاں لکھی جاتی ہیں

---

① النباء: 26 ② النباء: 36 ③ الانعام: 160

اور جو کوئی برائی کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے مطابق (اللہ سے ڈرتا ہوا) عمل نہیں کرتا تو اس کی ایک نیکی لکھی جاتی ہے اگر اس پر عمل کر لے تو ایک ہی گناہ لکھا جاتا ہے یا اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دیتا ہے۔①

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو ہر ماہ تین روزے رکھتا ہے وہ صائم الدہر ہے۔②

یہاں بھی تین روزے گویا پورے تیس روزے ہیں کہ ایک نیکی کا اجر دس نیکیاں ہیں۔ اس موضوع پر اور بھی بہت سی احادیث ہیں۔ نیکیوں میں یوں اضافہ اسی ''اجر عظیم'' کے تناظر میں ہے۔

① صحیح البخاری : 6491، مسلم: 131، شعب الایمان للبیھقی : 300/1، رقم : 334 واللفظ لہ

② مسند امام احمد : 34/5، 162 ترمذی: 762

﴿اَفَمَنۡ زُیِّنَ لَهٗ سُوۡٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا فَاِنَّ اللّٰهَ یُضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ فَلَا تَذۡهَبۡ نَفۡسُكَ عَلَیۡهِمۡ حَسَرٰتٍ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَصۡنَعُوۡنَ ۝﴾ (فاطر:۸)

”تو کیا وہ شخص جس کے لیے اس کا برا عمل مزین کر دیا گیا تو اس نے اسے اچھا سمجھا (اس شخص کی طرح جو ایسا نہیں؟) پس بے شک اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے، سو تیری جان ان پر حسرتوں کی وجہ سے نہ جاتی رہے، بے شک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔“

پہلی آیت میں شیطان کے پھندے میں پھنسنے والوں کے انجام سے خبردار کیا گیا ہے۔ اور ان کے مقابلے میں ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کرنے والوں کو بخشش ومغفرت کی بشارت ہے۔ اس آیت میں شیطان کے پھندے اور اس کی گمراہی میں مبتلا ہونے والوں کے اصل روگ کا بیان ہے کہ اس دشمن کے ہاتھ کیسے چڑھ جاتے ہیں اور اسی تناظر میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی بھی دی گئی ہے کہ اگر یہ دولتِ ایمان سے محروم ہیں تو اس میں آپ کی کوئی کوتاہی نہیں آپ خواہ مخواہ ان کے بارے میں پریشان نہ ہوں یہ اس قابل ہی نہیں کہ انہیں دولتِ ایمان حاصل ہو۔ چناں چہ فرمایا گیا:

﴿اَفَمَنۡ زُیِّنَ لَهٗ سُوۡٓءُ عَمَلِهٖ﴾ [1]

کیا وہ شخص جس کے لیے ان کا برا عمل مزین کر دیا گیا ہے اور وہ اسے برائی نہیں بلکہ اچھائی سمجھتا ہے۔ وہ کفر وعصیان کی راہ چھوڑ کر ایمان وعمل صالح کی راہ پر کیسے آ سکتا ہے۔

[1] فاطر: 8

یہ بھی شیطان کا دھوکا ہے کہ وہ ان کی برائی کو نیکی باور کرتا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے۔

﴿وَ اِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ﴾ ①

بُرے اعمال کو مزین کرنے کی بات تو اس نے روزِ اول سے کہہ رکھی ہے:

﴿قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ ②

''اس نے کہا: اے میرے رب! چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے، میں ضرور ہی ان کے لیے زمین میں مزین کروں گا اور ہر صورت ان کو گمراہ کردوں گا۔''

اور تو اور شیطان نے قتل اولاد کو بھی خوبصورت نام دے دیا چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ۝﴾ ③

''اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے اپنی اولاد کو مار ڈالنا ان کے شریکوں نے خوش نما بنا دیا ہے تاکہ وہ انہیں ہلاک کریں تاکہ وہ ان پر ان کا دین خلط ملط کریں اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے، پس چھوڑ انہیں اور جو وہ جھوٹ باندھتے ہیں۔''

شیطان نے جس طرح شرک کو ان کے لیے مزین کیا اسی طرح انہیں اپنی اولاد کو قتل کرنا بھی اچھا بنا دیا۔ لڑکیوں کو اپنے لیے عار سمجھ کر زندہ درگور کردیتے تھے اور بعض لڑکے لڑکیوں کو بھوک وافلاس سے بچنے کے لیے قتل کردیتے تھے۔ فرعون اپنی بادشاہت کی حفاظت میں بنی اسرائیل کے بچوں کو بے دریغ قتل کروا دیتا تھا۔ اس کے

① الانفال: 48 ② الحجر: 39 ③ الانعام: 137

باوجود سمجھتا تھا کہ یہ بہت اچھا ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ﴾ ①

''اسی طرح فرعون کے لیے اس کا برا عمل خوشنما بنا دیا گیا اور وہ سیدھی راہ سے روک دیا گیا اور فرعون کی تدبیر تباہی ہی میں تھی۔''

مشرکینِ مکہ اپنی مرضی سے حرمت والے مہینوں میں تبدیلی کا گھناؤنا جرم کرتے تھے مگر وہ یہی سمجھتے تھے کہ یہ بہت اچھا ہوا ہے۔ اسی حوالے سے فرمایا گیا ہے۔

﴿زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ ②

''ان کے برے اعمال ان کے لیے خوشنما بنا دیے گئے ہیں اور اللہ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

برائی کرنے والا اگر یہ سمجھ لے کہ یہ برا عمل ہے۔ کفر وشرک اور بدعات کو گمراہی تسلیم کرلے تو اسے سمجھانے سے سمجھ آجانے کی امید ہوتی ہے۔ لیکن جس کا ذہن ہی بگڑ گیا ہو۔ اور برے بھلے کی تمیز ہی ختم ہوگئی ہو اسے سمجھانے سے کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں ہی فرمایا گیا ہے:

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا﴾ ③

''کہہ دے، کیا ہم تمہیں وہ لوگ بتائیں جو اعمال میں سب سے زیادہ خسارے والے ہیں۔ وہ لوگ جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں ضائع ہوگئی اور وہ سمجھتے ہیں کہ بے شک وہ ایک اچھا کام کررہے ہیں۔''

ان کی ساری مساعی دنیا سنوارنے، دنیا کمانے اور بنانے میں صرف ہوگئی۔ اس

① المؤمن: 37 ② التوبة: 37 ③ الكهف: 104، 103

کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کررہے ہیں۔ برائی کو اچھا سمجھنے والوں سے ہدایت کی کوئی امید نہیں۔ آپ ان کی فکر میں اپنے آپ کو مشکل میں نہ ڈالیں۔ جو اس حد تک اپنے آپ کو بگاڑ لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے ہدایت کی توفیق ہی سلب کرلیتے ہیں۔

شیطان کفروشرک اور فسق وفجور کو ہی خوبصورت رنگ نہیں دیتا بلکہ نیکی کے نام سے بدعات کو بھی مزین بناتا اور رواج دیتا ہے۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ:((اَلْبِدْعَةُ اَحَبُّ اِلٰی اِبْلِیْسَ مِنَ الْمَعْصِیَةِ))[1] ''کہ شیطان کے نزدیک فسق وفجور اور گناہ سے بدعت زیادہ محبوب ہے۔'' کیونکہ انسان گناہوں سے تو پلٹ آتا ہے مگر بدعت کو نیکی سمجھ کر کرتا ہے۔ اس لیے اس سے بچنا اور اسے چھوڑ دینا نہایت مشکل ہے۔

اس آیت کا یہ مفہوم بھی بیان کیا گیا ہے کہ پہلی آیت میں کافر اور مومن کے مابین فرق بیان ہوا ہے کہ یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ پہلے کا مقدر عذابِ شدید ہے اور دوسرے کا مغفرت اور اجرِ کبیر ہے۔ اس آیت میں بھی اس فرق کو نمایاں کیا گیا ہے کہ کیا جس کے لیے اس کا برا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہے اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو برائی کو برائی سمجھتا ہے۔ قرآنِ مجید میں اس اسلوب کی بھی کئی مثالیں ہیں۔ چناں چہ ایک جگہ فرمایا:

﴿اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ۝﴾[2]

''کیا وہ شخص جو اپنے ربّ کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہے اس شخص کی طرح ہے جس کے لیے اس کے برے اعمال مزین کردیے گئے اور انہوں نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی؟''

ایک اور مقام پر فرمایا:

---

(1) تلبیس ابلیس: 20 (2) محمد: 14

﴿اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ ①

''پھر کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ بے شک جو کچھ تیرے ربّ کی جانب سے تیری طرف اتارا گیا وہی حق ہے اس شخص کی طرح ہے جو اندھا ہے؟ نصیحت تو عقلوں والے ہی قبول کرتے ہیں۔''

اس اسلوبِ بیان کی اور بھی کئی آیات ہیں۔ یوں یہاں ''مَنْ'' کی خبر محذوف ہے۔ اور وہ ہے ''کَمَنْ لَّمْ یُزَیَّنْ لَہٗ'' کہ جو برے عمل کو اچھا سمجھتا ہے اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو برے عمل کو برا ہی سمجھتا ہے اچھا نہیں سمجھتا۔ ایسے برے ذہن والے کو آپ ہدایت دینے والے بن سکتے ہیں؟ ہدایت دینا نہ دینا اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ چاہے تو ایسے گندے ذہن والے کو بھی ہدایت عطا فرما دے مگر اس کے ہاں ضابطہ یہ ہے کہ وہ ہدایت کے طلب گار کو ہدایت عطا فرماتا ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ ②

''وہ لوگ جنھوں نے ہمارے بارے میں پوری کوشش کی ہم ضرور ہی انھیں اپنے راستے دکھا دیں گے۔''

مگر ان کی عقل تو اس قدر ماؤف ہوگئی ہے کہ یہ برائی کو اچھائی خیال کرتے ہیں، بدتمیزی کو تہذیب سمجھتے ہیں۔ فسق وفجور کو ترقی اور ایمان وتقویٰ کو دقیانوسی خیال کرتے ہیں۔ ایسے قماش کے لوگوں کی ہدایت میں آپ گھلے جا رہے ہیں۔

﴿فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ﴾ آپ کی جان ان پر حسرتوں کی وجہ سے نہ جاتی رہے۔ ''حسرات'' حسرت کی جمع ہے جس کے معنی غم واندوہ اور پریشانی کے ہیں۔ ''حسرات'' جمع کے لفظ سے پتا چلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے قلبِ اطہر میں کتنا درد

① الرعد: 19 ② العنکبوت: 69

تھا اور منکرین کے بارے میں کتنی فکر مندی تھی کہ کاش یہ دولتِ ایمان سے بہرہ ور ہوجائیں، کاش یہ فسق وفجور کی زندگی ترک کردیں، کاش یہ کفر وشرک چھوڑ دیں، کہیں یہ جہنم کا ایندھن نہ بن جائیں۔ افسوس ہے کہ آپ ؐ کو صادق وامین مانتے ہوئے بھی ان کی تکذیب کرتے ہیں۔

قرآنِ مجید میں یہی بات آپ کی تسلی کے لیے کئی بار آئی ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝﴾ [1]

''پس شاید تم اپنی جان ان کے پیچھے غم سے ہلاک کر لینے والے ہیں، اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائیں۔''

ایک اور مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ [2]

''شاید تو اپنے آپ کو ہلاک کرنے والا ہے اس لیے کہ وہ مومن نہیں ہوتے۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝﴾ [3]

''بے شک ہم جانتے ہیں کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ یقیناً تمھیں وہ بات غمگین کرتی ہے جو وہ کہتے ہیں، بے شک وہ تجھے نہیں جھٹلاتے بلکہ وہ ظالم اللہ کی آیات ہی کا انکار کرتے ہیں۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ﴾ [4]

---

[1] الکہف: 6 [2] الشعراء: 3 [3] الانعام: 33 [4] المائدۃ: 41

''اے رسول! تجھے وہ لوگ غمگین نہ کریں جو کفر میں دوڑ کر جاتے ہیں۔''

یہی بات سورۂ آلِ عمران[1] میں بھی فرمائی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا وہ ایمان وعملِ صالح میں آگے بڑھتے مگر یہ الٹا کفر وعصیان میں دوڑے جارہے ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے بارے میں آپ غمزدہ نہ ہوں اور اپنے آپ کو ہلکان میں نہ ڈالو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ﴾ جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ خوب جانتا ہے۔ اس جملہ میں سرزنش اور شدید وعید ہے کہ یہ جو کرتوتیں کررہے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے خوب واقف ہے وہ ان سے وہی معاملہ کرے گا جس کے یہ سزاوار ہیں۔ سورۃ المجادلہ[2] میں ہے کہ: بے شک اللہ جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، کوئی تین آدمیوں کی کوئی سرگوشی نہیں مگر وہ ان کا چوتھا ہے اور نہ کوئی پانچ آدمیوں کی مگر وہ ان کا چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم اور نہ زیادہ، مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی وہ ہوں، پھر وہ انہیں قیامت کے دن بتائے گا جو کچھ انہوں نے کیا، یقیناً اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ اسی انداز کی بات سورۃ الانعام[3] میں فرمائی ہے۔ جس میں یہ تنبیہ ہے کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ ان کے تمام کرتوتوں کو ان کے سامنے لائیں گے کہ وہ یہ اور یہ کرتے رہے ہیں اور آج ان کی خبر لیں گے۔

:: :: ::

① آل عمران: 176 ② سورة المجادله : 7 ③ سورة الانعام : 159

﴿وَ اللّٰهُ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۝﴾ (فاطر:۹)

''اور اللہ ہی ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا، پھر وہ بادل کو ابھارتی ہیں، پھر ہم اسے ایک مردہ شہر کی طرف ہانک کر لے جاتے ہیں، پھر ہم اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیتے ہیں، اسی طرح اٹھایا جانا ہے۔''

پہلے آیت نمبر ۵ سے قیامت کے حق و سچ ہونے اور شیطان کے دھوکا سے بچنے کا ذکر تھا۔ مگر اس سے خبردار کرنے کے باوجود بہت سے لوگ اس کے پھندے میں پھنس گئے اور کفر و عصیان میں اتنے مگن ہو گئے کہ اسی کو انھوں نے خوبی سمجھ لیا۔ انہی کے بارے میں سابقہ آیت میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ آپ ان کے غم میں پریشان نہ ہوں جو وہ کر رہے ہیں ہم اس سے خوب واقف ہیں، ہم ان سے نپٹ لیں گے۔

اس آیت میں شیطان کے ہاتھوں کھلونا بننے والوں کے اس شبہ کا جواب ہے جو وہ کہتے تھے کہ قیامت قائم نہیں ہوگی۔ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو پھر کیسے جی اٹھیں گے۔ چناں چہ اسی غلط فہمی کے ازالہ کے لیے فرمایا کہ اس کو ناممکن مت سمجھو۔ دوبارہ زندہ کرنا اللہ کے لیے کوئی مشکل نہیں۔ تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ ہی ہواؤں کو بھیجتا ہے ان کے ذریعے سے بادلوں کو ابھارتا اور جمع کرتا ہے۔ پھر انہیں مردہ اور بنجر زمین کی طرف لے جاتا ہے۔ بارش برستی ہے تو مردہ زمین لہلہا اٹھتی ہے۔ مدت سے اس کی تہ میں پڑے ہوئے بیج سے کونپلیں نکل آتی ہیں۔ جس طرح اللہ کے حکم سے مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے اسی طرح اس کے حکم سے قیامت کے روز بھی تمہیں زندگی ملے گی۔ یہی استدلال ایک اور مقام پر یوں ہوا ہے۔

﴿وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبَارَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّ حَبَّ الْحَصِيْدِ ۝ وَ النَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۝ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَ اَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝﴾ [1]

''اور ہم نے آسمان سے ایک بہت بابرکت پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ساتھ باغات اور کاٹی جانے والی کھیتی کے دانے اگائے، اور کھجوروں کے لمبے لمبے درخت، جن کے تہ بہ تہ خوشے ہیں، بندوں کو روزی دینے کے لیے اور ہم نے اس کے ساتھ ایک مردہ شہر کو زندہ کر دیا، اسی طرح (قبروں سے) نکلنا ہے۔''

جس طرح پانی سے ہم نے مردہ زمین کو زندگی بخشی ہے۔ اسی طرح انسان جہاں بھی دفن ہے قیامت کے دن ہمارے حکم سے جی اٹھے گا۔ حیات بعد الممات پر یہ استدلال ذرا تفصیل سے سورۃ الحج [2] میں بھی ہوا ہے۔ اور احادیثِ مبارکہ میں اس کی ضروری تفصیل آئی ہے۔

چناں چہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَيْسَ مِنَ الْاِنْسَانِ شَيْءٌ اِلَّا يَبْلٰى اِلَّا عَظْماً وَاحِداً وَهُوَ عَجْبُ الذَّنْبِ وَمِنْهُ يُرَكَّبُ الْخَلْقُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) [3]

''ایک ہڈی کے بغیر انسان کے تمام اجزا بوسیدہ ہو جائیں گے، اور وہ ریڑھ کی باریک ہڈی ہے اس سے انسان قیامت کے دن کھڑے ہوں گے۔''

ابویعلی، حاکم اور امام ابوداود نے ''کتاب البعث'' میں حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا وہ ''عجب الذنب'' کیا ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] ق: 9-11 [2] سورة الحج: 5-7 [3] بخاری: 4935، مسلم، ابن ماجه وغيره

((مِثْلُ حَبَّةِ خَرْدَلٍ وَمِنْهُ تُنْشَأُوْنَ))[1]

''رائی کے دانہ کے برابر اور اسی سے تمہیں اٹھایا جائے گا۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے علامہ ابن عقیل رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ ''عجب الذنب'' کو محفوظ رکھنے اور اس سے دوبارہ پیدا کرنے کا راز اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہے کیوں کہ جو عدم سے وجود میں لاتا ہے وہ کسی ایسی چیز کا محتاج نہیں جس پر اس کی بنیاد ہو۔ البتہ یہ احتمال ہے کہ ہر انسان کو اس کے جواہر سے پیدا کرنے کے لیے یہ فرشتوں کے لیے بطورِ علامت ہو۔ اور فرشتوں کو اس کا علم ہر انسان کی اسی ہڈی کی بنا پر ہوگا اور وہ پہچان سکیں کہ اس جز میں فلاں کی روح داخل کرنی ہے۔ اگر انسان کی کوئی چیز بھی باقی نہ رکھی جاتی تو فرشتے سمجھتے کہ اعادۂ روح بعینہٖ اس کے جسم میں نہیں بلکہ مثالی اجساد میں ہے۔[2]

اس حدیث میں اجساد کے بوسیدہ ہونے کا جو ذکر ہے اس عام حکم سے دیگر احادیث کی بنا پر انبیائے کرام علیہم السلام کے اجسادِ مطہرہ مستثنیٰ ہیں۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے علاوہ شہداء اور دیگر صلحاء میں سے بھی جن کے اجساد اللہ تعالیٰ چاہیں محفوظ رکھنے پر قادر ہیں۔

حضرت لقیط بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: كَيْفَ يُحْيِي الْمَوْتٰى مردوں کو کیسے زندہ کیا جائے گا۔ اس کی کوئی مثال دنیا میں ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((أَمَا مَرَرْتَ بِوَادٍ مِنْ أَهْلِكَ مَحْلًا ؟ قَالَ: بَلٰى. قَالَ: ثُمَّ مَرَرْتَ بِهِ يَهْتَزُّ خَضِرًا؟ قَالَ: بَلٰى. قَالَ ثُمَّ : مَرَرْتَ بِهِ مَحْلًا قَالَ بَلٰى قَالَ: فَكَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَذٰلِكَ آيَتُهُ فِي خَلْقِهِ))[3]

---

[1] فتح الباری: 552/8، التذکرہ للقرطبی: 201

[2] فتح الباری: 553/8 [3] مسند احمد: 12,11/4

''کیا تم اپنی کسی وادی میں سے گزرے ہو جو غیر آباد اور ویران ہو؟ عرض کیا: جی ہاں، گزرا ہوں۔ فرمایا: پھر کبھی وہاں سے گزرے ہو کہ وہ سرسبزی وشادابی سے لہلہا اٹھی ہے؟ عرض کیا: جی ہاں۔ فرمایا: پھر تم وہاں سے گزرے ہو کہ وہ ویران ہو گئی ہو عرض کیا: جی ہاں، فرمایا: اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرے گا اور یہ اس کی مخلوق میں (زندگی بعد الموت کی) نشانی ہے۔''

بعض احادیث میں ہے کہ جب تمام جاندار قیامت آنے پر ختم ہو جائیں گے تو پھر اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے نیچے سے بارش برسائیں گے۔ جسے ''ماء الحیاۃ'' کا نام دیا گیا ہے۔ یہ بارش برستی رہے گی تمام زمین پر بارہ ہاتھ تک پانی ہوگا۔ پھر دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو تمام اجساد جو ریڑھ کی ہڈی کی صورت میں محفوظ تھے اس سے تمام کا وجود بنے گا اور تمام ارواح اپنے اپنے اجساد میں لوٹ جائیں گے۔ ان روایات وآثار کو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے النہایہ [1] میں اور علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے التذکرہ [2] میں نقل کیا ہے۔ بارش برسنے کا ذکر صحیح بخاری [3] میں بھی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیثِ شفاعت میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرمائیں گے کہ جو لا الٰہ الا اللہ کہتا تھا اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتا تھا، اسے جہنم سے نکال لاؤ، چناں چہ وہ جہنم میں سے انہیں سجدہ کے اثر سے پہچانیں گے، جہنم کی آگ نے انہیں جلا دیا ہوگا، مگر پیشانی بچی ہوئی ہوگی۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے جہنم پر سجدہ کی جگہ کو جلانا حرام کر دیا ہے، جہنم سے وہ نکالے جائیں گے، ان پر ''ماء الحیاۃ'' ڈالا جائے گا تو وہ دوبارہ صحیح ہو جائیں گے۔ [4]

لہٰذا جس طرح مردہ زمین پانی کی برکت سے آباد وشاداب ہوتی ہے۔ اسی طرح پانی برسنے سے ہی مردوں کو زندگی ملے گی اور پانی ہی کی بدولت جہنم کے جلے ہوؤں کو تروتازگی حاصل ہوگی، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

① النهايه: 193,189/1 ② التذكره: 227,221 ③ بخاري: 4935 ④ مسلم: 182

﴿وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ ①

''اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز بنائی۔''

لہٰذا آخرت میں زندگی اسی طرح ہے جیسے مردہ زمین کی حیات ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ 'کذلك النشور' میں مشابہت کئی اعتبار سے ہے۔

۱: زمین کو جس طرح زندگی ملتی ہے اسی طرح اعضائے انسانی کو زندگی ملے گی۔

۲: جس طرح ہوا سے بادلوں کو جمع کیا جاتا ہے اسی طرح بکھرے ہوئے اعضاء کو جمع کیا جائے گا۔

۳: جس طرح ہوا اور بادل کو ارضِ میت کی طرف لے جایا جاتا ہے اسی طرح ارواح کو مردوں کے ابدان کی طرف لے جایا جائے گا۔

''النشور'': یہ ''نشر'' سے ہے جس کے معنی کسی چیز کو پھیلانے کے ہیں اور یہ صحیفے کے پھیلانے، بارش اور نعمت کے عام کرنے اور کسی بات کے مشہور کر دینے پر بولا جاتا ہے۔ ②

مرنے والے بھی قبروں سے اٹھ کر میدانِ محشر میں پھیل جائیں گے اس لیے آخرت میں ازسرِ نو زندگی پر ''نشور'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ دن کے بارے میں بھی فرمایا ہے:

﴿وَّ جَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا﴾ ③

''اور دن کو اٹھ کھڑا ہونا بنایا۔''

کیوں کہ دن کو کاروبار کے پھیلانے اور روزی کمانے کے لیے بنایا ہے۔

:: :: ::

① الانبیاء: 30 ② المفردات ③ الفرقان: 47

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ وَ الَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَ مَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ﴾ (فاطر:۱۰)

"جو شخص عزت چاہتا ہے سو عزت سب اللہ ہی کے لیے ہے۔ اسی کی طرف ہر پاکیزہ بات چڑھتی ہے اور نیک عمل اسے بلند کرتا ہے اور جو لوگ برائیوں کی خفیہ تدبیر کرتے ہیں ان کے لیے بہت سخت عذاب ہے اور ان کی خفیہ تدبیر ہی برباد ہوگی۔"

یہ آیت بھی پہلی آیات کے تناظر میں ہے جن میں مختلف انداز میں توحید اور قیامت کا ذکر ہے۔ مشرکینِ قریش سمجھتے تھے کہ اللہ نے ہمیں عزت دے رکھی ہے، حرمِ کعبہ کی تولیت کا اعزاز ہمیں حاصل ہے، اور سارے عرب میں ہماری عزت بنی ہوئی ہے۔ مال واولاد کی نعمتوں سے ہمیں اللہ نے سرفراز فرمایا ہے۔ اور جن معبودوں کی ہم عبادت کرتے ہیں ان کے طفیل ہمیں اللہ کا قرب حاصل ہے:

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ ①

"ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کردیں۔"

اور یہ بھی کہتے تھے کہ:

"ہمارے یہ معبود اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔" ②

وہ سمجھتے تھے کہ یہ ساری عزتیں انہی کی عبادت کے نتیجہ میں حاصل ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ ارشاد فرمایا:

① الزمر: 3 ② یونس: 18

﴿وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ۝ كَلَّا
سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَ يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا﴾ [1]

''اور انہوں نے اللہ کے سوا اور معبود بنا لیے، تاکہ وہ ان کے لیے باعثِ عزت ہوں۔ ہرگز ایسا نہ ہوگا، عنقریب وہ ان کی عبادت کا انکار کردیں گے اور ان کے خلاف مدِ مقابل ہوں گے۔''

وہ سمجھتے تھے کہ وقتاً فوقتاً انہی کی بدولت ہماری مدد ہورہی ہے۔ اگر اللہ کی طرف سے گرفت ہوئی تو یہ چھڑوا لیں گے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ لَا
يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ وَ هُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ۝﴾ [2]

''اور انہوں نے اللہ کے سوا کئی معبود بنا لیے، تاکہ ان کی مدد کی جائے، وہ ان کی کوئی مدد نہیں کرسکتے اور یہ ان کے لشکر ہیں جو حاضر کیے ہوئے ہیں۔''

انہوں نے کیا چھڑوانا ہے بلکہ ان کے بشمول لشکر کی صورت میں اللہ کے حضور حاضر ہوں گے۔ پھر فیصلہ اللہ کا ہوگا کہ یہ کس سزا کے مستحق ہیں۔

وہ یہی سمجھتے تھے کہ یہ ساری عزت ہمیں ان معبودوں کی عبادت سے حاصل ہیں۔ اگر ہم ان کی عبادت چھوڑ دیں اور محمد ﷺ کی بات تسلیم کرلیں تو ہماری یہ عزت اور سیادت خاک میں مل جائے گی۔ سارا عرب ہمارا مخالف ہو جائے گا چنانچہ سورۃ القصص [3] میں ہے:

''اور انھوں نے کہا: اگر ہم تیرے ہمراہ اس ہدایت کی پیروی کریں تو ہم اپنی زمین سے اُچک لیے جائیں گے۔'' (اللہ تعالیٰ نے فرمایا:) ''کیا ہم نے انھیں باامن حرم میں جگہ نہیں دی یہ امن واطمینان اور عزت ہماری طرف سے ہے۔''

ان کی اسی غلط فہمی کا جواب اس آیت میں بھی دیا گیا ہے کہ ﴿لِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا﴾ ''سو عزت سب اللہ ہی کے لیے ہے'' تمھارے معبود تمھیں عزت نہیں

---

[1] مریم: 82,81 [2] یٰس: 75,74 [3] القصص: 57

دیتے۔اللہ جسے چاہتا ہے عزت عطا کرتا ہے۔

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ؗ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۝﴾ ①

''کہہ دے: اے اللہ! بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے بادشاہی دیتا ہے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لیتا ہے اور جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کر دیتا ہے، تیرے ہی ہاتھ میں ہر بھلائی ہے، بے شک تو ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔''

اور عزت اسی مالک کی بندگی میں ہے اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی میں عزت ہے نہ آخرت میں کامیابی۔اللہ کے ہاں وہی عزت پاتا ہے جو اطاعت گزار ہے۔

﴿وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۝﴾ ②

''حالاں کہ عزت تو صرف اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے ہے لیکن منافق نہیں جانتے۔''

اس لیے جو عزت چاہتا ہے وہ اللہ کا عبادت گزار اور وفا شعار بنے، اسی کی بندگی میں عزت ہے اللہ کے علاوہ دوسروں کی عبادت میں اور اللہ کی نافرمانی میں کوئی عزت نہیں۔اللہ نے تو حضرتِ انسان کو مسجودِ ملائکہ کا شرف بخشا ہے اب اس الٹی گنگا میں کیا عزت ہے کہ انھی ملائکہ کے اور اپنے جیسے بندوں، بلکہ دیگر مخلوق جو خود انسان کی مخدوم ہے اور اس کے فائدہ کے لیے بنائی گئی ہے، کے سامنے وہ سجدہ ریز ہو جائے ؎

① آلِ عمران : 26 ② المنفقون : 8

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے ، نہ من تیرا نہ تن

جس طرح کفارِ مکہ اپنے معبودوں کے ہو رہنے میں اپنی عزت سمجھتے تھے۔ اسی طرح منافقین مومنوں کی بجائے کفار سے دوستی اور موالات میں اپنی عزت سمجھتے تھے۔ ان کے بارے میں بھی ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِينَ يَتَّخِذُونَ الْكٰفِرِينَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝﴾ ①

''اور جو کافروں کو مومنوں کے سوا دوست بناتے ہیں، کیا وہ ان کے پاس عزت ڈھونڈتے ہیں؟ بے شک عزت تو سب اللہ کے لیے ہے۔''

کافروں اور منافقوں کے مابین یہی قدر مشترک ہے کہ دونوں اللہ سے نہیں بلکہ اللہ کے سوا کسی اور سے عزت کے طلب گار ہیں۔ اسی لیے فرمایا:

﴿سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ ②

''پاک ہے تیرا ربّ، عزت کا ربّ، ان باتوں سے جو وہ بیان کرتے ہیں۔ اور سلام ان پر جو بھیجے گئے اور سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا ربّ ہے۔''

اللہ ہی سب عزت واقتدار کا مالک ہے۔ اور ان تمام باتوں سے ارفع اور تمام کمزوریوں سے پاک ہے جو یہ مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اللہ کے رسولوں پر سلام ہو جنھوں نے اس راہِ حق کی راہنمائی کی، اللہ ہی کے لیے حمد وثنا ہے جو تمام جہانوں کا ربّ ہے۔

① النساء: 139 ② الصّٰفّٰت: 180-182

﴿اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ﴾ یہ ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے عزت پانے کا اصل ذریعہ، کہ اللہ کی طرف بلند ہونے والا کلمہ، کلمۂ طیبہ یعنی کلمۂ ایمان اور کلمۂ توحید ہے۔ جس کی شہادت مسلمان دیتا ہے۔ اس کلمہ کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ كَیْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَیِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِیْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا﴾ [1]

"کیا تو نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے ایک پاکیزہ کلمہ کی مثال کیسے بیان فرمائی (کہ وہ) ایک پاکیزہ درخت کی طرح (ہے) جس کی جڑ مضبوط ہے اور جس کی چوٹی آسمان میں ہے، وہ اپنا پھل اپنے ربّ کے حکم سے ہر وقت دیتا ہے۔"

گویا ایمان کا یہ شجرۂ طیبہ سدا بہار ہے۔ ہر لحظہ اس سے اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کے پھول کھلتے اور پھل ملتے رہتے ہیں۔ مضبوط درخت، مضبوط جڑ، مضبوط تنا اور بلند وبالا ہری بھری ٹہنیوں کا نام شجرۃ طیبہ ہے۔ اسی طرح ایمان بھی معرفتِ قلب، اقرارلسان اور اعمالِ حسنہ کا نام ہے۔ درخت کی جڑ جتنی گہری ہو اتنا ہی وہ مضبوط، اسی طرح ایمان جس قدر مضبوط ہوگا پائے استقلال میں جنبش نہیں آئے گی۔ ہر قسم کے مصائب وآلام کے طوفان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے، شرک وبدعت کے جھاڑ جھنکاڑ سے وہ متاثر نہیں ہوگا۔ ہمیشہ پھل دار درخت کی طرح اس کے اعمالِ صالحہ میں انقطاع نہیں، بلکہ تسلسل اور مداومت ہوگی۔ درخت کے پھلوں سے انسان مستفید ہوتے ہیں تو اس شجرۂ طیبہ کے مصداق مومن کے اخلاق وکردار سے بھی انسان متاثر ہوتے ہیں۔ اور اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَیَدِهٖ، اور خَیْرُ النَّاسِ اَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ کے مطابق لوگ اس سے نفع پاتے ہیں۔ پھر یہ سب بہار اللہ کی توفیق اور اس کے لطف وکرم سے ہے۔ یہ کسی کے ذاتی کمال کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ

[1] ابراھیم: 25،24

'بِاِذْنِ رَبِّهَا' اس کے ربّ کے حکم سے ہے۔

اس آیتِ مبارکہ میں بھی ایمان کو کلمۂ طیبہ کہا گیا ہے۔ ''طیب'' کے معنی ایسی پاکیزہ چیز کے ہیں جس سے انسان کے حواس بھی لذت یاب ہوں اور نفس بھی۔ ①

کلمۂ توحید سے بھی عقلِ سلیم لذت محسوس کرتی ہے اور ایک اللہ کا ہو رہنے میں سرشاری نصیب ہوتی ہے۔

غرور انھیں ہے تو مجھ کو بھی ناز ہے اکبر
سوا خدا کے سب ان کا اور خدا میرا

وہ پکار اٹھتا ہے: ''تم کٹتے ہو کٹ جاؤ روٹھتے ہو روٹھ جاؤ۔'' ﴿حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ إِلٰـهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ﴾ ② ''مجھے اللہ ہی کافی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور وہی عرشِ عظیم کا رب ہے۔''

اس پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں، پھر بھی احد، احد پکارتا ہے۔ حدیث میں بھی اسے ایمان کے ذائقہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چناں چہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ذَاقَ طَعْمَ الْاِيْمَانِ مَنْ رَّضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ نَّبِيًّا.)) ③

''اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا جو راضی ہوا اللہ سے کہ وہ میرا ربّ ہے، اسلام سے کہ وہ میرا دین ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ وہ میرے نبی ہیں۔''

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ، اَنْ يَّكُوْنَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَأَنْ يُّحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ، وَأَنْ يَكْرَهَ أَنْ يَّعُوْدَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ.)) ④

① المفردات ② توبہ: 129 ③ مسلم: 34 ④ بخاری: 16

’’تین چیزیں جس میں ہیں اس نے ایمان کی مٹھاس پالی، (۱) یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہوں، (۲) یہ کہ وہ کسی سے محبت کرے تو اللہ کے لیے محبت کرے، (اس میں اپنے نفس کا کوئی شائبہ نہ ہو) (۳) یہ کہ وہ ناپسند جانے کہ میں پھر کفر کی راہ پر چل نکلوں، جیسا کہ وہ ناپسند کرتا ہے کہ اسے آگ میں پھینک دیا جائے۔‘‘

اسی حلاوتِ ایمان اور ایمان کے ذائقہ کو ’’طیب‘‘ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ کلمہ طیبہ، اللہ کی طرف صعود کرتا ہے اور یہی اللہ کے قرب کا اوّل ذریعہ ہے۔ اس کلمہ کو ’اَلْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ‘ عمل صالح بلند کرتا ہے۔ یہی تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن بصری، مجاہد، سعید بن جبیر اور جمہور مفسرین رحمہم اللہ سے منقول ہے کہ کلمۂ ایمان کو جو چیز رفعت بخشتی ہے وہ عملِ صالح ہے۔ حتی کہ حضرت حسن اور قتادہ تو فرماتے ہیں: ’لَا یُقْبَلُ قَوْلٌ اِلَّا بِعَمَلٍ‘ کہ قول یعنی کلمہ، عمل کے بغیر مقبول نہیں، قاضی ایاس بن معاویہ بھی فرماتے ہیں: عمل نہیں تو ذکر اوپر نہیں لے جایا جاتا۔[1]

ایمان قول و عمل کا نام ہے اور عمل سے عملِ قلب و جوارح، دونوں مراد ہیں اسی لیے سلف کے نزدیک ایمان تصدیقِ قلب، اقرارِ لسان اور عمل بالجوارح کا نام ہے۔ اور عمل کے لیے قلب میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت بھی شامل ہے۔ ایمان کا مرکز دل ہے، زبان دل کی ترجمان ہے، اور زبان کی سچائی کا علم عمل سے ہوتا ہے کہ اپنے قول میں پختہ ہے یا زبانی جمع خرچ ہے۔ ’وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ‘ سے واضح ہوتا ہے اعمالِ صالحہ، ایمان کو کمال بخشتے ہیں اور اسے رفعت اور بلندی سے سرفراز کرتے ہیں۔ ان کے بغیر ایمان ناقص اور ادھورا ہے۔ اور اسی کو سلف نے ’اَلْاِیْمَانُ یَزِیْدُ وَیَنْقُصُ‘ سے تعبیر کیا ہے۔ ایمان میں اضافہ کا سبب آیات اللہ پر غور وتدبر بھی ہے، اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت میں اضافہ سے بھی اور اعمال پر مداومت سے بھی۔ وَفَّقَنَا اللّٰهُ لِمَا یُحِبُّ وَیَرْضٰی!

[1] ابن کثیر: 725/3

یہ کلمۂ طیبہ، اللہ کی طرف صعود کرتا ہے اور یہی اللہ کے قرب کا اوّل ذریعہ ہے۔ کلمہ اپنے متکلم سے ہے، اس کا اپنا وجود نہیں، اس لیے صعود کا مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے مراد اللہ کے ہاں قبولیت اور پزیرائی ہے یا یہ کہ اس سے مراد کراماً کاتبین کے صحائف ہیں جو وہ اوپر لے جاتے ہیں۔ مگر صحیح یہ ہے کہ فرشتے ان کلمات کو اوپر لے جاتے اور عرشِ الٰہی کے قریب پہنچا دیتے ہیں۔ جیسا کہ بعض روایات میں ذکر ہے۔ انہی روایات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے ''کلمۂ طیبہ'' سے مراد تسبیح وتحمید وتہلیل بھی ہے دعا اور تلاوتِ قرآن کو بھی بعض نے کلمۂ طیبہ قرار دیا۔

اسی کلمۂ توحید، ذکر واذکار کو اَلْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ عمل صالح بلند کرتا ہے یہی تفسیر جمہور مفسرین سے منقول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی منقول ہے کہ ''الکلم الطیب'' سے مراد ذکر اللہ ہے اور ''العمل الصالح'' سے مراد فرائض ہیں۔ جو شخص فرائض کے ساتھ اللہ کا ذکر کرتا ہے اس کا عمل اس کے ذکر کو اللہ کی طرف بلند کرتا ہے اور جو اللہ کا ذکر کرتا ہے مگر فرائض ادا نہیں کرتا اس کا کلام اس کے عمل پر لوٹا دیا جاتا ہے۔[1]

یعنی جو فرض نمازوں کی پابندی نہیں کرتا اس کا محض ذکر بلندیوں سے ہمکنار نہیں ہوتا۔ بلندی تبھی میسر آتی ہے جب ذکر کے ساتھ فرائض کا بھی اہتمام ہو۔ جس طرح عمل کی قبولیت کے درجات ہیں اسی طرح ذکر اور اعمالِ صالح کے اوپر جانے کے بھی درجات سمجھنے چاہییں۔ مگر علامہ ابن عطیہ نے فرمایا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کی سند صحیح نہیں۔ اہلِ حق اہلِ سنت کا موقف اسے ردّ کرتا ہے، کیونکہ صحیح یہ ہے کہ فاسق جو فرائض کا تارک ہے۔ وہ ذکر کرتا ہے تو اس کا عمل لکھا جائے گا۔ اس کا اسے اجر وثواب ملے گا، اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کے ذکر واذکار اور کلمات طیبات کو قبول کرتا ہے، جو شرک سے اجتناب کرتا ہے۔[2]

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے بھی علامہ ابن عطیہ رحمہ اللہ کی تائید کی ہے۔ حالاں کہ یہاں مسئلہ اجر وثواب کے ملنے کا نہیں بلکہ ذکر اور اعمالِ صالحہ کے اوپر چڑھنے اور

---

[1] ابن کثیر: 725/3 [2] المحرر الوجیز

اللہ کے حضور پیش ہونے کا ہے۔ کچھ اعمال ایسے ہیں کہ ان کے کرنے والوں پر سکینت نازل ہوتی ہے، رحمت انھیں ڈھانپ لیتی ہے، فرشتے انھیں گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر فرشتوں کے سامنے کرتے ہیں اور جہاں تک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کی سند کا معاملہ ہے تو اسے ضعیف کہنے کی کوئی معقول وجہ سامنے نہیں آئی۔ ہم نے اس کے ایک ایک راوی کو پرکھا اور جانچا ہے۔ اس کی سند حسن درجہ سے کم نہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم جو احادیث تمھیں بیان کرتے ہیں۔ تمھیں ان کی تصدیق ہم کتاب اللہ سے کروا دیتے ہیں۔

بندۂ مسلم جب 'سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ اَكْبَرُ تَبَارَكَ اللّٰهُ' پڑھتا ہے تو ان کلمات کو فرشتہ اپنے پروں کے نیچے لے کر آسمان پر چڑھ جاتا ہے، فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے گزرتا ہے وہ ان کلمات کو کہنے والے کے لیے بخشش و مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ کلمات اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور پیش کیے جاتے ہیں۔ پھر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہی آیت ﴿اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ﴾ تلاوت فرمائی۔[1]

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو لوگ اللہ کے جلال، اس کی تسبیح، اس کی حمد، اس کی وحدانیت کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے یہ کلمات عرش کے اردگرد طواف کرتے ہیں اور ان کی بھنبھناہٹ شہد کی مکھیوں کی طرح ہوتی ہے اور یہ کلمات کہنے والوں کا ذکر اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے کرتے ہیں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ کوئی نہ کوئی تمھارا ذکر تمھارے ربّ کے سامنے کرتا رہے۔[2]

بعض حضرات نے ''یرفعہ'' کی ضمیر فاعل ﴿اَلْكَلِمُ الطَّیِّبُ﴾ کو بنایا ہے اور مراد کلمۂ ایمان وکلمۂ توحید لیا ہے، کہ ایمان ہو تو یہ عملِ صالح کو اوپر لے جاتا ہے ورنہ

---

① ابن جریر: 22، حاکم :425/2، وقال صحیح الاسناد ② مسند امام احمد : 271/4، ابن ماجہ: 3809، حاکم :503,500/1

اعمال برباد ہوجاتے ہیں۔ بعض نے یَرْفَعُہٗ کی ضمیر فاعل اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائی ہے۔ اللہ تعالیٰ اعمال کو بلندی عطا فرماتا ہے اور بعض نے یہ بھی کہا ہے یہ ضمیر عمل صالح کی طرف لوٹتی ہے، کہ نیک اعمال عمل کرنے والے کو عزت اور بلندی دیتے ہیں۔ یہاں ان تمام معانی کی گنجائش ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی عزت اور بلندی عطا فرمانے والے ہیں۔ کلمۂ طیبہ اور عملِ صالح کو ہی اللہ کے ہاں پذیرائی حاصل ہے اور اس کا اہتمام کرنے والے ہی لائقِ عز و شرف ہیں اور یہ ہے اصل عزت، اور یہ حاصل ہوتی ہے ایمان اور عملِ صالح سے، یا ذکر واذکار اور اعمالِ صالحہ سے، یوں عمل سے عمل قلبی ایمان، اللہ کی محبت اور عمل بدنی دونوں مراد ہیں۔

قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر ایمان اور عمل صالح کا ذکر لازم وملزوم کی حیثیت سے ہوا ہے۔ جس میں اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ عمل کے بغیر تنہا ایمان سے ہمیشہ کے عذاب سے تو وہ بچ جائے گا مگر مکمل مقبولیت اور کامل نجات ایمان اور عمل صالح کی بدولت ہی حاصل ہوگی اور اگر کوئی اعمالِ صالحہ تو کرتا ہے مگر دولتِ ایمان سے محروم ہے تو آخرت میں اس کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور عملِ صالح بھی کرتا ہے مگر اس کے ساتھ غیر اللہ کی عبادت، ان کی نذر ومنت بھی پوری کرتا ہے تو اس کا یہ طرزِ عمل اس کی تکذیب کرتا ہے، بلکہ اس کا ایمان ''کلمۂ طیبہ'' نہیں، ایمان کے لیے ''اخلاص'' شرط ہے اور ایسے شخص کا ایمان اس سے تہی دامن ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ﴾ [1]

''اور انہیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اس حال میں کہ اس کے لیے دین کو خالص کرنے والے، ایک طرف ہونے والے ہوں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں یہی مضبوط ملت کا دین ہے۔''

[1] البینۃ : 5

اسی طرف اس آیت میں بھی اشارہ ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾ ①

''پس جو شخص اپنے ربّ کی ملاقات کی امید رکھتا ہو تو لازم ہے کہ وہ عمل کرے، نیک عمل اور اپنے ربّ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔''

لٰہذا جو اللہ سے ملاقات کا متمنی ہے وہ ایسے اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرے کہ ان میں کسی کی شراکت نہ ہو، نہ اپنے نفس کی نہ ہی کسی اور کی، بلکہ وہ خالص اللہ ہی کے لیے کرے۔ حدیث میں بھی اس کی وضاحت ہے۔ چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصاً دَخَلَ الْجَنَّةَ' ②

''جو لا الٰہ الا اللہ خالص ہو کر کہے گا جنت جائے گا۔''

یہی کلمۂ اخلاص، کلمۂ طیبہ ہے۔

﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ اس کی طرف ہر پاکیزہ بات چڑھتی ہے۔

کہ کلمہ طیبہ اور تسبیحات اللہ تعالیٰ کی طرف بلند ہوتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں سے اوپر عرش پر مستوی ہے۔ ہر جگہ موجود نہیں جیسا کہ عموماً صوفیا کا موقف ہے جو بالکل غلط ہے۔ قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا مذکور ہے اور استوی یا مستوی ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہے۔ یہی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعین عظام، ائمہ، فقہائے اربعہ اور محدثینِ کرام رحمۃ اللہ علیہم کا موقف ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول ہے جب ان سے پوچھا گیا کہ ''استوی'' کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا: اس کا مفہوم معلوم ہے اس کی کیفیت مجہول اور اس کے بارے میں

---

① الکھف : 110 ② البزار

سوال کرنا بدعت ہے پھر انھوں نے سائل کو مجلس سے نکل جانے کا حکم فرمایا۔ امام فخر الدین رازی المتوفی 606ھ نے فلسفہ وکلام کی وادیوں میں سرگرداں ہونے کے بعد بالآخر فرمایا: میں نے کلام کے تمام طرق اور فلسفہ کے تمام مناہج دیکھے میں نے نہیں دیکھا کہ ان سے کسی بیمار کو شفا ہوئی ہو یا کسی پیاسے کو سیرابی حاصل ہوئی ہو۔ میں نے سب سے قریب ترین راستہ قرآنِ پاک کا دیکھا ہے میں اللہ کی صفت کے بارے میں پڑھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہیں۔ ﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ اسی کی طرف کلمات صعود کرتے ہیں۔ اور نفی میں پڑھتا ہوں کہ اس جیسا کوئی نہیں ہے۔ ’لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ مَنْ جَرَّبَ مِثْلَ تَجْرِبَتِيْ عَرَفَ مِثْلَ مَعْرِفَتِيْ‘‘ ’’جو میری طرح تجربہ کرے گا اسے میری طرح معرفت حاصل ہو جائے گی۔‘‘[1]

قرآن مجید کی بہت سی آیات اس مسئلہ میں وارد ہیں انھی میں ایک یہ آیت بھی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت عُلُوّ ہے وہ آسمانوں سے اوپر عرش پر اپنی شایانِ شان ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور علم ہر جگہ پر ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ ایمان اور عملِ صالح کا اہتمام کرنے والوں کے مقابلے میں وہ بھی ہیں جو برائیوں کی خفیہ تدبیر کرتے ہیں، یعنی کلمۂ حق کو نیچا دکھانے کے لیے اور رسول اللہ ﷺ کو پریشان کرنے کے لیے جو خفیہ تدبیریں اور مکر وفریب کے جال بنتے ہیں۔ انھیں عزت کیا ملے گی ان کے لیے تو عذابِ شدید ہے۔ مشرکین کی انھی خفیہ تدبیروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ وَ يَمْكُرُوْنَ وَ يَمْكُرُ اللّٰهُ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۝﴾[2]

’’اور جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، تیرے خلاف خفیہ تدبیر کر رہے تھے تا کہ تجھے قید کر دیں، یا تجھے قتل کر دیں، یا تجھے نکال دیں اور وہ خفیہ تدبیر کر رہے تھے اور اللہ بھی خفیہ تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب خفیہ تدبیر

[1] السیر: 501/21 [2] الانفال: 30

کرنے والوں سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔"

ہجرت سے پہلے کفار نے دارالندوہ میں انہی خفیہ تدبیروں پر غور وفکر کیا اور بالآخر ابوجہل نے مشورہ دیا کہ تمام قبائل سے ایک ایک نوجوان لیا جائے، انہیں تلواریں تھما دی جائیں، یکبارگی سب حملہ کر کے محمد ﷺ کا کام تمام کر دیں۔ یہ بنو ہاشم کس کس قبیلے سے لڑیں گے۔ اس کی تحسین وتائید ہوئی، مگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ ﷺ کو مکۂ مکرمہ چھوڑنے کا حکم فرمایا۔ آپ ﷺ نے اپنے بستر مبارک پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رات سونے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ گھر سے سورۂ یٰسٓ پڑھتے ہوئے نکلے اور مٹھی خاک کی ان کے سروں پر اچھالی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ آپ ﷺ صحیح سالم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مدینہ تشریف لے گئے۔ اس نوعیت کی خفیہ تدبیریں دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کے خلاف بھی ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی محفوظ رکھا اور رسول اللہ ﷺ کو بھی۔

خفیہ تدبیروں کے تحت ہی آپ ﷺ کو کاہن، جادوگر، شاعر، مجنون کہا گیا، آپ ﷺ کے ساتھیوں سے غنڈہ گردی کی گئی، آپ ﷺ قرآن سنائیں تو شور وغوغا کا آرڈر چلنے لگا اور باقاعدہ فنونِ لطیفہ کا محاذ نضر بن حارث نے کھولا۔ یوں ان کے رات دن انہی منفی سرگرمیوں میں بسر ہوتے تھے۔ انہی کو خبردار کیا گیا ہے کہ ان کے لیے عذابِ شدید ہے اور ان کے تمام مکر اور تدبیریں نیست ونابود ہو جائیں گی۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو کامیابیوں سے سرفراز فرمایا اور ان رؤسائے قریش کو قلیبِ بدر میں نشانِ عبرت بنا دیا۔

:::::::

﴿وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمۡ اَزۡوَاجًا وَّ مَا تَحۡمِلُ مِنۡ اُنۡثٰی وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلۡمِهٖ وَ مَا یُعَمَّرُ مِنۡ مُّعَمَّرٍ وَّ لَا یُنۡقَصُ مِنۡ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیۡرٌ ○﴾ (فاطر: ۱۱)

''اور اللہ ہی نے تمہیں تھوڑی سی مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک قطرے سے، پھر اس نے تمہیں جوڑے بنا دیا اور کوئی مادہ نہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ بچہ جنتی ہے مگر اس کے علم سے، اور نہ کسی عمر پانے والے کی عمر بڑھائی جاتی ہے اور نہ اس کی عمر میں کمی کی جاتی ہے مگر ایک کتاب میں (درج) ہے، بلاشبہ یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔''

پہلی آیات میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی توحید پر آفاقی دلائل کا ذکر ہوا ہے کہ وہ آسمانوں اور زمین کو بنانے والا ہے، فرشتوں کو اس نے پیدا کیا ہے، سب کو رزق دینے والا وہی ہے، اللہ ہی ہواؤں کا چلانے والا اور بارش برسانے والا ہے۔ ضمناً رسول اللہ ﷺ کو تسلی اور منکرین کے بارے میں وعید اور ماننے والوں کے لیے بشارت کا ذکر ہوا ہے۔ اب یہاں سے اللہ کی وحدانیت پر انفسی دلائل کا ذکر ہے۔

چناں چہ فرمایا: اللہ وہ ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر ایک قطرے سے، پھر اس نے تمہیں جوڑے بنا دیا۔ مٹی سے حضرت آدم علیہ السلام کا بنانا مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ○ وَ الۡجَآنَّ خَلَقۡنٰهُ مِنۡ قَبۡلُ مِنۡ نَّارِ السَّمُوۡمِ ○ وَ اِذۡ قَالَ رَبُّكَ

لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ [1]

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے انسان کو ایک بجنے والی مٹی سے پیدا کیا، جو بدبودار سیاہ کیچڑ سے تھی۔ اور جنوں کو اس سے پہلے لُو کی آگ سے پیدا کیا، اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا بے شک میں ایک بشر کو ایک بجنے والی مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں، جو بدبودار سیاہ کیچڑ سے ہوگی۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ''صلصال'' کے معنی خشک مٹی کے کیے ہیں۔ اسی کو ایک اور مقام پر ٹھیکری کی طرح بننے والی مٹی فرمایا ہے:

﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ [2]

''اس نے انسان بجنے والی مٹی سے پیدا کیا جو ٹھیکری کی طرح تھی۔''

''حَمَأ'' سیاہ کیچڑ کو کہتے ہیں۔ یعنی سیاہ کیچڑ جس کے اندر خمیر کی مانند بو پیدا ہوگئی ہو۔ اس گوندھی ہوئی مٹی سے انسان کا وجود بنایا گیا۔ جب وہ خشک ٹھیکری کی مانند ہوگیا تو اس میں روح پھونکی گئی۔ یوں ایک جیتا جاگتا انسان بن گیا۔ اور یہی مٹی گوشت پوست، ہڈیوں اور اعصاب وعضلات میں تبدیل ہوگئی۔ اسے دیکھنے، سننے اور عقل وشعور سے بھی نواز دیا گیا۔ یوں نہیں کہ اس نے کسی حیوان سے ترقی کرتے ہوئے انسان کا روپ دھار لیا ہے۔ حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ

'خُلِقَتِ الْمَلَآئِكَةُ مِنْ نُّوْرٍ، وَخُلِقَتِ الْجَانُّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ، وَخُلِقَ آدَمُ مِمَّا وُصِفَ لَكُمْ' [3]

''فرشتوں کو نور سے پیدا کیا گیا ہے اور جنوں کو آگ کے شعلے سے اور آدم کو پیدا کیا گیا ہے اس سے جس سے تمہیں آگاہ کردیا گیا ہے۔''

---

[1] الحجر: 26-28 [2] الرحمن: 14

[3] مسلم، الصحیحہ: 459

آدم علیہ السلام کے بعد ان کی اولاد کو ''نطفہ'' یعنی تھوڑے سے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَهٗ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِيۡنٍۚ﴾ ①

''پھر اس کی نسل ایک حقیر پانی کے خلاصے سے بنائی۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿فَلۡيَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ مِمَّ خُلِقَؕ خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍۙ يَّخۡرُجُ مِنۡۢ بَيۡنِ الصُّلۡبِ وَ التَّرَآئِبِؕ﴾ ②

''پس انسان کو لازم ہے کہ دیکھے وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے، جو پیٹھ اور (سینے کی) پسلیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔''

یعنی مرد کی پشت سے اور عورت کے سینے سے پانی نکلتا ہے اور یہ شکمِ مادر میں باہم مل جاتے ہیں اسی سے انسان پیدا ہوتا ہے۔

﴿ثُمَّ جَعَلَكُمۡ اَزۡوَاجًا﴾ پھر اس نے تمھیں جوڑے بنایا۔ یعنی اسی پانی سے مرد اور عورت بنائے اور ان کے باہمی جوڑے جوڑ دیے۔ جیسے سورۂ روم میں فرمایا:

﴿وَ مِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنۡ خَلَقَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡكُنُوۡۤا اِلَيۡهَا وَ جَعَلَ بَيۡنَكُمۡ مَّوَدَّةً وَّ رَحۡمَةً ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ﴾ ③

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھارے لیے تمھی سے بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم ان کی طرف (جا کر) آرام پاؤ اور اس نے تمھارے درمیان دوستی اور مہربانی رکھ دی، بے شک اس میں ان لوگوں

① السجدة : 8 ② الطارق : 5-7 ③ الروم : 21

کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو غور کرتے ہیں۔"

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّ نِسَآءً ۚ﴾ ①

"اے لوگو! اپنے ربّ سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کی بیوی پیدا کی اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔"

﴿وَ مَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰی﴾ اور کوئی مادہ نہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ بچہ جنتی ہے مگر اس کے علم میں ہے۔ جیسے ایک جان سے عورت اور ان دونوں سے ایک کنبہ اللہ ہی نے بنایا ہے۔ اسی طرح وہ جانتا ہے کون سی عورت کب حاملہ ہوئی، اس کے پیٹ میں کیا ہے، وہ کب جنے گی اور کس شکل وصورت میں جنے گی۔

﴿اَللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰی وَ مَا تَغِیْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ وَ كُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ۝﴾ ②

"اللہ جانتا ہے جو ہر مادہ اٹھائے ہوئے ہے اور جو کچھ رحم کم کرتے ہیں اور جو زیادہ کرتے ہیں اور ہر ایک چیز اس کے ہاں ایک اندازے سے ہے۔"

اللہ جانتا ہے کہ مادہ کے رحم میں کیا ہے؟ نر یا مادہ، خوبصورت ہے یا بدصورت، سعادت مند ہے یا بدبخت، اس کی عمر کتنی ہے۔ اس کے بارے میں یہ ساری معلومات صرف اللہ کے پاس ہیں۔ رحمِ مادر میں بچے کی لحہ بہ لحہ بتدریج نشوونما کے بارے میں بھی اسی کو علم ہے۔ اور وہی جانتا ہے کہ اس کی مدتِ حمل کتنی ہے۔ یہ چھ ماہ میں پیدا ہوگا

① النساء: 1 ② الرعد: 8

یا سات میں یا نو ماہ میں یا دس ماہ میں۔ مدتِ حمل کی اس کمی بیشی کو وہی جانتا ہے۔ حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ جو بسا اوقات دو سال سے بھی زیادہ ہوجاتی ہے۔ امام ضحاک بن مخلد دو سال بعد پیدا ہوئے اور ان کے دو دانت نکلے ہوئے تھے۔ ①

امام محمد بن عجلان رحمۃ اللہ علیہ تیسرے سال پیدا ہوئے تو دانت نکلے ہوئے تھے بلکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ ایک عورت کے ہاں تین بچے بارہ سالوں میں پیدا ہوئے اور ہر حمل چار سال کا ہوتا تھا۔ ②

﴿وَ مَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ﴾ اور نہ کسی عمر پانے والے کی عمر بڑھائی جاتی ہے اور نہ اس کی عمر کم کی جاتی ہے مگر ایک کتاب میں درج ہے۔ یعنی نوعِ انسانی میں سے جس کی عمر طویل ہوتی ہے یا کم، وہ لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اور جمہور مفسرین نے یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ یہاں 'اِلَّا فِيْ كِتَابٍ' پہلے جملے میں 'اِلَّا بِعِلْمِهٖ' کے قائم مقام ہے۔ کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے بلکہ ہر چیز پہلے سے لوحِ محفوظ میں درج کر دی گئی ہے۔

﴿وَ لَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖ﴾ سے مراد ''عمرِ معمَّر'' ہے کہ کسی عمر پانے والے کی عمر کم نہیں ہوتی، یوں نہیں کہ اس کی عمر زیادہ تھی جسے کم کر دیا جاتا ہے۔ بلکہ ابتداءً جس کی عمر لمبی تھی یا ابتداءً جس کی عمر کم تھی اس کا فیصلہ لوحِ محفوظ میں کر دیا گیا ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ہر ایک کی عمر کتنے سال، کتنے ماہ، کتنے دن اور کتنے گھنٹے اور کتنے منٹ ہے، لکھی جاتی ہے اور ﴿وَ لَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖ﴾ کا مفہوم ہے کہ عمر کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا جاتا ہے کہ اس کی عمر سے ایک گھنٹا کم ہوگیا، ایک دن، ایک ماہ، ایک سال کم ہوگیا۔ یوں وہ اپنی اجلِ مسمیٰ کو پہنچ جاتا ہے۔ یہی قول ابو مالک اور حسان بن عطیہ وغیرہ سے بھی منقول ہے۔ شاعر نے اسی مفہوم میں کہا ہے:

①ابن کثیر: 551/2 ② السیر: 319,318/6

حَيَاتُكَ اَنْفَاسٌ تُعَدُّ فَكُلَّمَا
مَضٰى نَفَسٌ مِنْهَا انْتَقَصَتْ بِهٖ جُزْءٌ[1]

"تیری زندگی چند گنے ہوئے سانسوں کا نام ہے، جب بھی ایک سانس گزرتا ہے تیری عمر کا ایک حصہ کم ہو جاتا ہے۔"

بعض نے کہا ہے: "معمر" سے مراد ساٹھ سال عمر ہے اور اس میں کمی سے مراد ساٹھ سال سے پہلے فوت ہو جانا ہے۔ ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جو انسان نیکی کرے گا اس کی عمر بڑھا دی جائے گی اور جو نافرمانی کرے گا اس کی عمر کم کر دی جائے گی۔ چناں چہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يُبْسَطَ فِيْ رِزْقِهٖ اَوْ يُنْسَاَ لَهٗ فِيْ اَثَرِهٖ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ'[2]

"جو چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں اضافہ ہو یا اس کی عمر زیادہ کر دی جائے تو اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔"

اسی مفہوم کی ایک حدیث حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'لَا يَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ، وَلَا يَزِيْدُ فِي الْعُمُرِ اِلَّا الْبِرُّ'[3]

"قضا وقدر کو دعا بدل دیتی ہے اور نیکی سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے۔"

امام ترمذی نے اسے حسن غریب کہا ہے۔ مگر اس کا ایک راوی فضہ ابو مودود ہے جسے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "لَيِّنٌ" کہا ہے۔[4]

علامہ طحاوی رحمہ اللہ علیہ مشکل الآثار[5] میں کہا ہے کہ ابو مودود عبدالعزیز بن ابی سلیمان ثقہ راوی ہے۔ مگر یہ ان کا وہم ہے۔ صحیح یہی ہے کہ وہ فضہ بصری ہے جیسا کہ امام

---

(1) روح المعانی (2) بخاری: 2067 وغیرہ (3) ترمذی: 2139
(4) تقریب: 276 (5) مشکل الآثار: 3068

ترمذی نے فرمایا ہے اور علامہ المزی نے اسی کی تائید کی ہے۔ اس لیے یہ حدیث ضعیف ہے مگر اس کی تائید حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے ہوتی ہے:

((اِنَّ الرَّجُلَ لَيُحْرِمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ يُصِيْبُهُ، وَلَا يَرُدُّ الْقَدَرَ اِلَّا الدُّعَاءُ، وَلَا يَزِيْدُ فِي الْعُمْرِ اِلَّا الْبِرُّ)) [1]

”آدمی اپنے گناہ سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے، تقدیر کو دعا بدل دیتی ہے اور نیکی عمر میں اضافہ کرتی ہے۔“

یعنی اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ فلاں صلہ رحمی کرے گا تو اس کے رزق میں اضافہ ہوگا اور نیکی کرے گا تو اس کی عمر میں اضافہ ہوگا۔ دعا کرے گا تو اس کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ یہ سب لوحِ محفوظ میں محفوظ ہے۔

بعض علماء نے تو کہا ہے کہ عمر اور رزق میں اضافے کا مفہوم یہ ہے کہ ان میں اللہ کی طرف سے برکت ہوتی ہے۔ تھوڑا رزق بھی کافی ہو جاتا ہے اور جسم میں قوت وطاقت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے اضافے سے مراد اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے ذکرِ خیر کا جاری رہنا ہے۔ [2]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسی ضمن میں ابن ابی حاتم سے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ کسی نفس کو مہلت نہیں دیتا جب اس کی موت کا وقت آ جاتا ہے۔ زیادتِ عمر سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے نیک اولاد عطا فرما دیتا ہے اور وہ اس کے بعد اس کے لیے دعائیں کرتی ہے اور اس کی دعائیں اس کو قبر میں ملتی رہتی ہیں، اس طرح اس کی عمر میں اضافہ ہوتا ہے۔“ [3] یعنی مرنے کے بعد بھی صالح اولاد کی دعاؤں سے وہ فائدہ پہنچتا رہتا ہے جو اسے زندہ رہنے سے حاصل ہونا تھا۔

---

[1] نسائی، ابن ماجہ، الصحیحۃ: 154 [2] فتح الباری: 302/4

[3] ابن کثیر: 766/3

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بچہ چالیس دن تک رحمِ مادر میں نطفہ، پھر چالیس دن جما ہوا خون، پھر چالیس دن تک بوٹی کی صورت میں رہتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو چار باتوں کا حکم دے کر بھیجتے ہیں کہ اس کا رزق، اس کی موت کا وقت، اس کا شقی اور اس کا سعید ہونا لکھ دو۔ ①

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: 'جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا اَنْتَ لَاقٍ۔' ''جو کچھ تمہیں ملنے والا ہے اس کو لکھ کر قلمِ تقدیر خشک ہو چکا ہے۔''

اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی اس میں بھی آپ نے فرمایا:

'رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ وَ جَفَّتِ الصُّحُفُ' ②

''قلمیں اٹھالی گئیں اور صحیفے خشک ہو گئے۔''

ان احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کی موت وحیات، اس کا رزق، اس کا شقی اور سعید ہونا لکھا جا چکا ہے۔ اس آیت میں بھی اسی بات کا اظہار ہے کہ کسی کی عمر لمبی ہوتی ہے یا تھوڑی ہوتی ہے سب کتاب میں محفوظ ہے۔ اور اس میں یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ وہ نیکی کرے گا تو اس کی عمر میں اضافہ ہوگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایمان والوں کے لیے بخشش ومغفرت لکھ دی گئی اور اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرنے والوں کے لیے درجات کی بلندی لکھ دی گئی ہے۔

﴿اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ یہ سب معاملات اور ان کا فیصلہ اللہ کے لیے آسان ہے۔ نہ صرف انسان بلکہ تمام مخلوقات سے متعلقہ تمام جزئیات تک کا اسے علم ہے اور تمام معلومات لوحِ محفوظ میں محفوظ ہیں۔

﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَ

① بخاری: 6594، مسلم: 2643 ② ترمذی: 2516 وغیرہ

الْبَحْرِ ؕ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ○ ﴾[1]

''اور اسی کے پاس غیب کی چابیاں ہیں، انہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور سمندر میں ہے اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اسے جانتا ہے اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ نہیں اور نہ کوئی تر ہے اور نہ خشک مگر وہ ایک واضح کتاب میں ہے۔''

وہی اکیلا اپنی ساری مخلوق کی جزئیات سے باخبر ہے۔ اور اس کے لیے انہیں جاننا اور کتاب مبین میں محفوظ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

اس آیتِ مبارکہ میں، جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی توحید پر انفسی دلیل بیان ہوئی ہے کہ اللہ ہی تمہیں پیدا کرنے والا اور وہی اولاد دینے والا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں موت وحیات ہے جس قدر چاہتا ہے کسی کو عمر عطا کرتا ہے۔ اس میں اللہ کے علاوہ کسی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ایک انسان سے انسان کا کنبہ اللہ نے بنایا ہے، اس میں تو تمہارے کسی معبود کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اور اللہ کے لیے یہ سب کچھ آسان ہے۔ یوں نہیں کہ تمہارے معبودوں کو اللہ نے اپنا معاون بنایا ہے یا اپنے کسی معاملے میں انہیں شریک کیا ہے، جیسا کہ تم یہ سمجھ کر ان کی عبادت کرتے اور ان کی نذریں اور منتیں مانتے ہو۔

---

[1] الانعام: 59

﴿وَ مَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَ مِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَ تَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ (فاطر:١٢)

''اور دو سمندر برابر نہیں ہوتے، یہ میٹھا پیاس بجھانے والا ہے، جس کا پانی آسانی سے گلے سے اترنے والا ہے۔ اور یہ نمکین ہے کڑوا، اور ہر ایک میں سے تم تازہ گوشت کھاتے ہو اور زینت کا سامان نکالتے ہو جو تم پہنتے ہو اور تو اس میں کشتیوں کو دیکھتا ہے جو پانی کو چیرتی ہوئی چلنے والی ہیں، تاکہ تم اس کے فضل میں سے (حصہ) تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔''

اس آیتِ کریمہ میں بھی دلیلِ آفاقی سے اللہ تعالیٰ کی توحید پر استدلال ہے کہ دو سمندر ہیں ایک میٹھا اور دوسرا کڑوا و نمکین۔ پانی ایک ہے مگر محض اللہ کے حکم سے ایک میٹھا ہے اور دوسرا کڑوا۔ جس طرح مرد و عورت کا نطفہ اللہ کے حکم سے بیٹا یا بیٹی کی صورت دھار لیتا ہے۔ یہاں بھی یہ تفریق اللہ کے حکم سے ہے اس میں کسی دیوی یا دیوتا کا یا کسی فرشتے کا کوئی عمل دخل نہیں۔

البحران: ''بحر'' کا تثنیہ ہے اور ''بحر'' دراصل اس وسیع مقام کو کہتے ہیں جہاں کثرت سے پانی جمع ہو۔ اور کبھی کسی چیز پر ظاہری وسعت کے اعتبار سے بطورِ تشبیہ ''بحر'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چناں چہ بہت زیادہ دوڑنے والے گھوڑے کو ''بحر'' کہہ دیا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کہ مدینۂ طیبہ میں دشمن کے حملے کا خوف پھیل گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے گھوڑا طلب کیا جس کا نام ''المندوب'' تھا۔ آپ تن تنہا اس پر سوار ہو کر نکلے۔ واپس پلٹے تو فرمایا

(فکر مندی کی ضرورت نہیں) میں نے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا، البتہ اس گھوڑے کو میں نے ''بحر'' پایا ہے 'وَجَدْنَاهُ بَحْرًا'[1]

اسی طرح کسی کی وسعتِ علم کی بنا پر اسے ''البحر'' کہا جاتا ہے۔ بعض ائمۂ کرام کے بارے میں بَحْرٌ لَا سَاحِلَ لَهٗ کا جملہ وسعتِ علمی کے تناظر میں ہے۔ اسی طرح تَبَحَّرَ فِیْ کَذَا کے معنی ہیں کہ اس نے فلاں فن میں وسعت حاصل کر لی ہے۔

''عَذْبٌ'' کے معنی میٹھا اور خوشگوار ہیں۔ ''فُرَاتٌ'' کے معنی ہیں نہایت شیریں، پیاس بجھانے والا پانی۔ اور ''سَائِغٌ'' کا مادہ س و غ ہے جس کے معنی ہیں آسانی سے گلے سے اتر جانے والا۔ میٹھے پانی کی طرح دودھ کے بارے میں بھی فرمایا ہے:

﴿وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ۝﴾[2]

''اور بلاشبہ تمہارے لیے چوپاؤں میں یقیناً عبرت ہے، ہم ان چیزوں میں سے جو ان کے پیٹوں میں ہیں، گوبر اور خون کے درمیان سے تمہیں خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے حلق سے آسانی سے اتر جانے والا ہے۔''

نہ اس میں گوبر کی بو نہ ہی خون کی رنگت، خالص سفید دودھ کہ اس میں پانی کی کثرت بھی اس کی سفیدی کو زائل نہیں کرتی۔ ''سبحان اللہ'' ......

کھانا کھانے کے بعد کی دعاؤں میں ایک دعا ہے:

'اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَ وَسَقٰی وَسَوَّغَهٗ وَجَعَلَ لَهٗ مَخْرَجًا'[3]

''سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے کھلایا اور پلایا اور حلق سے بہ سہولت اتارا اور اس کے (فضلے کے) لیے نکلنے کا راستہ بنایا۔''

جہنمیوں کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---
[1] بخاری: 2627، مسلم: 2307 [2] النحل: 66 [3] ابوداود: 3851 وغیرہ

﴿وَ يُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ○ يَّتَجَرَّعُهٗ وَ لَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ ﴾ ①

''اور اسے اس پانی سے پلایا جائے گا جو پیپ ہے، وہ اسے بمشکل گھونٹ گھونٹ پیے گا اور قریب نہ ہوگا کہ اسے حلق سے اتارے۔'' (اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ)

یہاں بھی یُسِیْغُہٗ، اسی ''س و غ'' سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے، باب اِفْعَال ہے۔

مِلْحٌ اُجَاجٌ: ''ملح'' کے معنی نمکین اور کھارا پانی کے ہیں۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے ''ملح'' وہ پانی ہے جو کسی آمیزش کے بغیر نمکین ہو اور ''مالح'' اس پانی کو کہتے ہیں جس میں نمک ڈال کر نمکین بنایا گیا ہو۔ لیکن ''ماء مالح'' بہت کم استعمال ہوتا ہے جیسا کہ علامہ راغب نے کہا ہے۔ ''اجاج'' کے معنی سخت کھاری اور گرم پانی کے ہیں۔ ②

اس آیت میں سمندروں کے میٹھے اور بہت کھاری اور نمکین پانیوں کا ذکر ہے۔ مگر دوسرے مقام پر اسی حقیقت کو ایک اور اسلوب میں بیان فرمایا گیا ہے:

﴿وَ هُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَ جَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ○﴾ ③

''اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا دیا، یہ میٹھا ہے پیاس بجھانے والا اور یہ نمکین ہے کڑوا، اور اس نے ان دونوں کے درمیان ایک پردہ اور مضبوط آڑ بنا دی ہے۔''

اسی کا بیان سورۃ الرحمٰن میں یوں ہے:

﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ○ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ○﴾ ④

''اس نے دو سمندروں کو ملا دیا، جو اس حال میں مل رہے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان ایک پردہ ہے جس سے وہ آگے نہیں جاتے۔''

① ابراھیم: 16,17 ② مفردات ③ الفرقان: 53 ④ الرحمٰن: 21,20

میٹھے اور نمکین سمندروں میں بھی پانی کی یہ صورت رونما ہوتی ہے جہاں کوئی بڑا دریا سمندر میں آ کر گرتا ہے، وہاں دور تک دریا کا میٹھا پانی سمندر کے کھارے پانی سے نہیں ملتا۔ اسی طرح سمندر میں جب مدوجزر ہوتا ہے تو مد کے وقت اس کا کھارا پانی قریب کی ندیوں میں آ چڑھتا ہے اور جزر کے وقت اوپر کا کھاری پانی اتر جاتا ہے اور میٹھا جوں کا توں نیچے رہتا ہے۔ بلکہ سمندر میں بھی بعض ایسے مقامات ہیں جہاں میٹھے پانی کے چشمے پائے جاتے ہیں۔ ''مرآۃ الممالک'' کے ترکی مصنف امیر البحر سیّدی علی رئیس نے ذکر کیا ہے کہ خلیجِ فارس میں آبِ شور کے نیچے آبِ شیریں کے چشمے ہیں جن سے میں اپنے بیڑے کے لیے پینے کا پانی حاصل کرتا رہا ہوں۔ بلکہ امریکن کمپنی نے سعودیہ عربیہ میں تیل نکالنے کا کام شروع کیا تو ابتدا میں وہ بھی خلیجِ فارس کے انہی چشموں سے پانی حاصل کرتی تھی۔ ①

بیان القرآن میں دو بنگالی علماء کی شہادت نقل ہے کہ ''ارکان'' سے ''چاٹگام'' تک دو دریا نظر آتے ہیں۔ ایک کا پانی سفید ہے اور دوسرے کا سیاہ۔ سیاہ میں سمندر کی طرح تلاطم وتموج ہوتا ہے اور سفید ساکن رہتا ہے۔ کشتی سفید میں چلتی ہے اور دونوں کے درمیان ایک دھاری برابر چلی گئی ہے جو دونوں کے ملنے میں رکاوٹ ہے۔ ان میں سفید میٹھا اور سیاہ کڑوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اس قدرت کا مشاہدہ جب ایک فرانسی ماہر بحریات ''جیکو یاوس کاسٹیو'' (Jico Yawas Kastav) نے کیا اور قرآن مجید میں سورۃ الرحمٰن کی آیات اس کے سامنے آئیں تو اس نے بلاتکلف اللہ ذوالجلال والاکرام کی کبریائی کا اعلان کیا اور مسلمان ہو گیا۔ ②

سمندروں کے علاوہ زمین کی تہہ میں بھی پانی کے جو خزانے ہیں ان میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ بعض مقامات پر میٹھا اور اس کے قریب ہی کڑوا اور نمکین

---

① تفہیم القرآن

② مزید تفصیل کے لیے تفسیر عثمانی، تفہیم القرآن اور اضواء البیان میں سورۃ الفرقان کی آیت ۵۳ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

پانی ہوتا ہے۔ اور یہ بھی دونوں باہم خلط ملط نہیں ہوتے، دونوں کے مابین برزخ کی صورت یہاں بھی محسوس ہوتی ہے۔

﴿وَ مِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا﴾ اور ان دونوں سے یعنی میٹھے اور دریائے شور سے تمھیں تازہ گوشت کھانے کو ملتا ہے یعنی آبی جانوروں کا گوشت۔ بحری سفر میں جہاں گوشت حاصل کرنا ناممکن ہوتا ہے وہاں بھی تمھارے لیے یہ انتظام اللہ نے کر رکھا ہے۔

اس کے علاوہ تمھارے پہننے کے لیے زیب وزینت کا سامان بھی تمھیں ان سے مل جاتا ہے۔ ''حلیہ'' کے معنی زیور کے ہیں۔ مراد موتی، مونگے وغیرہ جن سے حسبِ حال زیور بناتے ہو۔ انگلیوں میں انگوٹھی کے نگینے، گلے کے ہار، پاؤں کی پازیبیں، ہاتھ کے کنگن اور تلوار کا قبضہ وغیرہ بناتے ہو۔

قرآنِ مجید کے ظاہری سیاق سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کھانے کے لیے جیسے گوشت دونوں پانیوں سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح زیور کا یہ سامان بھی دونوں پانیوں سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک اور مقام پر ہے:

﴿يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَ الْمَرْجَانُ۝﴾ [1]

''ان دونوں سے موتی اور مرجان نکلتے ہیں۔''

الزجاج نے تو کہا ہے: کہ یہ موتی وہاں سے نکلتے ہیں جہاں میٹھا اور کھارا پانی باہم ملتے ہیں۔ مگر مبرد کا کہنا ہے کہ موتی صرف کھارے پانی سے برآمد ہوتے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ اور حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے۔ چنانچہ انھوں نے 'منھما' سے 'من مجموعھما' ان دونوں کا مجموعہ مراد لیا ہے۔[2] بلکہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ قرآنِ مجید میں جیسے فرد کا اطلاق فرد، تثنیہ، جمع پر ہوا اسی طرح تثنیہ کا اطلاق فرد یعنی واحد پر بھی ہوا ہے اور اس کی امثلہ میں ایک مثال یہی ﴿يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ﴾ کی بھی دی ہے کہ موتی ومرجان درحقیقت

---

① الرحمن: 22 ② ابن کثیر: 348/4 238/2

دونوں سے نہیں بلکہ کھارے پانی سے ہی نکلتے ہیں۔ اسی طرح سورۃ الکہف [1] میں ہے ﴿نَسِیَا حُوْتَهُمَا﴾ کہ وہ دونوں مچھلی کا ذکر بھول گئے حالانکہ موسیٰ علیہ السلام نہیں بلکہ یوشع علیہ السلام بھولے تھے یہی وجہ ہے کہ بعد کی آیات میں ہے کہ جب موسیٰ علیہ اسلام نے کھانا طلب کیا تو یوشع علیہ السلام نے کہا ﴿فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ﴾ ''تو بے شک میں مچھلی کو بھول گیا۔'' انھوں نے نسیان کی نسبت صرف اپنی طرف کی ہے یوں نہیں کہا: کہ ہم بھول گئے اسی طرح سورۃ ق [2] میں ہے ﴿اَلْقِیَا فِیْ جَهَنَّمَ﴾ یہاں بھی یہ حکم دو فرشتوں کو نہیں بلکہ ایک ہی فرشتہ مراد ہے۔ اسی طرح سات آسمانوں کا ذکر کر کے فرمایا گیا ہے: ﴿وَ جَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا﴾ [3] اور اس نے ان میں چاند کو نور بنایا۔ یہاں بھی ساتوں آسمانوں میں نہیں بلکہ 'فی احداھن' ان میں سے ایک مراد ہے۔

یہ اور اس نوعیت کی دیگر مثالوں سے انھوں نے ثابت کیا ہے: قرآنِ مجید میں کبھی واحد کا اطلاق واحد پر اور کبھی تثنیہ اور جمع پر ہوا ہے اسی طرح تثنیہ کا اطلاق واحد پر اور جمع کا اطلاق بھی واحد پر ہوا ہے۔ شائقین الاتقان [4] النوع الثانی والخمسون ملاحظہ فرمائیں۔ مگر جب سمندروں میں میٹھے پانی کے چشمے بھی پائے جاتے ہیں تو دونوں سے موتی نکلنے کا اطلاق بھی بعید نہیں اور الزجاج نے جیسا کہ کہا ہے دونوں کے ملنے اور مجموعہ کے مقام سے موتی برآمد ہوتے ہیں تو یہ بھی اسی کا مصداق ہے۔

اس کے علاوہ سمندر کو مسخر کر دیا گیا اس میں تمہارے جہاز اور کشتیاں سطحِ سمندر سے موجوں کو پھاڑتی ہوئی آگے نکل جاتی ہیں اور یوں زمین کے علاوہ ان سمندروں اور دریاؤں کو بھی تجارتی ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ بالکل یہی مضمون سورۃ النحل میں بھی بیان ہوا ہے:

﴿وَ هُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَاۚ وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَ

① الکہف: 61 ② ق: 24 ③ نوح: 16 ④ الاتقان: 38/2

لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾[1]

''اور وہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کر دیا تا کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے زینت کی چیزیں نکالو، جنھیں تم پہنتے ہو۔ اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ اس میں پانی کو چیرتی چلی جانے والی ہیں اور تا کہ تم اس کا کچھ فضل تلاش کرو، اور تا کہ تم شکر و کرو۔''

'مواخر' یہ مَخرَ سے جمع ہے جس کے معنی پھاڑنے اور چھیلنے کے ہیں۔ یعنی کشتیاں سطح پانی کو پھاڑتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ اسی سے 'مَخَرَ الْمَاءُ الْاَرْضَ' بولا جاتا ہے کہ پانی نے زمین کو چیر دیا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ہو رہا ہے کہ تمہیں سمندروں سے گوشت، زیب و زینت کے لیے موتی اور مرجان، اور دوسرے دور دراز کے علاقوں میں اللہ کا فضل تلاش کرنے کے لیے سمندروں کو مسخر کر دیا ہے تا کہ تم اپنے پروردگار کا شکر بجا لاؤ۔

یہاں بعض مسائل قابلِ غور ہیں، یہاں آبی جانوروں کے گوشت پر لحم کا اطلاق ہوا ہے۔ اب اگر کوئی یہ قسم کھائے کہ میں ''لحم'' نہیں کھاؤں گا تو کیا وہ آبی جانوروں کا گوشت کھانے سے حانث ہوگا یا نہیں؟ اس مسئلہ میں فقہائے کرام میں اختلاف ہے راجح یہ ہے کہ وہ حانث نہیں ہوگا کیوں کہ عرفِ عام میں جب ''لحم'' یعنی گوشت کی بات ہوتی ہے تو اس سے گائے، اونٹ، بکری ماکول اللحم جانوروں کا گوشت مراد لیا جاتا ہے۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اسی کو راجح قرار دیا ہے۔[2]

یہ بالکل اسی طرح ہے کہ کوئی قسم کھائے کہ میں ''دابۃ'' یعنی جانور پر سوار نہیں ہوں گا۔ کافر کو اللہ نے ''شر الدواب'' کہا ہے مگر اس کے باوجود وہ کافر کے کندھے پر سوار ہو تو حانث نہیں ہوگا کیوں کہ عرف میں جانور سے مراد حیوان جانور ہی ہوتا ہے انسان مراد نہیں ہوتا۔

---

① النحل : 14 ② الجامع لاحکام القرآن: 86/10

یا جیسے کوئی کہے: کہ میں آج کلام نہیں کروں گا۔ تو وہ تسبیح وتحمید وتہلیل کے کلمات کا وظیفہ پڑھنے یا نماز پڑھنے سے حانث نہیں ہوگا اگرچہ حدیث میں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کو ''کلمة التقویٰ'' اور سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ الخ کو ''کَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ'' دو کلمے کہا گیا ہے کیوں کہ عرف میں ان پر کلام کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یہی جمہور کا مسلک ہے۔①

۲: آبی جانوروں کا جیسے گوشت ہے اسی طرح پرندوں کا گوشت ہے۔ اور اسی طرح اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری کا گوشت ہے۔ تو کیا مثلاً مچھلی کے گوشت کے عوض اونٹ، گائے، بکری کا گوشت زیادہ لینا درست ہے؟ کیوں کہ گوشت ہونے میں تو سب برابر ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ ان میں تفاضل جائز ہے، کیوں کہ گوشت کی نوعیت اور اصل جنس میں فرق ہے۔ اسی طرح گائے، بکری، اونٹ کے گوشت میں بھی تفاضل جائز ہے کیوں کہ تمام جانوروں کی قسمیں مختلف ہیں، مگر ایک مچھلی کا دوسری مچھلی کے گوشت کے عوض تفاضل جائز نہیں۔

۳: یہاں زیور کے بارے میں ﴿حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا﴾ کے الفاظ ہیں۔ اور یہ موتی، مرجان بطورِ زیور مرد وعورت دونوں کے لیے جائز ہیں۔ ''تلبسونہا'' مذکر کا صیغہ استعمال کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ زیور مردوں کے لیے بھی ہے۔ البتہ مردوں کے لیے سونا اور ریشم پہننا حرام ہے جس کی وضاحت متعدد احادیثِ مبارکہ میں آئی ہے۔ اب اگر کوئی یہ قسم کھائے کہ میں زیور نہیں پہنوں گا پھر اس نے موتی یا موتیوں کا ہار پہن لیا تو وہ حانث نہیں ہوگا اور اس پر کوئی کفارہ نہیں کیوں کہ عرف میں موتیوں کو یوں پہننے پر زیور کا اطلاق نہیں ہوتا، یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ جب کہ امام شافعی قاضی ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ فرماتے ہیں وہ حانث ہوجائے گا۔ اور یہی زیادہ قرین قیاس ہے۔ البتہ اگر انگوٹھی میں موتی ہو اور اسے پہنا جائے تو اس کا حکم مختلف ہوگا۔ واللہ اعلم

① فتح الباری: 567/11

اسی آیت کے ضمن میں علامہ زمخشری وغیرہ یہ دور کی کوڑی بھی لائے ہیں کہ میٹھے اور کھاری سمندروں کے پسِ منظر میں مومن اور کافر کی بھی مثال ہے۔ مومن میٹھے پانی کی مانند ہے جب کہ کافر کھاری پانی کی طرح ہے۔ مگر کھاری پانی پر مشتمل سمندر تو کافر سے بھی بہتر ہے کیوں کہ اس سے گوشت اور موتی حاصل ہوتے ہیں اور ان میں کشتیوں کے ذریعے سے اللہ کا فضل حاصل کیا جاتا ہے، مگر کافروں سے تو کسی منفعت کی بھی توقع نہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۝﴾ [1]

"پھر اس کے بعد تمھارے دل سخت ہوگئے تو وہ پتھروں جیسے ہیں، یا سختی میں (ان سے بھی) بڑھ کر ہیں اور بے شک پتھروں میں سے کچھ یقیناً وہ ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں اور بے شک ان سے کچھ یقیناً وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں، پس ان سے پانی نکلتا ہے اور بے شک ان سے کچھ یقیناً وہ ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں اور اللہ اس سے ہرگز غافل نہیں جو تم کر رہے ہو۔"

علامہ آلوسی نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ مگر سیاقِ کلام میں یہ مثال اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور اس کے انعامات کی طرف اشارہ پر مشتمل ہے بعد کی آیت میں بھی اسی حقیقت کا بیان ہے۔

---

[1] البقرۃ: 74

﴿يُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِي لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ﴾

(فاطر:۱۳)

''وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا ہے، ہر ایک، ایک مقرر وقت تک چل رہا ہے۔ یہی اللہ تمہارا پروردگار ہے، اسی کی بادشاہی ہے اور جن کو تم اس کے سوا پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے ایک چھلکے کے مالک نہیں۔''

اس آیت میں بھی اللہ کی وحدانیت پر آفاقی دلیل ہے کہ رات دن کی یہ تبدیلی، شمس وقمر کے آنے جانے کا نظام سب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ نہ یہ خود بخود وجود میں آئے ہیں نہ ہی ان کے اس عمل میں اللہ کے سوا کسی اور کا عمل دخل ہے۔ اس سے قائلین ثانویت کی بھی نفی ہوگئی جو کہتے ہیں ایک خالقِ خیر ہے اور دوسرا خالقِ شر ہے۔ دن کے آنے سے اور رات کے چلے جانے سے، اسی طرح رات کے چھا جانے اور دن کے غائب ہو جانے سے معلوم ہوا کہ (سورج چاند) ایک دوسرے کے ہاتھوں مغلوب ہوتے رہتے ہیں اور جو مغلوب ہو وہ معبود نہیں ہوسکتا۔

﴿يُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ﴾ رات کو دن میں داخل کرنے کے ایک معنی یہ ہیں کہ دن کی روشنی آہستہ آہستہ کم ہوتی جاتی ہے اور مشرق سے رات کی تاریکی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جیسے کوئی چیز لپیٹی جا رہی ہو۔ یوں بالآخر تاریکی چھا جاتی ہے، بالکل یہی کیفیت دن کو رات میں داخل کرنے کی ہے کہ مشرق سے پہلے ہلکی سی روشنی اوپر کو

بلند ہوتی ہے۔ جسے صبح کاذب کہتے ہیں۔ روشنی پورے مشرق میں دائیں بائیں پھیل جاتی ہے جسے صبحِ صادق کہتے ہیں۔ یہی روشنی پھر اوپر اٹھتی ہے اور اندھیرے کا پیچھا کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، تا آنکہ آسمان وزمین روشن ہو جاتے ہیں۔

رات کو دن میں داخل کرنے کے معنی یہ بھی ہیں کہ موسمی تغیرات میں کبھی رات لمبی ہوتی ہے تو دن چھوٹا ہو جاتا ہے۔ اور کبھی دن لمبا اور رات چھوٹی ہوتی ہے، حتیٰ کہ دن چودہ پندرہ گھنٹے کا ہو جاتا ہے اور رات نو، دس گھنٹے کی رہ جاتی ہے اور کبھی اس کے برعکس۔ یوں دن رات کا کچھ حصہ ایک دوسرے میں داخل ہوتا رہتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم نے یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ لیل ونہار کی یہ تبدیلی اللہ ہی کے حکم سے ہے، اس میں کسی اور کا کوئی دخل نہیں۔

﴿وَ سَخَّرَ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ﴾ سورج اور چاند کو مسخر کر دیا ہے وہ طلوع وغروب میں اور آنے جانے میں اللہ کے مطیع ہیں اور یہ ان کی تسخیر تمام تر انسانوں کے فائدہ کے لیے ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَ سَخَّرَ لَکُمُ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ﴾[1] تمہاری خاطر سورج اور چاند کو مسخر کر دیا ہے۔ وہ 'اجل مسمی' یعنی وقتِ مقرر تک چل رہے ہیں۔ "وقتِ مقرر" سے طلوع وغروب کا وقت بھی مراد ہے اور قیامت کا بھی، اور ان کا دورانیہ بھی جو سورج کا سال بھر میں اور چاند کا ایک ماہ میں مکمل ہوتا ہے۔

﴿ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ﴾ یہ اللہ ہے تمہارا پروردگار، جس نے یہ سارا نظام پورے ڈھب سے چلا رکھا ہے۔ ﴿لَہُ الۡمُلۡکُ﴾ بادشاہی اسی کی ہے۔ وہ اپنی بادشاہی میں جیسے چاہتا ہے تصرف کرتا ہے کسی کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ مشرکینِ مکہ سمجھتے تھے کہ جن کی عبادت ہم کرتے ہیں اللہ نے انہیں اپنا شریک بنایا ہے۔ چناں چہ حج یا عمرہ کے موقع پر تلبیہ وہ یوں پڑھتے تھے:

---

[1] ابراھیم: 33

' لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِلَّا شَرِيْكاً هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ ' ①

''ہم حاضر ہیں، تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ شریک جو تیرا (ہی مقرر کردہ) ہے تو اس کا مالک ہے اور وہ خود بخود مالک نہیں۔''

ان کے اس عقیدے کی قرآنِ مجید میں جا بجا تردید کی گئی ہے۔ یہاں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ بعض نے ﴿ذٰلِكُمُ﴾ مبتدا اور اس کے بعد کا جملہ خبریہ بتلایا ہے۔ بعض نے کہا ہے: ﴿لَهُ الْمُلْكُ﴾ مستقل جملہ ہے جو ﴿وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ﴾ کے مقابلے میں ہے، جن کو اللہ کے سوا تم پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کی جھلی کے بھی مالک نہیں۔

﴿قِطْمِيْرٍ﴾ کے معنی اکثر مفسرین کے نزدیک وہ سفید باریک سا چھلکا ہے جو کھجور کی گٹھلی پر ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کا اطلاق گٹھلی کے درمیان میں لمبے نشان پر بھی کرتے ہیں اور بعض نے گٹھلی کی پشت پر نقطہ مراد لیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ اتنی حقیر چیز کے بھی مالک نہیں، جیسا کہ ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ○﴾ ②

''کہہ دے پکارو ان کو جنھیں تم نے اللہ کے سوا گمان کر رکھا ہے، وہ نہ آسمانوں میں ذرّہ برابر کے مالک ہیں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا ان دونوں میں کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے سوا دوسرے معبودوں کی ملکیت کی نفی ہی نہیں کی بلکہ

① مسلم: 1185 ② سبا: 22

اس میں شرکت کی بھی نفی کی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا﴾ ①

''اور کہہ دے سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے نہ کوئی اولاد بنائی ہے اور نہ بادشاہی میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ عاجز ہونے کی وجہ سے کوئی اس کا مددگار ہے۔ اس کی بڑائی بیان کر، خوب بڑائی بیان کرنا۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَ خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا﴾ ②

''وہ ذات کہ اسی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اس نے نہ کوئی اولاد بنائی اور نہ کبھی بادشاہی میں کوئی اس کا شریک رہا اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا اندازہ مقرر کیا، پورا اندازہ۔''

اسی لیے مشرکینِ مکہ کا کہنا: کہ مالکِ حقیقی تو اللہ ہے، مگر اللہ نے اپنا شریک مقرر کیا ہے، یہ بات ان کی سمجھ سے بالاتر تھی کہ سارے معاملات تنِ تنہا ایک اللہ سرانجام دے سکتا ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں:

﴿اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ﴾ ③

''کیا اس (محمد رسول اللہ ﷺ) نے تمام معبودوں کو ایک ہی معبود بنا ڈالا؟ بلاشبہ یہ یقیناً بہت عجیب بات ہے۔''

بلکہ انہیں ایک اللہ کا ذکر ناگوار گزرتا تھا:

① بنی اسرائیل : 111 ② الفرقان : 2 ③ ص : 5

﴿وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا﴾ ①

''اور جب تو قرآن میں اپنے ربّ کا، اکیلے اسی کا ذکر کرتا ہے تو وہ بدکتے ہوئے اپنی پیٹھوں پر پھر جاتے ہیں۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَ اِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ﴾ ②

''اور جب اس اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل تنگ پڑ جاتے ہیں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور جب ان کا ذکر ہوتا ہے جو اس کے سوا ہیں تو اچانک وہ بہت خوش ہو جاتے ہیں۔''

یہ حقیقت مشرکانہ ذہن رکھنے والوں میں مشترک ہے۔ جب بھی کوئی مومن صرف اللہ کا ذکر کرتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بزرگوں کا منکر ہے۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اسی آیت کے تحت اپنی آپ بیتی بیان کی ہے:

''ایک روز میں نے دیکھا ایک شخص فوت شدہ بزرگ کو اپنی مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ میں نے کہا: اللہ کے بندے اللہ کو پکارو، وہ خود فرماتا ہے:

﴿وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ﴾ ③

تو وہ میری بات سن کر سخت غصے میں آ گیا۔ بعد میں لوگوں نے بتلایا کہ وہ کہتا تھا: یہ بزرگوں کا منکر ہے اور بعض نے اسے یہ کہتے سنا کہ اللہ کی نسبت بزرگ

① بنی اسرائیل: 46 ② الزمر: 45 ③ البقرة: 186

جلدی سن لیتے ہیں۔ یہ کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس گمراہی اور سرکشی سے بچائے۔ [1]

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بھی ان کے اسی غلط عقیدے کی تردید کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اللہ کے علاوہ جنھیں وہ پکارتے ہیں وہ حقیر چھلکے کے مالک بھی نہیں۔ غور فرمایئے ﴿مِنْ دُوْنِهٖ﴾ کے لیے ملکیت کی نفی میں وہ بزرگ ہستیاں بھی شامل ہیں، جن کی ملکیت کی نفی اوپر سورۂ بنی اسرائیل اور الفرقان میں کی گئی ہے، جنھیں انھوں نے اللہ کا بیٹا یا بیٹیاں بنا دیا تھا۔ اللہ کی تو کوئی اولاد ہی نہیں، اس لیے کسی کی شراکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

امام رازی رحمہ اللہ نے یہاں بڑی لطیف بات فرمائی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہاں اپنے دو اوصاف کا ذکر کیا ہے:

۱: صفتِ خلق کا کہ اپنے ارادے اور اپنی قدرت سے جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔

۲: اپنی بادشاہت کا۔

اور انہی دو سے اپنی الوہیت پر استدلال کیا ہے۔ (ذٰلِكُمُ اللّٰهُ۔۔۔)

اسی طرح ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ اِلٰهِ النَّاسِ ۝﴾ میں بھی پہلی دو صفتوں کے بعد الوہیت پر استدلال ہے، جب کہ جنھیں اللہ کے سوا معبود سمجھا جاتا ہے، ان کے بارے میں صرف ان کی بادشاہی کی تردید کی گئی ہے کہ وہ تو ایک چھلکے کے بھی مالک نہیں ہیں، ان کے کسی اور وصف کی نفی نہیں کی۔ یہ اس لیے کہ وہ اس حقیقت کے تو معترف تھے کہ خالق اللہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہتے تھے : کہ اللہ نے امورِ دنیا ہمارے معبودوں کو تفویض کر دیئے ہیں۔ اس لیے ان کے اسی عقیدے کی تردید ہے کہ نہ ملک اللہ کے سوا کسی کا ہے، نہ اللہ نے انہیں کسی شے کا مالک بنایا ہے۔ بلکہ کسی چیز کے مالک ہونے کی نفی ہی ان کے خالق ہونے کی نفی کو مستلزم ہے۔ کیوں کہ اگر کسی نے کچھ بنایا ہے تو وہ اس کا مالک بھی ہے مگر جب وہ ایک چھلکے کے مالک نہیں تو انھوں نے قلیل وکثیر کچھ بھی نہیں بنایا۔

امام ابومنصور ماتریدی نے فرمایا ہے کہ اس آیت میں توحید ورسالت اور قیامت

[1] روح المعانی : 10/24

کا بیان ہے، جس کا کفارِ مکہ انکار کرتے تھے۔ چناں چہ لیل ونہار اور شمس وقمر کا یہ نظام جو ایک ڈھب اور سلیقے سے بلا تعطل چل رہا ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے۔ یہ نظام ایک اللہ مالک الملک کے ہاتھ میں ہے اور جب تک وہ چاہے گا، اسی طرح چلتا رہے گا۔ اگر یہ نظام خود بخود جاری ہوتا یا اللہ کے سوا کسی اور معبود کا بھی اس میں عمل دخل ہوتا تو یہ ایک ہی ڈھب پر نہ رہتا، اس میں تفاوت اور تفاضل پایا جاتا اور تعطل کا شکار ہو جاتا، جیسا کہ ایک ملک کو دو یا تین بادشاہوں کے ہاتھوں میں دے دیا جائے تو ایک کسی کام کے کرنے کا حکم صادر کرے گا اور دوسرا اس میں رکاوٹیں کھڑی کرے گا۔ ملک ایک نہج پر چل نہیں سکے گا۔ مگر شب وروز اور شمس وقمر کا یہ نظام دلیل ہے اس بات کی کہ اس کا ایک صانع ہے اور اس کو چلانے والا ایک اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ﴾ [1]

”اگر ان دونوں (آسمان اور زمین) میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے۔“

اسی طرح رات کا چلا جانا اور روشنی کا پھیل جانا اور سورج کے ہوتے ہوئے چاند کا بے نور ہونا، اور سورج کے غروب ہونے پر چاند کا منور ہونا بجائے خود دلیل ہے کہ جو اس طرح ایک کو تلف کر کے دوسرے کو اس کے مقام پر لانے پر قادر ہے وہ انسانوں کے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت واختیار ہے اور یہ سارا نظام اس نے چلا رکھا ہے تو یہ بات محال ہے کہ انسانوں کو کوئی حکم نہ دے، نہ کسی بات سے منع کرے اور انہیں بے کار آزاد چھوڑ دے، اس لیے ضروری ہے کہ اللہ کا ایک رسول ہو جو یہ بتلائے کہ اللہ کا حکم کیا ہے؟ اور اللہ نے کس سے منع کیا ہے؟ لوگوں کی ذمہ داری کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ اس آیت میں توحید کے علاوہ رسالت اور قیامت کا بھی اثبات ہے۔

---

[1] الانبیاء: 22

﴿اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَ لَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وَ لَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ﴾ (فاطر:۱٤)

''اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار نہیں سنیں گے اور اگر وہ سن لیں تو تمہاری درخواست قبول نہیں کریں گے اور قیامت کے دن تمہارے شرک کا انکار کردیں گے اور تجھے ایک پوری خبر رکھنے والے کی طرح کوئی خبر نہیں دے گا۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبودوں کی مزید بے بسی اور بے چارگی کا اظہار ہے۔ چناں چہ فرمایا: ''اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار کو سنیں گے نہیں۔'' مصائب وآلام میں، یا اپنی دیگر ضروریات میں تم انہیں مدد کے لیے پکارو تو وہ تمہاری پکار نہیں سنیں گے۔علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ: اگر وہ معبود بت ہیں تو ظاہر ہے وہ سمع وبصر سے ہی محروم ہیں اور اگر وہ ملائکہ یا صالحین ہیں تو وہ ان کے قریب نہیں کہ سن سکیں۔ یا وہ حظیرۃ القدس میں اپنے مشاغل میں ہیں وہ ان کی پکار کیسے سنیں؟ یا یہ کہ اللہ نے مشرکین کی اس پکار کو سننے سے ان کے کانوں کو محفوظ کر دیا ہے کہ ان تک یہ قبیح آواز ہی نہ پہنچے۔[1]

اللہ تعالیٰ جسے چاہے کوئی بات سنا دے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ مشرکین کی پکار کو ان کے معبود نہیں سنتے تو اب یہ نزاع لفظی ہے کہ وہ کچھ سنتے ہیں یا نہیں سنتے۔ اس سے قطع نظر یہاں نفی مشرکین کی اپنی حاجات میں اپنے معبودوں کو پکارنے کی ہے کہ ان کی پکار وہ نہیں سنتے۔

﴿وَ لَوْ سَمِعُوْا﴾ بالفرض اگر وہ سن لیں، تو وہ تمہیں عملاً جواب نہیں دے

---

[1] روح المعانی

سکتے۔ تمھیں کوئی نفع نہیں پہنچا سکتے۔ کیوں کہ وہ تو ایک چھلکے کے بھی مالک نہیں ہیں۔ تمھیں کیا دیں گے۔ جو اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتا ہے تو یہ دراصل اس پر معبود ہونے کی تہمت ہے اور حقیقت کے برعکس ہے۔ جب وہ معبود ہی نہیں تو پکار کو قبول کیوں کر کرسکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ وہ قیامت کے دن اس قسم کی عبادت کی نفی کردیں گے بلکہ ان کے مخالف ہوجائیں گے۔ جیسا کہ آئندہ آرہا ہے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی معبود برحق ہے اور اس نے فرمایا ہے:

﴿اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ [1]

"مجھے پکارو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔"

بلکہ یہ بھی فرمایا:

﴿اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ [2]

"میں پکارنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔"

اسی طرح ایک جگہ فرمایا:

﴿لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَهُمْ بِشَیْءٍ﴾ [3]

"برحق پکارنا صرف اسی (اللہ) کے لیے ہے اور جن کو وہ اس کے سوا پکارتے ہیں وہ ان کی دعا کچھ بھی قبول نہیں کرتے۔"

ایک مقام پر فرمایا:

﴿وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَهٗٓ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ وَ هُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝﴾ [4]

"اور اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہے جو اللہ کے سوا انہیں پکارتا ہے جو

[1] المؤمن: 60 [2] البقرة: 186 [3] الرعد: 14 [4] الاحقاف: 5

قیامت کے دن تک اس کی دعا قبول نہیں کریں گے اور وہ ان کے پکارنے سے بے خبر ہیں۔“

اب یہ کیا ستم ظریفی ہے اللہ فرمائے: مجھے پکارو میں جواب دیتا ہوں، قبول کرتا ہوں۔ مجھے پکارنا حق ہے اور یہ بھی فرمائے کہ میرے علاوہ جنھیں پکارا جائے وہ جواب نہیں دیتے۔ قیامت تک تمہاری درخواست قبول نہیں کر سکتے۔ ان کو پکارنا باطل ہے۔ مگر اس کے برعکس اللہ کو تو پکارا نہ جائے اور اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کو پکارا جائے اور ان سے مدد طلب کی جائے۔ کیا ہمارے اس طرز عمل پر کہا جاسکتا ہے کہ ہمیں اللہ پر ایمان ویقین ہے اور اللہ کی ہر بات صحیح ہے؟

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں یہ بات بھی کہی ہے کہ اگر ان بتوں کو حیات اور عقل دے دی جائے اور وہ تمہاری پکار کو سن لیں تو وہ تمہاری کافرانہ پکار قبول نہیں کریں گے، بلکہ اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری کریں گے۔ گویا وہ تمہاری غلط بات پر متوجہ ہی نہیں ہوں گے۔ جب بتوں کی یہ کیفیت ہے تو اللہ کے نیک بندے اس کافرانہ پکار کو کیوں کر قبول کریں گے اور مشرکین کی حاجت برآری کیسے کریں گے۔

﴿وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ تمہاری پکار نہ قبول کرنے کا ہی نتیجہ ہے کہ قیامت کے دن تمہارے شرک کا انکار کردیں گے کہ یہ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے۔ چہ جائیکہ وہ تمہاری پکار کا جواب دیں۔

﴿وَ اِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّ كَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ﴾ [1]

”اور جب سب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ (معبودانِ باطلہ) ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی عبادت سے منکر ہوں گے۔“

---

[1] الاحقاف: 6

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّاۙ۝ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَ يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا۝﴾ ①

''اور انھوں نے اللہ کے سوا اور معبود بنا لیے، تاکہ وہ ان کے لیے باعثِ عزت ہوں۔ ہرگز ایسا نہ ہوگا، عنقریب وہ ان کی عبادت کا انکار کردیں گے اور ان کے خلاف مدِ مقابل ہوں گے۔''

اللہ کے سوا یہ معبود اگر بت ہیں تو اللہ انہیں بھی قوتِ گویائی دیں گے اور وہ بھی ان کے شرک کا انکار کریں گے، اور فرشتوں سے قیامت کے دن جب پوچھا جائے گا کہ یہ تمہاری عبادت کرتے تھے تو وہ عرض کریں گے۔ ہرگز نہیں یہ جنوں کے پجاری تھے۔ ②

یہ شرک وکفر جنوں کی شرارت ہے اور انہی کی شعبدہ بازیوں کا نتیجہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی قیامت کے دن جب پوچھا جائے گا کہ تم نے کہا تھا: کہ اللہ کے بندو! مجھ کو اور میری والدہ کو معبود بنا لو؟ تو وہ عرض کریں گے:

﴿قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ﴾ ③

''وہ کہے گا تو پاک ہے، میرے لیے بنتا ہی نہیں کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔''

لہٰذا مشرکین اللہ کے سوا جنھیں پکارتے ہیں اور مافوق الفطرت مصائب میں جن سے مدد طلب کرتے ہیں۔ قیامت کے دن وہ بھی ان کے دشمن ہوں گے، اور اس کا بھی انکار کردیں گے کہ یہ ہماری عبادت کرتے تھے۔ بلکہ وضاحت کریں گے یہ درحقیقت ہماری نہیں جنوں کی عبادت کرتے تھے اور شرک وکفر کی یہ پٹی ان کو

① مریم: 82,81 ② سبا: 41,40 ③ المائدۃ: 116

انھوں نے ہی پڑھائی تھی۔ اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہو رہی ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو پکارنا شرک ہے۔ تبھی تو فرمایا گیا ہے کہ تمہارے شرک کا وہ انکار کر دیں گے۔

﴿وَ لَا يُنَبِّئُكَ﴾ اور تجھے پوری خبر دینے والے کی طرح کوئی خبر نہیں دے گا۔ یعنی یہ خبر کہ جن کو اللہ کے سوا تم پکارتے ہو وہ تمہاری دعا نہیں سنتے، بالفرض سن لیں تو تمہاری دعا قبول نہیں کر سکتے بلکہ روزِ قیامت وہ تمہارے مدِ مقابل ہوں گے اور تمہارے شرک کا انکار کریں گے۔ اس حقیقت کی خبر اور ان کے انجام سے تمہیں اللہ نے خبردار کیا ہے اس سے بڑھ کر حقائق کو جاننے والا کون ہے؟ کوئی اور تو عقل وفکر سے سمجھانے کی کوشش کرے گا مگر یہاں تو اللہ تمہیں خبردار کر رہا ہے۔ اس لیے اپنی جھوٹی امیدوں کے سہارے زندگی بسر کر کے آخرت کی ذلت ورسوائی مول نہ لو۔ اور نہ ہی کسی اور کی باتوں پر کان دھرو۔

﴿وَ لَا يُنَبِّئُكَ﴾ کا یہ مفہوم اس اعتبار سے ہے کہ ”لَا يُنَبِّئُكَ اَيُّهَا السَّامِعُ“ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خطاب نبی کریم ﷺ سے ہو جس میں آپ کو تسلی دینا مقصود ہے کہ یہ جو کچھ اپنے جھوٹے معبودوں کے بارے میں اعتقاد اور اعتماد رکھتے ہیں یہ ان کی خام خیالی ہے۔ آپ جمع خاطر رکھیں قیامت کے روز یہی معبود ان کی آنکھیں کھول دیں گے اور ان کے مقابلے میں ان کے شرک کی تردید کر دیں گے۔

:: :: ::

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَ اللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ﴾ (فاطر:۱۵)

''اے لوگو! تم ہی اللہ کی طرف محتاج ہو اور اللہ ہی سب سے بے پروا، تمام تعریفوں کے لائق ہے۔''

اس آیت میں پہلے مضمون کا تتمہ ہے کہ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ بھی، اور باقی بھی سب لوگ اللہ کے محتاج ہیں، گویا طالب اور مطلوب دونوں اللہ کے محتاج ہیں۔ ''غنی حمید'' صرف اللہ ہے اسی کو پکارو، وہ تعریفوں کے لائق ہے۔

اور یہ بات بھی سمجھ لو کہ میرا رسول جو شب و روز تمہیں ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دیتا ہے تو اس کے یہ معنی قطعاً نہیں کہ اللہ تمہاری عبادت کا محتاج ہے اگر تم ایک اللہ کو نہ مانو اور اس کی اطاعت و عبادت نہ کرو تو اللہ کی بادشاہت میں کوئی کمی واقع ہو جائے گی اور اللہ کا کوئی کام رک جائے گا۔ ہرگز نہیں کیونکہ وہ الغنی (بے نیاز) ہے۔

جیسے سورۃ الذاریات میں فرمایا ہے:

﴿وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّ مَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۝﴾[1]

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔ نہ میں ان سے کوئی رزق چاہتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔ بے شک اللہ ہی بے حد رزق دینے

[1] الذریٰت: 56-58

والا، طاقت والا، نہایت مضبوط ہے۔"

یوں نہیں کہ میرا دربار اور ڈیرہ تب چلے گا جب لوگ میری عبادت اور میری اطاعت کریں گے۔ جیسا کہ عموماً اللہ کے سوا جن کو پوجا جا رہا ہے ان کے دربار ان کے ماننے والوں کی وجہ سے بارونق ہیں وہ اگر وہاں چندہ وخیرات اور نذرانے نہ دیں تو ان کا دربار نہیں چلتا۔ لوگوں کو ان سے رزق تو کجا الٹا لوگوں سے انہیں رزق پہنچایا جاتا ہے۔ ایک اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں سے لیتا نہیں بلکہ سب کچھ انہیں دیتا ہے۔ وہ خود کھاتا نہیں سب کو کھلاتا ہے: ﴿وَ هُوَ يُطْعِمُ وَ لَا يُطْعَمُ﴾ [1] جو خود کھانے کا محتاج ہے وہ دوسروں کی محتاجی کیوں کر دور کر سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدۂ محترمہ، جنھیں معبود بنانے والوں نے معبود بنایا، کے بارے میں فرمایا:

﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ [2]

"وہ دونوں کھانا کھایا کرتے تھے۔"

اس لیے یہ نہ سمجھو کہ ہماری عبادت کا اللہ محتاج ہے۔ ہم اس کی بندگی کریں گے تو اس کی بسائی ہوئی یہ بستی بسے گی۔ ہرگز ایسا نہیں بلکہ تم اللہ کے محتاج ہو۔ تم پیدا ہوئے تو تم ہر چیز سے بے خبر تھے، کچھ کرنے کی تم میں قدرت نہیں تھی نہ کسی چیز کے تم مالک تھے اس حال میں اللہ نے تمھیں پروان چڑھایا۔ پھر تمھیں عقل وشعور اللہ نے عطا فرمایا، کمانے کی قوت اللہ نے دی، یوں قدم قدم پر تم محتاج ہو۔ اگر وہ چاہے تو تم ایک لمحہ کے لیے زندہ نہیں رہ سکتے، اگر چاہے تو تمھاری قوتیں لمحہ بھر میں زائل کر دے اور اگر چاہے تو تمھارے اسباب ووسائل کو تمھارے اوپر الٹ دے۔ اس لیے محتاج تم ہو حتی کہ ہمارے نوازنے کے باوجود تمھاری محتاجی ختم نہیں ہوتی۔ ﴿هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ کی حرص قائم رہتی ہے۔ کسی اللہ والے نے کیا خوب کہا ہے:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ فَقِيْرٌ فِيْ غَنَاءِيْ فَكَيْفَ لَا اَفْقِرُ فِيْ فَقْرِيْ))

---

[1] الانعام: 14 [2] المائدہ: 75

"اے اللہ میں اپنی آسودگی میں فقیر ہوں تو اپنی فقیری میں فقیر کیوں نہیں۔"

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہا کرتے تھے:

وَ الْفَقْرُ لِیْ وَصْفُ ذَاتٍ لَازِمٌ اَبَداً
کَمَا الْغِنٰی اَبَداً وَصْفٌ لَهٗ ذَاتِی

فقر اور محتاجی میرا وصف ذاتی ہے، میری ذات کو ہمیشہ لازم ہے جیسا کہ ہمیشہ غنا اور بے نیازی اس (اللہ) کا وصف ذاتی ہے۔ یعنی جیسے اللہ کے لیے غنا اور بے نیازی لازم ہے اسی طرح فقر و مسکنت انسان کے لیے لازم ہے۔

شیخ الاسلام ہی کا کہنا ہے:

اَنَا الْمُکَدِّیْ اَنَا الْمُکَدِّیْ
کَذٰلِكَ کَانَ اَبِیْ وَ جَدِّیْ

(اے اللہ!) میں تیرا بھکاری ہوں، تیرا منگتا ہوں اور خیرات طلب کرنے والا ہوں، میں ہی کیا میرا باپ اور دادا بھی تیرے بھکاری ہیں۔ گویا اباً عَنْ جَدٍّ ہم سب تیرے در کے فقیر ہیں۔ علامہ سہیلی رحمہ اللہ کی مناجات جس کے بارے میں وہ فرماتے ہیں: کہ جب بھی اس کے ذریعے سے میں نے دعا کی اللہ تعالیٰ نے اسے شرف قبول بخشا۔ اس کا ایک شعر ہے:

مَالِیْ سِوٰی فَقْرِیْ اِلَیْكَ وَسِیْلَةٌ
وَبِالْاِفْتِقَارِ اِلَیْكَ فَقْرِیْ اَدْفَعُ

میری گداگری کے علاوہ میرا آپ تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ آپ کی کاسہ لیسی کرکے ہی میں اپنی فقیری کا مداوا کرتا ہوں۔[1] مولانا قطب الدین دہلوی رحمہ اللہ کی مناجات میں ہے:

---

[1] البدایۃ: 334/14 وغیرہ

الٰہی! شاہ تو ہے ، میں گدا ہوں
الٰہی! تو غنی ، میں بے نوا ہوں
الٰہی! تو غفور اور میں گنہگار
الٰہی! تو کریم اور میں گرفتار
الٰہی! تو قوی اور ناتواں میں
خداوندا! کہاں تو اور کہاں میں

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ نے فرمایا: اے میرے بندو! میں نے اپنے نفس پر ظلم کو حرام قرار دیا ہے اور میں نے اسے تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے، پس تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔

”اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو، سوائے ان کے جن کو میں کھلاتا ہوں لہٰذا تم مجھ سے کھانا طلب کرو میں تمہیں کھلاؤں گا۔“

”اے میرے بندو! تم سب برہنہ ہو، سوائے ان کے جن کو میں پوشاک پہنا دوں، پس تم مجھ سے ہی پوشاک مانگو، میں تمہیں لباس پہناؤں گا۔ اے میرے بندو! تم رات دن گناہ کرتے ہو اور میں تمام گناہوں کو معاف کرتا ہوں، پس تم مجھ سے مغفرت طلب کرو، میں تمہیں بخش دوں گا۔“

”اے میرے بندو! تم میرے نقصان کو نہیں پہنچ سکتے کہ تم مجھے نقصان پہنچا سکو اور میرے نفع کو نہیں پہنچ سکتے کہ تم مجھے نفع پہنچا سکو۔“

”اے میرے بندو! اگر تمہارے اوّل اور آخر تمہارے انسان اور جنات سب اس شخص کی طرح ہو جائیں جس کے دل میں تم میں سے سب سے زیادہ اللہ کا ڈر ہے، تو یہ بات میری بادشاہی میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتی۔“

”اے میرے بندو! اگر تمہارے اوّل اور آخر، تمہارے انسان اور

جنات، اس شخص کی طرح ہو جائیں جو تم میں سے سب سے زیادہ فاجر وفاسق ہے تو یہ چیز میری بادشاہی میں کوئی کمی نہیں کرسکتی۔'' الخ

یہ طویل روایت صحیح مسلم کی کتاب البر باب تحریم الظلم [1] میں ہے۔

اس لیے سب اللہ کے محتاج ہیں اور اس کے در کے سوالی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو عرض کیا:

﴿رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ﴾ [2]

''اے میرے رب! بے شک میں، جو بھلائی بھی تو میری طرف نازل فرمائے، اس کا محتاج ہوں۔''

ہر انسان رزق کا محتاج ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

﴿فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ﴾ [3]

''سو تم اللہ کے ہاں ہی رزق تلاش کرو اور اس کی عبادت کرو اور اس کا شکر کرو۔''

لہٰذا جو اللہ سے رزق طلب کرتا ہے وہ اللہ کا فقیر ہے اس کا عبادت گزار ہے اور جو مخلوق سے رزق طلب کرتا ہے، وہ مخلوق کا فقیر اور عبادت گزار ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے آپ کو غربت میں اللہ کی ہر چیز کا فقیر کہا ہے۔

طائف سے واپسی پر ایک درخت کے نیچے ستانے کے لیے جب رسول اللہ ﷺ تشریف فرما ہوئے تو عرض کرتے ہیں:

((اَللّٰھُمَّ اِلَیْكَ اَشْكُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّةَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ)) الخ [4]

''اے اللہ! میں تجھ سے اپنی کمزوری، تدبیر کی کمی اور لوگوں کی بے توقیری کی شکایت کرتا ہوں اے ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا خاص طور پر پروردگار ہے۔''

[1] مسلم: 2577 [2] القصص: 24 [3] العنکبوت: 17 [4] ابن ھشام: 420/1 وغیرہ

اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک ضعیف سند سے میدانِ عرفات میں ایک دعا کے الفاظ ہیں:

'اَللّٰهُمَّ اَنْتَ تَسْمَعُ كَلَامِیْ وَتَعْلَمُ مَكَانِیْ وَتَعْلَمُ سِرِّیْ وَعَلَانِیَتِیْ لَا یَخْفٰی عَلَیْكَ شَیْءٌ مِنْ أُمْرِیْ، وَاَنَا الْبَائِسُ الْفَقِیْرُ الْمُسْتَغِیْثُ الْمُسْتَجِیْرُ الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِهٖ، اَسْأَلُكَ مَسْأَلَةَ الْمِسْكِیْنَ...اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْنِیْ بِدُعَائِكَ شَقِیًّا وَكُنْ بِیْ رَءُوْفًا رَّحِیْمًا یَا خَیْرَ الْمَسْئُوْلِیْنَ یَا خَیْرَ الْمُعْطِیْنَ' ①

"اے اللہ تو میرا کلام سنتا ہے، میری حیثیت کو دیکھتا ہے، میرے اندرونی وبیرونی معاملات کو جانتا ہے، میری کوئی چیز تجھ سے چھپی ہوئی نہیں، میں لاچار فقیر ہوں، مدد کا طلب گار ہوں، پناہ مانگنے والا ہوں، خوف کھانے اور ڈرنے والا ہوں، اپنی خطاؤں کا اعتراف ہے۔ میں مسکین کی طرح آپ سے سوال کرتا ہوں --- اے اللہ! مجھے اپنے پکارنے میں نا امید نہ کر، میرے ساتھ رأفت ورحمت کا معاملہ فرما۔ اے بہترین مسئول اور بہترین عطا کرنے والے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ اور اسی نوعیت کی بہت سی دعاؤں سے واضح ہوتا ہے کہ بندہ اپنے ہر معاملے میں اللہ کا محتاج ہے۔ حافظ ابن قیم نور اللہ مرقدہ نے "طریق الہجرتین" ② میں بڑی لطیف بات کہی ہے کہ "اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے: 'اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اِلَی اللّٰهِ' تم اللہ کی طرف محتاج ہو۔ یہ نہیں فرمایا: کہ تم اپنے ربّ کی طرف فقیر ہو۔ کیوں کہ تمام انسان کیا، تمام مخلوق اللہ کی ربوبیت کی محتاج ہے۔ اور یہ فقر اضطراری ہے جس سے کوئی نیک یا گناہگار، مومن یا کافر خارج نہیں۔ یہ فقر نہ باعثِ ثواب ہے نہ باعثِ عتاب، نہ اللہ کے ہاں باعثِ مدح ہے۔ ہر انسان ہوا، پانی، غذا کا محتاج ہے حتی کہ زندگی میں دوسرے انسانوں سے تعاون کا بھی محتاج ہے۔ بلکہ یہاں

① طبرانی، مجمع: 252/3 ② طریق الهجرتین: ص 9,8

’’اللہ کی طرف محتاج‘‘ ہونے کا یعنی اللہ کی الوہیت کی طرف محتاج ہونے کا ذکر ہے۔

یہی فقر اختیاری ہے اور یہی فقر انبیائے کرام اور صالحین وابرار کا ہے۔ اور یہ اس خوش نصیب کو حاصل ہوتا ہے جسے اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اپنے آپ کی حقیقت وحیثیت بھی سامنے ہوتی ہے۔ چناں چہ جو سمجھ لیتا ہے کہ غنی مطلق اللہ ہے وہ یہ بھی سمجھ لیتا ہے کہ میں سراپا فقیر ومحتاج ہوں۔ جو جان لیتا ہے کہ میرا اللہ ہی قادر مطلق ہے، وہ یہ بھی سمجھ لیتا ہے کہ میں عاجز وبے بس ہوں۔ جو سمجھ لیتا ہے میرا اللہ ہی تمام عزت کا حق دار ہے، وہ اپنے بارے میں سمجھ لیتا ہے کہ میں سراپا مسکین وحقیر اور اس کا بندہ ہوں۔ جو جان لیتا ہے کہ علیم وحکیم اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، وہ اپنے بارے میں اپنی بے خبریوں کا اعتراف کرلیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ مخلوق میں سب سے زیادہ اپنی عبدیت کا اعتراف واظہار کرنے والے اور اپنے اللہ کے سامنے اپنے فقر اور اپنی محتاجی کو سب سے زیادہ پیش کرنے والے تھے۔ آپ کی ایک دعا کے الفاظ ہیں:

((اَللّٰھُمَّ رَحْمَتَكَ اَرْجُوْا فَلَا تَكِلْنِيْ اِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ وَاَصْلِحْ لِيْ شَاْنِيْ كُلَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ))

’’اے اللہ! میں تیری رحمت کا امیدوار ہوں، مجھے آنکھ جھپکنے کے برابر بھی میرے نفس کے سپرد نہ کر اور میری ہر حالت درست کردے۔ تیرے سوا میرا کوئی معبود نہیں۔‘‘

آپ سیّد الانبیاء ہیں اور امام الہدیٰ ہیں، پھر بھی اللہ سے عرض کرتے ہیں:

((يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ))

’’اے دلوں کے پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔‘‘

آپ ﷺ سے بڑھ کر کون جاننے والا ہے کہ دل اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس طرح چاہتا ہے تصرف کرتا ہے۔

اللہ ہی نے تو فرمایا ہے:

﴿وَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ ثَبَّتۡنٰكَ لَقَدۡ كِدۡتَّ تَرۡكَنُ اِلَيۡهِمۡ شَيۡـًٔا قَلِيۡلًا ۝﴾ ①

''اور اگر ہم نے تجھے ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو قریب تھا کہ تھوڑا سا تو ان کی طرف مائل ہو جاتا۔''

اپنی عبدیت کے اظہار میں فرماتے ہیں:

'لَا تُطۡرُوۡنِیۡ كَمَا أَطۡرَتِ النَّصَارٰی الۡمَسِیۡحَ ابۡنَ مَرۡیَمَ اِنَّمَا اَنَا عَبۡدٌ فَقُوۡلُوۡا عَبۡدُ اللّٰهِ وَرَسُوۡلُهٗ'

''میرا مرتبہ اس طرح نہ بڑھا دینا جس طرح عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے مرتبے سے بڑھا دیا تھا۔ بے شک میں بندہ ہوں لہٰذا مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔''

آپ فرماتے ہیں: لوگو!

'مَا اُحِبُّ اَنۡ تَرۡفَعُوۡنِیۡ فَوۡقَ مَنۡزِلَتِیۡ اِنَّمَا اَنَا عَبۡدٌ'

''میں پسند نہیں کرتا کہ تم مجھے میرے مرتبے سے بڑھاؤ، بے شک میں بندہ ہوں۔''

اسی مقامِ فقر و عبدیت اور اللہ کی کامل معرفت کا نتیجہ ہے کہ اللہ نے مقامِ وسیلہ عطا فرمایا اور قیامت کے روز پوری انسانیت پر آپ ﷺ کا سر بلند فرمایا۔

حافظ ابنِ قیم فرماتے ہیں:

یہی فقر نافع ہے اور یہی مطلوب و مقصود ہے۔ اور یہ فقر مال و دولت کے منافی نہیں۔ انبیائے کرام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام صاحبِ مال و مویشی تھے۔ حضرت داود اور سلیمان علیہما السلام بھی صاحبِ مال و دولت تھے، حتیٰ کہ اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایسی بادشاہی اور سلطنت عطا فرمائی کہ ایسی بادشاہت مخلوق میں سے کسی کو حاصل نہیں

① بنی اسرائیل: 74

ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَ وَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰیo﴾ [1]

”اس نے تجھے تنگ دست پایا تو غنی کر دیا۔“

مگر اس انعام واکرام کے باوجود فقیر تھے اور اپنے فقر میں دوسروں سے بے نیاز، اس لیے حقیقی فقیر وہی ہے جو ہمیشہ ہر حال میں اپنے اللہ کے سامنے اپنی محتاجی کا اظہار کرے اور ہر ضرورت اسی سے طلب کرے۔ اور اپنے تمام احوال میں اللہ کی طرف متوجہ رہے۔ مال و دولت پر فریفتہ ہو کر اللہ سے غافل نہ ہو، اپنے اللہ کا شکر کرتا رہے۔ فقر و مسکنت ہو تو حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے بلکہ صبر و قناعت کا مظاہرہ کرے۔

﴿وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ﴾ اللہ ہی سب سے بے پروا، تمام تعریفوں کے لائق ہے۔ ”غِنٰی“ کے معنی تونگری، کامل ملکیت، بے نیازی اور ہر ایک سے مستغنی کے ہیں۔ اور کلی طور پر بے نیازی اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اس کے دوسرے معنی قدرِ محتاج ہونا اور ماتیسر پر قانع ہونا ہیں۔ اسی معنی میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَ وَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰیo﴾ [2]

”اور اس نے تجھے تنگ دست پایا تو غنی کر دیا۔“

اور حدیث میں ہے:

((اَلْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ))

”کہ غنی درحقیقت قناعتِ نفس کا نام ہے۔“

اور غَنِیٌّ کے ایک معنی مالدار کے ہیں۔ مگر اللہ کے لیے اس معنی میں یہ لفظ استعمال نہیں ہوا بلکہ اَلْغَنِیُّ سب سے بے نیاز اور کسی کی مدد کا محتاج نہ ہونے کے معنی میں آیا ہے۔

---

[1] الضحیٰ: 8 [2] ایضًا

اس صفت کا عموماً اللہ کی صفتِ ''الحمید'' کے ساتھ ذکر ہوا ہے اس کے علاوہ ایک مقام پر ''غَنِیٌّ حَلِیْمٌ ''① اور ایک اور مقام پر ''غَنِیٌّ کَرِیْمٌ ''② بھی وارد ہوا ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

﴿وَ رَبُّكَ الْغَنِیُّ ذُو الرَّحْمَةِ﴾ ③

''اور تیرا ربّ ہی ہر طرح بے پروا، کمال رحمت والا ہے۔''

﴿الحمید﴾ تمام تعریفوں کے لائق وہی ہے اور اپنی ذات میں محمود ہے۔ کوئی انسان اس کی حمد کرے، نہ کرے، مگر حمد کا مستحق وہی ہے۔ اس حقیقت کو ہر ذرہ ذرہ جانتا ہے اسی لیے وہ اس کی حمد و تسبیح بیان کرتا ہے۔

﴿وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ﴾ ④

''اور کوئی بھی چیز نہیں مگر اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔''

اور اللہ ہی ہے جو غنی اور حمید ہے۔ ایک انسان اپنے مالدار ہونے کی وجہ سے ''غنی'' تو ہے مگر وہ دوسروں سے بے نیاز نہیں، اسی لیے وہ ''حمید'' نہیں، ''حمید'' وہی ہوسکتا ہے جو بے پروا ہو، کسی سے کوئی فائدہ اٹھانے والا نہ ہو مگر اپنے خزانوں کے منہ دوسروں کے لیے کھول دینے والا ہو۔ انسانوں میں محض مالدار ہونا لائقِ تعریف نہیں ہوتا، بلکہ وہی مالدار لائقِ تحسین و تعریف ہوتا ہے جو جود و سخا کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ تو ایسا غنی ہے جو ہر ایک سے بے پروا ہے، ہر ایک کو جو کچھ مل رہا ہے اسی کے دستر خوان سے مل رہا ہے۔ کوئی اس کی حمد کرے نہ کرے اسے اس کی کوئی پروا نہیں۔ کوئی حمد کرے گا تو اسی کو فائدہ پہنچے گا۔

اللہ ''غنی'' ہے۔ سب سے بے نیاز ہے۔ اس کے باوجود وہ فرماتا ہے: مجھ

① البقرۃ:263 ② النمل:40 ③ الانعام:133 ④ بنی اسرائیل:44

سے مانگو میں دوں گا، جب کہ انسان فقیر ہے اور قدم بہ قدم اللہ کا محتاج ہے مگر وہ اللہ سے نہیں مانگتا بلکہ ان سے مانگتا ہے جو خود محتاج ہیں اور نہ انھوں نے کسی کو مانگنے کے لیے کہا ہے۔ اس لیے اس سے مانگو جو غنی ہے۔ حضرت قاضی محمد سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ نے کیا خوب کہا ہے:

سب اپنے حال میں ہیں احتیاج مند
دل میں کسی کو جان کے حاجت روا نہ مانگ
مانگ اور مانگ، مانگ سدا مانگ حق سے مانگ
مت مانگ کچھ نہ مانگ بشر سے ذرا نہ مانگ
خالق سے مانگ تسمہ بھی ہو خواہ کفش کا!
سلک گہر اور شۂ دریا عطا نہ مانگ
ہے دینے والا سب کو غنی حمید ہی
خلقت سے دے کے واسطۂ کبریا نہ مانگ
سلمان ایک بات تجھے راز کی کہوں!
تو حق سے حق کو مانگ کبھی ما سوا نہ مانگ

:: :: ::

﴿اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡهِبۡكُمۡ وَ یَاۡتِ بِخَلۡقٍ جَدِیۡدٍO وَ مَا ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ بِعَزِیۡزٍO﴾ (فاطر:۱۶،۱۷)

”اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور نئی مخلوق لے آئے، اور یہ اللہ پر کچھ مشکل نہیں۔“

یہ آیات بھی پہلے موضوع کا تتمہ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بے نیازی کا بیان ہیں۔ اگر اللہ چاہے تو تم سب کو فنا کر دے۔ یہ سب اس کی مشیت پر موقوف ہے۔ یوں نہیں کہ تمہارے باقی رکھنے میں اللہ کی کوئی مجبوری ہے۔ اللہ چاہے تو تمہیں فنا کر کے تمہاری جگہ نئی مخلوق لے آئے، اگر وہ یوں کرنا چاہے تو یہ اللہ کے لیے کوئی مشکل نہیں۔ یہی بات اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سورۂ ابراہیم میں فرمائی ہے:

﴿اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡهِبۡكُمۡ وَ یَاۡتِ بِخَلۡقٍ جَدِیۡدٍO وَّ مَا ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ بِعَزِیۡزٍ﴾ [1]

”کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور ایک نئی مخلوق لے آئے، اور یہ اللہ پر ہرگز مشکل نہیں۔“

اگر اللہ تعالیٰ تمہاری نافرمانیوں کے باوجود ایسا نہیں کرتا تو یوں نہیں کہ وہ ایسا کر نہیں سکتا یا تمہارا باقی رکھنا اس کی کوئی مجبوری ہے بلکہ یہ تمام تر اس کی رحمت وشفقت ہے کہ تم جی رہے ہو۔ اسی حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

﴿وَ رَبُّكَ الۡغَنِیُّ ذُو الرَّحۡمَةِ اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡهِبۡكُمۡ وَ یَسۡتَخۡلِفۡ مِنۡ

[1] ابراهیم: 20,19

بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ﴾ [1]

”اور تیرا ربّ ہی ہر طرح بے پروا کمال رحمت والا ہے، اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور تمہارے بعد جانشین بنا دے جسے چاہے، جس طرح اس نے تمہیں کچھ اور لوگوں کی اولاد سے پیدا کیا ہے۔“

اس لیے تمہاری نافرمانیوں کی بنا پر تمہیں جو مہلت مل رہی ہے تو یہ اس کی رحمت کا نتیجہ ہے یوں نہیں کہ تمہارا باقی رکھنا، اللہ کی کوئی کمزوری ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ﴾ [2]

”اور اللہ ہی بے پروا ہے اور تم ہی محتاج ہو اور اگر تم پھر جاؤ گے تمہاری جگہ تمہارے سوا اور لوگوں کو لے آئے گا، پھر وہ تمہاری طرح کے نہ ہوں گے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا:

﴿اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ﴾ [3]

”اگر تم اور وہ لوگ جو زمین میں ہیں، سب کے سب کفر کرو تو بے شک اللہ یقیناً بڑا بے پروا، بے حد تعریف والا ہے۔“

اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کے بارے میں بھی یہی فرمایا ہے کہ جو شکر گزار ہے اس کا فائدہ اسی کو ملے گا۔ اس کی شکر گزاری سے اللہ کو کوئی فائدہ نہیں۔

﴿وَ مَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ﴾ [4]

---

[1] الانعام : 133 [2] محمد : 38 [3] ابراهيم : 8 [4] لقمان : 12

"اور جو کوئی شکر کرے تو وہ اپنے ہی لیے شکر کرتا ہے اور جو ناشکری کرے تو یقیناً اللہ بہت بے پروا، بہت تعریفوں والا ہے۔"

حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب پلک جھپکنے سے پہلے تخت کو اپنے سامنے پایا تو فرمایا:

﴿هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ لِيَبْلُوَنِيْ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ۝﴾ ①

"یہ میرے رب کے فضل سے ہے، تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں اور جس نے شکر کیا تو وہ اپنے ہی لیے شکر کرتا ہے اور جس نے ناشکری کی تو یقیناً میرا ربّ بہت بے پروا، بہت کرم والا ہے۔"

سورۃ العنکبوت میں فرمایا:

﴿وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ②

"اور جو جہاد کرے وہ اپنے ہی لیے جہاد کرتا ہے، یقیناً اللہ تو سارے جہانوں سے بے پروا ہے۔"

اس لیے اگر کوئی نیک ہے تو اسی کو اس کا فائدہ پہنچے گا، اس میں اللہ کا کوئی فائدہ نہیں۔ اور اگر کوئی متمرد اور نافرمان ہے تو اس میں اللہ کا کوئی نقصان نہیں، اللہ سب سے بے پروا ہے۔ اس کی سلطنت تب بھی قائم تھی جب انسان عالمِ وجود میں آیا ہی نہیں تھا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث، جو سابقہ آیت کے تحت ذکر ہوئی ہے، میں بھی اس کا بیان ہے بلکہ ایک خطبہ میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جو اللہ

---

① النمل: 40 ② العنکبوت: 6 ③ ابو داود: 2119 وغیرہ

اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے گا۔

((فَقَدْ غَوٰی وَلَا یَضُرُّ إِلَّا نَفْسَهٗ وَلَا یَضُرُّ اللّٰهَ شَیْئًا)) ①

''بے شک وہ غلط راستے پر چلا اور وہ اپنا ہی نقصان کرے گا اللہ کا کچھ بھی نقصان نہیں کرے گا۔''

نافرمانیوں کے باوجود اسے یہاں مہلت میسر ہے تو یہ اس کی رحمت وحکمت کا نتیجہ ہے اللہ کے لیے ایسے نافرمانوں کی جگہ کسی اور کو لے آنا کچھ بھی مشکل نہیں۔

:: :: ::

① ابوداود : 2119 وغیرہ

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى وَإِن تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى إِنَّمَا تُنذِرُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَمَن تَزَكّٰى فَإِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهِ وَإِلَى اللّٰهِ الْمَصِيرُ﴾ (فاطر:١٨)

''اور کوئی بوجھ اٹھانے والی (جان) کسی دوسری کا بوجھ نہیں اٹھائے گی، اور اگر کوئی بوجھ سے لدی ہوئی (جان) اپنے بوجھ کی طرف بلائے گی تو اس میں سے کچھ بھی نہ اٹھایا جائے گا۔ خواہ وہ قرابت دار ہو، بے شک تو صرف ان کو ڈراتا ہے جو دیکھے بغیر اپنے ربّ سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو پاک ہوتا ہے تو وہ صرف اپنے لیے پاک ہوتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

اس آیتِ مبارکہ میں پہلے مضمون کی ایک اور نوعیت سے وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری عبادت واطاعت کا محتاج نہیں، تمھاری عبادت کیا، تمھیں بھی نیست ونابود کر دے اسے پھر بھی کوئی پروا و پچھتاوا نہیں۔ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کی ہلاکت کے حوالے سے فرمایا گیا ہے: ''ان کے رب نے انھیں ان کے گناہ کی وجہ سے پیس کر ہلاک کر دیا، پھر اس بستی کو برابر کر دیا اور وہ اس (سزا) کے انجام سے نہیں ڈرتا۔'' [1] اس لیے تم نافرمانی کرو یا گمراہی کی راہ اختیار کرو اس کا بوجھ تمھیں اٹھانا پڑے گا۔ کوئی اور تمہارا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ کفار تو اہلِ ایمان کو بدراہ کرنے کے لیے یہ جھانسا بھی دیتے تھے کہ اگر ہماری تابع داری میں تمھیں کوئی خطرہ ہے اور اسے تم

[1] الشمس: 15,14

گناہ سمجھتے ہو تو ہم اس کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ جیسے کوئی کہہ دیتا ہے تم جو چاہو کرو ''خونِ دو عالم میری گردن پر'' یہی بات کفار کہتے تھے:

﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَ لْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَ مَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۝﴾ [1]

''اور جن لوگوں نے کفر کیا انھوں نے ان لوگوں سے کہا جو ایمان لائے کہ تم ہمارے راستے پر چلو اور لازم ہے کہ ہم تمھارے گناہ اٹھا لیں، حالاں کہ وہ ہرگز ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی اٹھانے والے نہیں، بے شک وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔''

علامہ ابوحیان وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ ولید بن مغیرہ کہا کرتا تھا: 'اُكْفُرُوْا بِمُحَمَّدٍ وَعَلَيَّ وِزْرُكُمْ' تم محمد (ﷺ) کا انکار کردو، اس کا گناہ میرے ذمہ رہا۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ ہر ایک کو اپنا اپنا بوجھ ہی اٹھانا پڑے گا۔ جس طرح دنیا میں یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہاں ایک، دوسرے کی مدد کرتا ہے، اس کی ذمہ داری قبول کرلیتا ہے، یا اس کا سفارشی بن جاتا ہے، یا کسی اور حیلے بہانے سے مجرم کو چھڑوا لیتا ہے۔ شاید اسی طرح قیامت میں بھی کام بن جائے گا۔ مگر وہاں ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔

﴿وَ اتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۝﴾ [2]

''اور اس دن سے بچو جب نہ کوئی جان کسی جان کے کچھ کام آئے گی اور نہ اس سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ اسے کوئی سفارش نفع دے گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔''

---

[1] العنکبوت: 12 [2] البقرۃ: 123

﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَ اخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۫ وَ لَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْئًا ط﴾ ①

"اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو اور اس دن سے ڈرو کہ نہ باپ اپنے بیٹے کے کام آئے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی ایسا ہوگا جو اپنے باپ کے کسی کام آنے والا ہو۔"

﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ٥ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِيْهِ ٥ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِيْهِ ٥ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ٥﴾ ②

"جس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا، اور اپنی ماں اور باپ (سے) اور اپنی بیوی اور بیٹوں سے، اس دن ان میں سے ہر ایک کی ایسی حالت ہوگی جو اسے (دوسروں سے) بے پروا بنا دے گی۔"

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ باپ اپنے بیٹے سے کہے گا کہ تم جانتے ہو کہ میں تیرا کیسا شفیق باپ تھا۔ وہ اقرار کرے گا کہ آپ کے بڑے احسانات ہیں، باپ کہے گا بیٹا! آج مجھے مثقال ذرّہ کے برابر نیکی چاہیے۔ میری اس سے نجات ہوجائے گی۔ بیٹا کہے گا! ابا حضور آپ نے بہت تھوڑی چیز طلب کی، اگر میں وہ آپ کو دے دوں تو مجھے ڈر ہے کہ میرا بھی یہی حال ہوجائے گا، جس سے آپ خوف زدہ ہیں، اس لیے میں آپ کو کچھ نہیں دے سکتا۔ پھر وہ اپنی بیوی سے یہی کچھ کہے گا، تو بیوی بھی وہی جواب دے گی، جو بیٹے نے دیا تھا۔ ③

حضرت عمرو بن احوص فرماتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

'لَا يَجْنِيْ جَانٍ اِلَّا عَلٰى نَفْسِهٖ، لَا يَجْنِيْ وَالِدٌ عَلٰى وَلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ عَلٰى وَالِدِهٖ' ④

①لقمان : 33 ② عبس : 34-37 ③ ابن ابی حاتم ،عبد بن حمید، الدرالمنثور: 248/5

④ترمذی،ابو داود وغیرہ

''جو بھی گناہ کرے گا اس کا بوجھ اسی پر ہوگا، باپ اپنا گناہ بیٹے پر، اور بیٹا اپنے باپ پر نہیں رکھے گا۔''

یعنی کوئی بھی کسی دوسرے کا گناہ اپنے سر پر لے کر اس کو بچا نہیں سکے گا۔ شفاعت کا مسئلہ اس سے علیحدہ ہے۔ اور وہ بھی وہی کرے گا جس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ شفاعت کی اجازت دے گا۔

ایک اور مقام پر اسی حقیقت کو یوں بیان فرمایا:

﴿وَ لَا يَسْئَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۝ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ؕ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ ۝ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ اَخِيْهِ ۝ وَ فَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۝ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۝﴾ [1]

''اور کوئی دلی دوست کسی دلی دوست کو نہیں پوچھے گا، حالاں کہ وہ انھیں دکھائے جا رہے ہوں گے، مجرم چاہے گا، کاش کہ اس دن کے عذاب سے (بچنے کے لیے) فدیہ میں دے دے اپنے بیٹوں کو اور اپنی بیوی اور اپنے بھائی کو، اور اپنے خاندان کو، جو اسے جگہ دیا کرتا تھا۔ اور ان تمام لوگوں کو جو زمین میں ہیں، پھر اپنے آپ کو بچا لے۔''

ہرگز ایسا نہیں ہوگا کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور بلانے اور مدد کے لیے پکارنے کے باوجود کوئی اس کی طرف نظرِ التفات نہیں کرے گا اگرچہ کوئی کتنا ہی قریبی کیوں نہ ہو۔ یہ کفار آج تو کہتے ہیں کہ ہم بوجھ اٹھا لیں گے، مگر قیامت کے روز معاملہ اس کے برعکس ہوگا جو دوسروں کو گمراہ کرتے رہے ان کا جرم دگنا ہے۔ اس لیے انھیں تو اپنی گمراہی کے ساتھ ساتھ دوسروں کو گمراہ کرنے کا بوجھ بھی اٹھانا پڑے گا:

﴿لِيَحْمِلُوْۤا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَ مِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝﴾ [2]

① المعارج: 10-14 ② النحل: 25

”تاکہ وہ قیامت کے دن اپنے بوجھ پورے اٹھائیں اور کچھ بوجھ ان کے بھی جنھیں وہ علم کے بغیر گمراہ کرتے ہیں۔ سن لو! برا ہے جو بوجھ وہ اٹھا رہے ہیں۔“

یہی بات اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سورۃ العنکبوت [1] میں بھی فرمائی ہے۔ دوسروں کو گمراہ کرنے کا گناہ بھی ان کا ہے۔ اس لیے اس کا بوجھ بھی وہ اٹھائیں گے۔ جیسا کہ حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً كَانَ لَهُ اَجْرُهَا وَاَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ غَيْرِ اَنْ يُنْقَصَ مِنْ اَجْرِهِ شَيْءٌ، وَمَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ لَهُ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا)) [2]

”جس نے اچھا طریقہ جاری کیا اسے اس کا اجر ملے گا اور ان لوگوں کا بھی اجر ملے گا جو اس پر عمل کریں گے۔ بدون اس کے کہ ان کے اجر میں کسی قسم کی کمی ہو اور جس نے برا طریقہ جاری کیا اس پر اس کا بوجھ ہوگا اور ان لوگوں کا بھی جو اس پر عمل کریں گے۔“

صحیح مسلم ہی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ دَعَا اِلٰى هُدًى كَانَ لَهُ مِنَ الْاَجْرِ مِثْلُ اُجُوْرِ مَنْ تَبِعَهُ، وَلَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَيْئًا، وَمَنْ دَعَا اِلٰى ضَلَالَةٍ فَاِنَّ عَلَيْهِ مِنَ الْاِثْمِ مِثْلَ آثَامِ مَنْ تَبِعَهُ لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ آثَامِهِمْ شَيْئًا)) [3]

”جو ہدایت کی طرف بلاتا ہے اسے اتنا اجر ملتا ہے، جتنا اجر اس کی پیروی کرنے والوں کو ملتا ہے، اور اس سے پیروی کرنے والوں کا کوئی اجر کم

---

[1] العنکبوت:13 [2] مسلم : 1017 [3] مسلم :2674

نہیں ہوتا۔ اور جو گمراہی کی طرف بلاتا ہے تو اس پر اتنا گناہ ہے، جتنا گناہ اس کی پیروی کرنے والوں پر ہے۔ اور اس سے پیروی کرنے والوں کا کوئی گناہ کم نہیں ہوگا۔“

تمام حسنات اور ہدایت کی اصل دعوت رسول اللہ ﷺ کی ہے اس لیے تمام امت کی حسنات کا اجر آپ ﷺ کو مسلسل مل رہا ہے۔

اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بھی فرمایا ہے:

﴿مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ﴾ ①

”جو کوئی سفارش کرے گا، اچھی سفارش، اس کے لیے اس میں سے ایک حصہ ہوگا اور جو کوئی سفارش کرے گا، بری سفارش اس کے لیے اس میں سے ایک بوجھ ہوگا۔“

لہٰذا جیسے اچھی سفارش اجر وثواب کا باعث ہے اسی طرح اچھے عمل کی ابتدا کرنے والے کو ان کا بھی اجر ملے گا جو اس پر عمل کریں گے اور جو برائی کی ایجاد کرتا ہے تو اس پر ان لوگوں کا بھی بوجھ ہوگا جو اسے اختیار کریں گے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تُقْتَلُ نَفْسٌ ظُلْمًا اِلَّا كَانَ عَلَى ابْنِ آدَمَ الْاَوَّلِ كِفْلٌ مِنْ دَمِهَا لِاَنَّهٗ اَوَّلُ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ)) ②

”جو بھی ظلماً قتل کیا جائے گا اس کے خون کا حصہ آدم علیہ السلام کے بیٹے پر ہوگا۔ کیوں کہ سب سے پہلے اس نے قتل کیا ہے۔“

اس لیے جو برائی کا موجد ہے اس کی پیروی کرنے والوں کا کچھ بوجھ اس موجد پر بھی ہوگا۔ اور یہ ﴿لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ کے منافی نہیں۔ یوں تو

① النساء: 85 ② بخاری: 3335

نہیں کہ وہ موجد، پیروی کرنے والوں کے گناہ اٹھا لے گا بلکہ ''کچھ بوجھ'' ان کے بھی اٹھا لے گا جو اس کی پیروی کریں گے، لیکن پیروی کرنے والوں کے بوجھ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔

﴿اِنَّمَا تُنۡذِرُ الَّذِيۡنَ يَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ﴾ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی اور حوصلہ افزائی ہے کہ آپ نے دلائل و براھین سے انھیں سمجھانے میں کوئی کمی نہیں کی، آپ کی تمام تر دلسوزیوں اور بے قراریوں اور شب و روز دعوتِ حق کے باوجود اگر یہ راہِ ہدایت پر نہیں آتے تو آپ فکر مند نہ ہوں ان کے نصیب ہی میں ہدایت نہیں، دراصل آپ کا ڈرانا انہی لوگوں کے لیے فائدہ مند ہے جو اپنے ربّ سے ڈرتے ہیں۔ سورۂ یٰس میں ہے:

﴿وَ سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ۝ اِنَّمَا تُنۡذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكۡرَ وَ خَشِىَ الرَّحۡمٰنَ بِالۡغَيۡبِ‌ۚ فَبَشِّرۡهُ بِمَغۡفِرَةٍ وَّ اَجۡرٍ كَرِيۡمٍ ۝﴾ [1]

''اور ان پر برابر ہے کہ خواہ تو انھیں ڈرائے، یا انھیں نہ ڈرائے، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ تو، تو صرف اسی کو ڈراتا ہے جو نصیحت کی پیروی کرے اور رحمان سے بن دیکھے ڈرے۔ سو اسے بڑی بخشش اور با عزت اجر کی خوش خبری دے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرُ مَنۡ يَّخۡشٰهَا ۝﴾ [2]

''تو، تو صرف اسے ڈرانے والا ہے جو اس سے ڈرتا ہے۔''

﴿بِالۡغَيۡبِ﴾ دیکھے بغیر اللہ سے، اس کے عذاب سے ڈرتا ہے اور تنہائیوں میں اس کے دل پر اللہ کا ڈر سمایا رہتا ہے۔ سورۃ المائدہ [3] میں ہے:

[1] یٰس : 11,10 [2] النّٰزعٰت : 45 [3] المائدہ : 94

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! یقیناً اللہ تمھیں شکار میں سے کسی چیز کے ساتھ ضرور آزمائے گا جس پر تمھارے ہاتھ اور نیزے پہنچتے ہوں گے تا کہ اللہ جان لے کہ کون اس سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔“

اس حوالے سے سورۂ ق کی آیت نمبر ۳۳، ۴۵ کے تحت جو کچھ ہم لکھ چکے ہیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

﴿وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ﴾ یہ اوّلین تقاضا ہے کہ اللہ سے جو غیب میں ڈرتا ہے وہ نماز کا اہتمام کرتا ہے، جو نماز سے بے پروا ہے وہ اللہ سے نہیں ڈرتا۔ اگرچہ وہ زبانی ڈرنے کا کتنا ہی دعویٰ کرے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ کے فرمان ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ سے وہ لوگ مراد ہیں جو چوری کرتے، زنا کرتے اور شراب پیتے ہیں اور وہ اللہ سے بھی ڈرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا:

((لَا يَابِنْتَ الصِّدِّيْقِ، وَلٰكِنَّهُ الَّذِيْ يُصَلِّيْ وَيَصُوْمُ وَيَتَصَدَّقُ وَهُوَ يَخَافُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ)) ②

”نہیں اے ابوبکر صدیق کی بیٹی! بلکہ وہ مراد ہے جو نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے، صدقہ کرتا ہے اور اللہ جل جلالہٗ سے ڈرتا ہے۔“

اس لیے خالی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا دعویٰ محض زبانی جمع خرچ ہے۔ یہاں ﴿الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ﴾ بمنزلہ ایمان کے ہے اور ”نماز“ میں عملِ صالح کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کا ڈرانا انھی کے لیے مفید ہے، جن کے دل اللہ کی خشیت سے لبریز اور عملِ صالح کے زیور سے آراستہ ہیں۔

﴿وَ مَنْ تَزَكّٰى﴾ جو پاک ہوتا ہے، شرک سے، فواحش سے، معاصی سے اور

① ترمذی: 3175، مسند احمد: 6/159ـ205

نیک عمل کا اہتمام کرنا چاہتا ہے تو اس کا اوّلین ذریعہ نماز ہے، جو فواحش و منکرات سے بچاتی ہے، توحید پر قائم رکھتی ہے اور عملِ صالح کے لیے راستہ ہموار کرتی ہے۔

اور ''جو پاک ہوا وہ اپنے لیے پاک ہوا''، اس کا فائدہ اور اجر اسی کو ملے گا۔ جیسے گناہ کا بوجھ گناہگار پر ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝﴾ ①

''بے شک وہ کامیاب ہوگیا جو پاک ہوگیا۔ اور اس نے اپنے ربّ کا نام یاد کیا، پس نماز پڑھی۔''

یعنی شرک وکفر اور معصیت کو چھوڑ کر ایمان کی راہ اختیار کرلی، اللہ کو یاد کیا اور نماز کا اہتمام کیا۔ اسی طرح فرمایا:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝﴾ ②

''یقیناً وہ کامیاب ہوگیا، جس نے اسے پاک کرلیا۔ اور یقیناً وہ نامراد ہوگیا جس نے اسے مٹی میں دبا دیا۔''

اس آیت میں دو احتمال ہیں ایک تو وہی جو سورۃ الاعلیٰ اور سورہ الشّمس میں بیان ہوا ہے۔ کہ وہ کامیاب ہوگیا، جس نے اللہ کی معصیت سے بچ کر اطاعت کی راہ اختیار کی اور جس نے نافرمانی کی راہ لی وہ معصیت میں دب کے رہ گیا۔

دوسرا یہ کہ وہ فلاح پا گیا، جس کو اللہ نے پاک کردیا چنانچہ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ دعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سکھلاتے تھے اور ہم تمہیں یہ سکھلاتے ہیں:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسْلِ وَالْهَرَمِ وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ، اَللّٰهُمَّ آتِ نَفْسِیْ تَقْوَاهَا، وَزَكِّهَا اَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكّٰهَا، اَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا، اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ

① الاعلیٰ: 15,14 ② الشمس: 10,9

قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ، وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ، وَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ، وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا يُسْتَجَابُ لَهَا)) ①

''اے اللہ! میں آپ کی پناہ طلب کرتا ہوں عاجز آ جانے سے، سستی سے، بڑھاپے سے، بزدلی سے، بخل سے اور عذابِ قبر سے، اے اللہ! میرے نفس کو اس کا تقویٰ دے اور اسے پاک کر دے، بے شک تو بہتر، پاک کرنے والا ہے،تو ہی اس کا ولی اور مولا ہے۔ اے اللہ! میں آپ کی پناہ طلب کرتا ہوں، ایسے دل سے جو ڈرتا نہ ہو، ایسے نفس سے، جو بھرتا نہ ہو، اور ایسے علم سے، جو نفع نہ دے اور ایسی دعا سے، جو قبول نہ ہو۔''

اور اس آیت میں یہ دونوں احتمال ہیں۔

﴿وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ﴾ ''اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کے جانا ہے۔'' یہاں کسی نے نہیں رہنا، سب نے اللہ کے ہاں پہنچنا ہے۔ اگر تزکیہ کا یہاں کسی کو فائدہ نہیں پہنچتا تو اللہ کے ہاں وہ اسے پا لے گا۔ اسی طرح معصیت کی زندگی پر کسی کی باز پرس یہاں نہیں تو اللہ کے ہاں اس کا حساب یقیناً چکانا پڑے گا۔ وہ یہ مت سمجھے کہ میں یہاں ٹھاٹھ کی زندگی گزار رہا ہوں اور اگر قیامت آئی تو میں وہاں بھی باعزت رہوں گا ہرگز ایسا نہیں ہوگا اللہ کے ہاں عزت ایمان اور عمل صالح سے ہے۔ اللہ کے ہاں پہنچ کر اس کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ یہی مضمون سورۃ الزمر میں یوں بیان ہوا ہے:

﴿اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۫ وَ لَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَ اِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ؕ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۝﴾ ②

① مسلم، احمد ② الزمر: 7

"اگر تم ناشکری کرو تو یقیناً اللہ تم سے بہت بے پروا ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر کرو تو وہ اسے تمہارے لیے پسند کرے گا اور کوئی بوجھ اٹھانے والی (جان) کسی دوسری کا بوجھ نہیں اٹھائے گی، پھر تمہارا لوٹنا تمہارے ربّ ہی کی طرف ہے تو وہ تمہیں بتلائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے۔ یقیناً وہ سینوں والی بات کو خوب جاننے والا ہے۔"

غور فرمائیے یہاں فرمایا ہے کہ "اللہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری پسند نہیں کرتا۔" عربی زبان میں 'لَا اَرْضٰی مِنْكَ هٰكَذَا' میں تم سے یوں راضی نہیں بلکہ یوں راضی ہوں تو اس میں متکلم کا فائدہ مطلوب ہوتا ہے۔ لیکن جب مخاطب کو فائدہ پہنچانا مقصود ہوتا ہے تو کہتے ہیں "لَا اَرْضٰی لَكَ كَذَا" میں تمہارے لیے یوں راضی نہیں، یا میں تمہارے لیے یہ پسند نہیں کرتا بلکہ یہ پسند کرتا ہوں۔ یہاں بھی ﴿لَا یَرْضٰی لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ﴾ فرمایا ہے کہ وہ اپنے بندوں کے لیے کفر پسند نہیں کرتا۔ لہٰذا تم کفر کی راہ اختیار کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ تمہارے کفر سے اللہ کا کوئی نقصان نہیں تمہارا ہی نقصان ہے۔ اسی طرح وہ تمہارے لیے شکر پسند کرتا ہے کہ یہی تمہاری نجات کی راہ ہے۔ تمہارے شکر سے اللہ کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہر ایک نے اللہ کے ہاں حاضر ہو کر اپنے عمل کا بدلہ پانا ہے۔

﴿وَ مَا يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ o وَ لَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ o وَ لَا الظِّلُّ وَ لَا الْحَرُوْرُ o وَ مَا يَسْتَوِى الْاَحْيَآءُ وَ لَا الْاَمْوَاتُ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ وَ مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ o اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ o﴾(فاطر: ۱۹-۲۳)

''اور اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں، اور نہ اندھیرے اور نہ روشنی، اور نہ سایہ اور نہ دھوپ۔ اور نہ زندے برابر ہیں اور نہ مردے۔ بے شک اللہ سنا دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تو ہرگز اسے سنانے والا نہیں جو قبروں میں ہے۔تو تو محض ایک ڈرانے والا ہے۔''

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ''تم صرف ان کو ڈراتے ہو جو اللہ سے ڈرتے اور نماز قائم کرتے ہیں۔'' جس میں حقیقتِ واقعی کے ساتھ آپ کو تسلی دی گئی ہے۔ یہاں ڈرنے اور نہ ڈرنے والوں کی مزید تفصیل ہے۔ چنانچہ ایک حقیقت کو ایک مثال سے یوں واضح کیا گیا ہے۔ کہ یہ ڈرنے والے ایماندار اور نہ ڈرنے والے کافر، ان کو یوں سمجھو کہ اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں، اسی طرح مومن اور کافر برابر نہیں۔ دونوں کے اس فرق کی طرف اشارہ سورۂ ہود میں یوں بیان فرمایا گیا ہے:

﴿مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَ الْاَصَمِّ وَ الْبَصِيْرِ وَ السَّمِيْعِ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ o﴾ ①

''دونوں گروہوں کی مثال اندھے اور بہرے اور دیکھنے والے اور سننے

① ھود: 24

والے کی طرح ہے، کیا یہ دونوں مثال میں برابر ہیں،تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔''

یہاں بھی بصیر، نور، ظل اور احیاء سے مومن مراد ہیں اور اعمی، ظلمات، حرور اور اموات سے کفار مراد ہیں۔ جیسے یہ مختلف اور متباین اشیاء باہم برابر نہیں ان میں فرق بالکل ظاہر ہے۔ اسی طرح مومن اور کافر برابر نہیں، مومن اللہ کی آیات سنتا اور ان پر کان دھرتا ہے، اور نورِ ہدایت دیکھ کر اس کی تابعداری کرتا ہے۔ جبکہ کافر اندھا بہرا ہے اندھیرے میں سرگرداں ہے۔ جیسے ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾[1]

''اور کیا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لیے ایسی روشنی بنا دی جس کی مدد سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، اس شخص کی طرح ہے جس کا حال یہ ہے کہ وہ اندھیروں میں ہے، ان سے کسی صورت نکلنے والا نہیں، اسی طرح کافروں کے لیے وہ عمل خوش نما بنا دیے گئے جو وہ کیا کرتے تھے۔''

یہاں بھی 'مَیْتًا' سے مراد کافر ہے جسے نورِ ایمان سے بہرور فرما دیا گیا۔ اسی ایمان کو ''فَاَحْيَيْنٰهُ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور ''ظلمٰت'' سے مراد کفر کے اندھیرے ہیں اسی طرح سورۃ النمل میں ہے:

﴿اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝﴾[2]

---

[1] الانعام: 122 [2] النمل: 81,80

''بے شک تو نہ مردوں کو سناتا ہے اور نہ بہروں کو اپنی پکار سناتا ہے، جب وہ پیٹھ پھیر کر پلٹ جائیں، اور نہ تو کبھی اندھوں کو ان کی گمراہی سے راہ پر لانے والا ہے، تو نہیں سنائے گا مگر انہی کو جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں، پھر وہ فرماں بردار ہیں۔''

بالکل یہی بات سورۃ الروم میں بھی فرمائی ہے۔ ①

جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس تمثیل سے مراد مومن اور کافر کے مابین فرق بیان کرنا ہے اور ساتھ رسول اللہ ﷺ کو تسلی بھی ہے کہ آپ کی دعوت کو اگر یہ قبول نہیں کرتے تو اس کا سبب یہ ہے ان میں قبولیت کی استطاعت ہی نہیں۔

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ وَ عَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ ②

''اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی، اور ان کی نگاہوں پر ایک پردہ ہے۔''

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ ③

''ان کے دل ہیں جن کے ساتھ وہ سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں جن کے ساتھ وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن کے ساتھ وہ سنتے نہیں، یہ لوگ چوپاؤں جیسے ہیں، بلکہ یہ (ان سے) زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔''

چوپائے کلام نہ سمجھنے کے باوجود مالک کی اطاعت کرتے ہیں مگر یہ کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہیں یا یہ کہ چوپائے اپنی طبعی فطرت کے مطابق عمل کرتے ہیں برعکس کفار کے کہ اللہ نے انہیں اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے مگر یہ اللہ کی ناشکری کرتے ہیں اور شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ انہی کے بارے میں فرمایا ہے:

① الروم 53,52 ② البقرۃ : 7 ③ الاعراف : 179

﴿وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَةً فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَآ اَبْصَارُهُمْ وَ لَآ اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِذْ كَانُوْا یَجْحَدُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ۝﴾ ①

''اور ہم نے ان کے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تو نہ ان کے کان ان کے کسی کام آئے اور نہ ان کی آنکھیں اور نہ ان کے دل، کیوں کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور انہیں اس چیز نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔''

انہی کے بارے میں فرمایا:

﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ۝﴾ ②

''پس بے شک قصہ یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں اور لیکن دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔''

یہ اور اس موضوع کی دیگر آیات سے یہی معلوم ہوتا ہے، یہاں مومن اور کافر کے مابین فرق بیان ہوا ہے۔ زندہ وہی ہے جس کا دل اللہ کی یاد سے زندہ ہے اور مردہ وہ ہے جو کافر ہے اور اللہ کی یاد سے غافل ہے۔

مومن، بصیر اور بینا ہے جو انفسی و آفاقی دلائل کو کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ کائنات کی ایک ایک چیز بلکہ خود اس کا وجود اللہ کی توحید کی بین دلیل ہے۔ جب کہ کافر کی آنکھیں ان کو دیکھنے سے عاری ہیں۔

مومن، روشنی اور نور ہے جو کتاب وسنت کے نور سے منور ہے اور دوسروں کے

---

① الاحقاف: 26 ② الحج: 46

لیے بھی روشنی کا باعث ہے۔ جب کہ کافر، گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے، خود ہی گم گشتہ راہ ہے دوسروں کی راہنمائی کیا کرے گا۔

مومن، ٹھنڈی چھاؤں ہے۔ اس کے پاس بیٹھنے سے راحت واطمینان نصیب ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ محبت کا پیکر ہے۔ جب کہ کافر تپش اور تپتی دھوپ ہے۔ جس سے تکلیف پہنچتی ہے۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ بالآخر مومن جنت کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہوگا اور کافر جہنم کی تپش میں جھلسنے والا ہوگا۔ اسی طرح مومن زندہ ہے اس میں ادراک وشعور ہے مگر کافر مردہ ہے جو شعور سے محروم ہے۔

جس طرح قبروں میں مردوں کو آپ نہیں سنا سکتے اسی طرح جن کے دل مردہ ہیں ان کو بھی آپ سنا اور سمجھا نہیں سکتے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ یُسْمِعُ مَنْ یَّشَآءُ﴾ اللہ جسے چاہتا ہے سنا دیتا ہے۔ اللہ چاہے تو پتھروں کو سنا دے مگر آپ کے اختیار میں نہیں کہ قبروں میں پڑے ہوؤں کو آپ سنا دیں۔ آپ کا کام زندوں کو سنانا ہے مردوں کو جگانا اور سنانا آپ کی ذمہ داری نہیں۔ ان مردہ دلوں سے امید کی کوئی رمق ہوتی تو انہیں سنا دیا جاتا۔

﴿وَ لَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِیْهِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَ لَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ۝﴾ [1]

''اور اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا تو انہیں ضرور سنوا دیتا اور اگر وہ انہیں سنوا دیتا تو بھی وہ منہ پھیر جاتے، اس حال میں کہ وہ بے رخی کرنے والے ہوتے۔''

اس لیے آپ ﷺ کو ان کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔

﴿اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِیْرٌ﴾ آپ کی ذمہ داری یہ ہے کہ لوگوں کو نافرمانی کے نتیجے سے خبردار کر دیں۔ آپ کی یہ ذمہ داری تو نہیں کہ آپ لوگوں سے منوائیں اور

---

[1] الانفال: 23

تسلیم کروائیں۔

﴿فَذَكِّرْ ۗ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝﴾ ①

''پس تو نصیحت کر، تو صرف نصیحت کرنے والا ہے، تو ہرگز ان پر کوئی مسلط کیا ہوا نہیں ہے۔''

آپ کا کام خبردار کرنا اور نصیحت کرنا ہے منوانا اور ہدایت دینا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔

مسئلۂ سماعِ موتی:

یہاں ﴿وَ مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ﴾ میں فرمایا گیا ہے کہ ''آپ ہرگز انہیں سنانے والے نہیں جو قبروں میں ہیں'' اسی طرح سورۃ النمل اور الروم میں فرمایا ہے کہ ﴿اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى﴾ آپ مردوں کو نہیں سناتے۔ ان آیات کا مصداق کفار ہیں اور یہاں سنانے سے مراد وہ سنانا ہے جو مفید اور نافع ہو۔ اسی سے بعض حضرات نے سمجھا ہے کہ ان آیات میں قبروں میں دفن ہونے والوں، اور فوت ہوجانے والوں سے سماع کی نفی نہیں۔ بلکہ خاص اسماعِ نافع کی نفی ہے کہ جیسے آپ مردوں کو کلام سنا کر راہِ راست پر نہیں لاسکتے اسی طرح کفار کو بھی راہِ راست پر نہیں لاسکتے۔ مگر یہ موقف درست نہیں۔ کیوں کہ زندگی کے بعد موت ہے اور زندہ اور مردہ انسان برابر نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا ہے کہ اللہ جسے چاہے سنا دے، وہ مردہ ہو یا بت ہو یا پتھر ہو۔ کیوں کہ یہ بالفعل نہیں سنتے اللہ چاہے تو سنا دے مگر آپ قبروں والوں کو ہرگز سنانے والے نہیں۔ اس میں میت سے سماع کی نفی ہے۔ سویا ہوا انسان اپنے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کی باتیں نہیں سنتا، کیوں کہ وہ عالمِ خواب میں ہے تو عالمِ برزخ میں چلے جانے والے اہلِ دنیا کی بات کیوں کر سن سکتے ہیں؟

اس لیے میت سے سماع کی نفی کرکے کفار کو ان سے تشبیہ دی گئی ہے۔ مشبہ بہ

① الغاشیۃ: 22,21

میں وجہ شبہ اتم ہوتی ہے اور تشبیہ میں ناقص کو من وجہ کامل کے ساتھ ملانا مقصود ہوتا ہے۔ اس لیے میت تو بالفعل سنتی نہیں اور کفار بھی نہیں سنتے کہ ان میں سمع نافع نہیں صرف آواز سنتے ہیں جس کا کوئی فائدہ نہیں۔ جیسے کہا جائے کہ فلاں شیر کی طرح ہے تو یہاں اس آدمی کو شیر کی بہادری سے تشبیہ دی گئی کہ کامل شجاعت اور بہادری تو شیر کی ہے۔ اسی طرح کفار کو عدمِ سماع کے لیے مُردوں سے تشبیہ دی ہے تو کامل نفی مُردوں سے سماع کی ہے جیسے وہ نہیں سنتے اسی طرح کفار بھی نہیں سنتے، یہ صرف آواز سنتے ہیں جس کا کوئی فائدہ انہیں حاصل نہیں ہوتا۔

مزید غور کیجیے کہ جیسے میت سے سماع کی نفی ہے بعد کی آیت میں بہروں سے سماع کی نفی ہے کہ ﴿وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ﴾ ''اور نہ تو بہروں کو اپنی پکار سناتا ہے جب وہ پیٹھ پھیر کر پلٹ جائیں۔'' یہاں بھی بہروں سے سماع کی نفی ہے۔ میت کی طرح بہرا بھی نہیں سنتا۔ یوں نہیں کہ بہرا سنتا ہے مگر سماعِ نافع نہیں سنتا۔ بہرے میں سماع کی کامل نفی ہے اور اُس سے کافر کو تشبیہ دی ہے کہ وہ بھی نہیں سنتا، مگر کافر کا نہ سننا سماعِ نافع مراد ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

وقوله ﴿وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ﴾ یَقُوْلُ كَمَا لَا تَقْدِرُ أَنْ تُسْمِعَ الصُّمَّ الَّذِیْنَ قَدْ سُلِبُوا السَّمْعَ الدُّعَاءَ اِذَاهُمْ وَلَّوْا عَنْكَ مُدْبِرِیْنَ، كَذٰلِكَ لَا تَقْدِرُ اَنْ تُوَفِّقَ هٰؤُلَاءِ الَّذِیْنَ قَدْ سَلَبَهُمُ اللّٰهُ فَهْمَ آیَاتِ كِتَابِهٖ لِسِمَاعِ ذٰلِكَ وَفَهْمِهٖ، [1]

''اللہ تعالیٰ کے فرمان: کہ ''تم بہرے کو اپنی پکار نہیں سناتے'' سے یہ مراد ہے کہ جیسے آپ بہروں کو جب وہ منہ موڑ کر چلے جائیں جن کی سماعت سلب کر لی گئی ہے، سنانے پر قادر نہیں اسی طرح ان کفار کو بھی، جن سے

[1] ابن جریر: 56/21

اللہ نے اپنی کتاب کی آیات کا فہم سلب کرلیا ہے، اس کے سننے اور سمجھنے کی قدرت نہیں دے سکتے۔"

امام ابن جریر نے یہاں بہروں سے مطلق سماع کی نفی کا ذکر کیا ہے، سماعِ نافع کا یہاں تو تصور ہی نہیں، بالکل اسی طرح پہلے جملے میں بھی میت سے مطلق سماع کی نفی مراد ہے۔ امام ابن جریر نے اس کی تائید میں امام قتادہ کا قول ذکر کیا ہے کہ

((هٰذَا مَثَلٌ ضَرَبَهُ اللّٰهُ لِلْكَافِرِ، فَكَمَا لَا يَسْمَعُ الْمَيِّتُ الدُّعَاءَ كَذٰلِكَ لَا يَسْمَعُ الْكَافِرُ، ﴿وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ﴾ يَقُوْلُ: لَوْ اَنَّ اَصَمَّ وَلّٰى مُدْبِراً ثُمَّ نَادَيْتَهُ لَمْ يَسْمَعْ، كَذٰلِكَ الْكَافِرُ لَا يَسْمَعُ وَلَا يَنْتَفِعُ بِمَا سَمِعَ)) [1]

"اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ کافر کی مثال دی ہے کہ جیسے میت پکار نہیں سنتی اسی طرح کافر نہیں سنتا اور ﴿وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ﴾ میں فرمایا: اگر بہرا پیٹھ پھیر کر پلٹ جائے پھر تم اسے آواز دو تو وہ نہیں سنتا۔ اسی طرح کافر نہیں سنتا اور جو سنتا ہے اس کا اسے فائدہ نہیں ہوتا۔"

امام ابن جریر رحمہ اللہ اور امام قتادہ رحمہ اللہ کی اس وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ میت اور بہرے سے مطلقاً سماع کی نفی ہے ان سے کافر کو تشبیہ دی گئی ہے اور اس سے سماعِ نافع کی نفی مراد ہے۔ ان آیات سے میت کے سماع کی نفی سیّدہ صدیقۂ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی سمجھی ہے۔ جیسا کہ بخاری شریف اور دیگر احادیث کی کتابوں میں ہے: اللہ تعالیٰ تو جسے چاہیں سنا دیں۔ احادیث میں جزواً بعض مواقع پر میت کے سننے کا ذکر آیا ہے۔ وہ اپنے محل پر درست ہے لیکن ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ میت ہر وقت ہر بات سنتی ہے۔ آیت کی مناسبت سے یہ مختصراً وضاحت ہم نے کی ہے۔ سماعِ موتی کی تفصیل ہمارا موضوع نہیں۔

---

[1] ایضاً

﴿اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰكَ بِالۡحَقِّ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا وَّ اِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيۡهَا نَذِيۡرٌ۝﴾ (فاطر:٢٤)

''بے شک ہم نے تجھے حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت نہیں مگر اس میں ایک ڈرانے والا گزرا ہے۔''

اس آیت میں بھی رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی گئی ہے اور آپ کے فرضِ منصبی کی وضاحت ہے کہ آپ کا فریضہ اور آپ کی ذمہ داری یہ ہے کہ آپ ''بشیر ونذیر'' ہیں۔ یہ ذمہ داری آپ پر نہیں کہ لوگوں سے منوائیں اور ان سے حق تسلیم کروائیں۔

﴿اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰكَ بِالۡحَقِّ﴾ ہم نے تمہیں دلائلِ حقہ کے ساتھ بھیجا ہے یا یوں کہ آپ نے خود بخود رسول ہونے اور نذیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، بلکہ فی الواقع ہم نے آپ کو رسول بنایا ہے۔ اور رسول بھی ''بشیر ونذیر''۔ کہ جو دعوت قبول کرے گا اور اطاعت وفرماں برداری کرے گا اس کے لیے آپ بشیر ہیں، اور جو انکار کر دے گا اور نافرمانی کی راہ اختیار کرے گا اس کے لیے نذیر ہیں۔

''بشیر'' خوش کن خبر دینے والا، ایسی خبر دینے والا جس سے سننے والے کے چہرے سے انبساط ظاہر ہو، اور شدتِ فرحت سے سننے والے کا چہرا تمتما اٹھے۔

﴿فَبَشِّرۡ عِبَادِ۝الَّذِيۡنَ يَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ فَيَتَّبِعُوۡنَ اَحۡسَنَهٗ﴾ ①

''میرے بندوں کو بشارت دے دے، جو کان لگا کر بات سنتے ہیں، پھر اس میں سب سے اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں۔''

﴿وَ بَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ بِاَنَّ لَهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ فَضۡلًا كَبِيۡرًا۝﴾ ②

① الزمر: 18,17 ② الاحزاب: 47

’’ایمان والوں کو خوشخبری دے کہ بے شک ان کے لیے اللہ کی طرف سے بہت بڑا فضل ہے۔‘‘

اسی طرح بُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ، بُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ، وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِیْنَ کے الفاظ قرآن میں آئے ہیں۔ امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ لغوی اعتبار سے بشارت کے معنی ایسی خبر جو چہرے کو متاثر کرے اور اس کی کیفیت بدل دے۔ اس لحاظ سے غم واندوہ کی بات بھی چہرے کو متاثر کرتی اس لیے غم پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔علامہ الزبیدی رحمہ اللہ بھی فرماتے ہیں: ’اَلتَّبْشِیْرُ یَکُوْنُ بِالْخَیْرِ وَالشَّرِّ‘ کہ تبشیر کا اطلاق خیر وشر دونوں پر ہوتا ہے۔[1]

چنانچہ قرآنِ مجید میں ہے:

﴿وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۝﴾[2]

’’اور جنھوں نے کفر کیا انھیں درد ناک عذاب کی بشارت دے دے۔‘‘

اسی طرح جو سیم وزر جمع کرتے ہیں اور ان کی زکاۃ نہیں دیتے ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ

﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ﴾[3]

’’تو انھیں دردناک عذاب کی خوش خبری دے دے۔‘‘

منافقوں کے بارے میں بھی فرمایا گیا ہے کہ

﴿بَشِّرِ الْمُنٰفِقِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا﴾[4]

’’منافقوں کو خوش خبری دے دے کہ بے شک ان کے لیے ایک درد ناک عذاب ہے۔‘‘

﴿نَذِیْرٌ﴾ بمعنی ’مُنْذِرٌ‘ ڈرانے والا، ہر اس چیز سے ڈرانے والا جس میں

---

[1] [2] تاج العروس: 45/3 [3] التوبۃ: 3 [4] التوبۃ: 34 [5] النساء: 138

خوف وخطر پایا جائے۔ خواہ وہ انسان ہو یا کوئی اور چیز۔ رسول اللہ ﷺ اللہ ذو الجلال والاکرام کی نافرمانی سے اور اس کے نتیجے میں اللہ کے عذاب سے ڈراتے اور خبردار کرتے تھے۔

﴿وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ﴾ اس میں ایک تو آپ کی تسلی وتشفی کا پہلو ہے کہ آپ کی طرح ہر امت میں ہم نے ڈرانے والا بھیجا، اور امتوں نے ان سے ویسا ہی سلوک کیا جیسا کفارِ مکہ آپ سے کر رہے ہیں۔ اس لیے آپ دل برداشتہ نہ ہوں۔ آپ ﷺ کے ساتھ اور آپ ﷺ کی قوم کے ساتھ وہی معاملہ ہوگا جو پہلی امتوں کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ دوسرا پہلو، کفارِ مکہ کی مناسبت سے ہے وہ آپ ﷺ کی نبوت ورسالت کا انکار کرتے تھے۔ کہ ہمارا یہی رسول نہیں، بلکہ ان سے پہلے ہر امت کے پاس ہم نے رسول بھیجا ہے۔ یہی بات اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کئی مقامات پر فرمائی ہے۔

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ ①

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔''

ان آیات میں ''امت'' کے لفظ سے بعض نے یہ سمجھا ہے کہ مخلوق کی ہر نوع امت ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ﴾ ②

''اور زمین میں نہ کوئی چلنے والا ہے اور نہ کوئی اڑنے والا، جو اپنے دو پروں سے اڑتا ہے مگر تمہاری طرح امتیں ہیں۔''

اس لیے تمام مخلوقات میں نبی ہیں۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے تو کہا ہے کہ

① النحل: 36 ② الانعام: 38

جانوروں میں نبی ہونے کا قول صرف ابن عربی اور ان کے متبعین کا ہے۔ اور بعض کتابوں میں، میں نے دیکھا ہے کہ یہ قول کفر ہے۔ ①

مگر ابن عربی سے بہت پہلے امام ماتریدی (المتوفی ۳۳۳ھ) نے بھی تفسیر ② میں 'قال بعضهم' کہہ کر یہ قول ذکر کیا ہے۔

ایک جگہ فرمایا:

﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ ③

''تو صرف تم ایک ڈرانے والا ہے اور ہر قوم کے لیے ایک راستہ بتلانے والا ہے۔''

یہاں موقعہ کی مناسبت سے انبیائے کرام علیہم السلام کی صفت ''نذیر'' ہی بیان ہوئی ہے کیوں کہ اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی اسی صفت کا ذکر ہے۔ اور متمردین اپنی چودھراہٹ کے گھمنڈ میں یہی کہتے تھے:

﴿وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ﴾ ④

''اور انھوں نے اس پر تعجب کیا کہ ان کے پاس انہی میں سے ایک ڈرانے والا آیا۔''

نیز دیکھیے، سورۂ ق:۲۔ گویا ان کے انکار کی ایک وجہ انہی میں سے رسول کا ہونا اور دوسری وجہ یہ کہ ہمیں یہ ڈرانے والا کون ہے؟ اس لیے فرمایا: کہ آپ نذیر ہیں بلکہ ہر امت میں ہم نے نذیر بھیجا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہر رسول چوں کہ مبشر ومنذر ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ﴾ اس لیے ایک وصف کے ذکر کو دوسرا وصف بھی مستلزم ہے۔

①روح المعانی، ج173/22 ② تفسیر :482/2 ③ الرعد : 7 ④ ص : 4 نیز دیکھیے ق : 2

﴿وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ بِالزُّبُرِ وَ بِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ○ ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ○﴾

(فاطر:٢٥، ٢٦)

’’اور اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو بے شک ان لوگوں نے (بھی) جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے، ان کے پاس ان کے رسول واضح دلیلوں کے ساتھ اور صحیفوں کے ساتھ اور روشنی کرنے والی کتاب کے ساتھ آئے۔ پھر میں نے ان لوگوں کو پکڑ لیا جنھوں نے کفر کیا، تو میرا عذاب کیسا تھا؟‘‘

سابقہ آیت میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی کا اجمالاً ذکر ہے یہاں اس کی تفصیل ہے کہ یہ لوگ جو آپ کی تکذیب کر رہے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں، اِن سے پہلے بھی جو لوگ ہوئے ہیں انھوں نے بھی اپنے انبیائے کرام کی تکذیب کی، یوں نہیں کہ یہ سلوک صرف آپ سے ہو رہا ہے۔ جیسے آپ ان کے پاس کھلے دلائل اور کتاب مبین لے کر آئے ہیں۔ اسی طرح پہلے رسول بھی دلائل و براہین لے کر آئے، صحائف اور کتاب منیر ان کے پاس بھی تھی مگر اس کے باوجود ان کے مخاطبین نے ان کی تکذیب کی، اس لیے آپ پریشان نہ ہوں نہ آپ نے انہیں سمجھانے میں کوئی کمی کی ہے نہ ہی دلائل و براہین کی کوئی کمی ہے۔

﴿بَيِّنَات﴾ سے مراد وہ معجزات ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی صداقت کے لیے روشن دلائل ہیں۔

﴿الزُّبُر﴾ سے وہ صحائف اور کتابیں مراد ہیں جو مواعظ وحکم اور تنبیہات پر مشتمل ہیں۔ حضرت داود علیہ السلام کی کتاب زبور بھی حِکم و مواعظ پر مشتمل تھی اس میں کوئی تشریعی حکم نہیں تھا۔ اور ﴿الْكِتٰبِ﴾ اس کو کہا جاتا ہے جو احکام وحِکم دونوں پر

مشتمل ہو، اور زندگی کے ہر پہلو پر روشنی وہدایت مہیا کرتی ہو۔

امام رازی وغیرہ نے فرمایا ہے کہ بعض انبیائے کرام علیہم السلام کو معجزات سے نوازا گیا، بعض کو ان کے ساتھ صحائف بھی عطا فرمائے گئے اور بعض کو معجزات کے ساتھ الکتاب بھی عطا فرمائی گئی۔ اور ﴿الْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ﴾ سے مراد تورات اور انجیل ہے۔ یہ مقصد نہیں کہ ہر ایک نبی کو ان تمام اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ نے معجزات اور کتاب منیر عطا فرمائی۔ اس میں اشارہ ہے کہ نہ معجزات کی کمی ہے نہ راہنمائی کی۔ یہ بس اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ پہلے انبیاء علیہم السلام سے بھی یہی سلوک رہا ہے۔ یہی بات ایک اور مقام پر فرمائی گئی ہے:

﴿فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْا بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ الْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ۝﴾ [1]

''پھر اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو بے شک کئی رسول تجھ سے پہلے جھٹلائے گئے، جو واضح دلیلیں اور صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے۔''

لہٰذا جیسے ان انبیائے کرام علیہم السلام نے صبر کیا آپ بھی صبر کریں۔ ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ [2] ''جس طرح پختہ ارادہ والے رسولوں نے صبر کیا۔''

﴿ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ یہ ہے منکرین کا انجام، کہ ان کی تکذیب کے نتیجہ میں ہم نے انہیں پکڑا تو سوچو کہ کس طرح انہیں پکڑا اور انہیں کیسی عبرتناک سزا دی۔ اسی طرح یہ بھی آپ کی تکذیب کے نتیجہ میں یقیناً اسی انجام سے دو چار ہوں گے۔ جس سے ان سے پہلے ہوئے تھے۔ یہی بات تفصیلاً ایک اور مقام پر فرمائی گئی ہے:

﴿وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ عَادٌ وَّ ثَمُوْدُ ۝ وَ قَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَ قَوْمُ لُوْطٍ ۝ وَّ اَصْحٰبُ مَدْيَنَ وَ كُذِّبَ

[1] آل عمران: 184 [2] الاحقاف: 35

مُوسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴾ ①

''اور اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو بے شک ان سے پہلے قومِ نوح اور عاد اور ثمود نے جھٹلایا۔ اور ابراہیم کی قوم نے اور لوط کی قوم نے اور مدین والوں نے اور موسیٰ کو جھٹلایا گیا تو میں نے ان کافروں کو مہلت دی، پھر میں نے ان کو پکڑ لیا تو میرا عذاب کیسا تھا؟''

اس لیے ان کی تکذیب پر انہیں بھی وقتی مہلت مل رہی ہے۔ عنقریب یہ بھی اپنے پیش رو کی طرح ڈھیر ہونے والے ہیں۔

① الحج : 42-44

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ ○ وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ○﴾ (فاطر:۲۷،۲۸)

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ نے آسمان سے کچھ پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ساتھ کئی پھل نکالے، جن کے رنگ مختلف ہیں اور پہاڑوں میں سے کچھ سفید اور سرخ قطعے ہیں، جن کے رنگ مختلف ہیں اور کچھ سخت کالے سیاہ ہیں۔ اور کچھ لوگوں اور جانوروں اور چوپاؤں میں سے بھی ہیں جن کے رنگ اسی طرح مختلف ہیں، اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے صرف جاننے والے ہی ڈرتے ہیں، بے شک اللہ سب پر غالب، بے حد بخشنے والا ہے۔''

ان آیات میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی توحید اور قدرتِ کاملہ کا بیان ہے اور ہر انسان ان کا مخاطب ہے کہ

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ﴾ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔ یہ استفہام تقریری ہے جو بالکل کسی ظاہر وباہر بات کے لیے ہوتا ہے، اور 'اَلَمْ تَرَ' کے معنی 'اَلَمْ تَعْلَمْ' بھی ہیں کہ کیا تم نے نہیں جانا اور اس سے مراد رؤیتِ قلبی بھی ہے۔ کیوں کہ رؤیتِ قلبی ہی رؤیتِ بصری کی دلیل بنتی ہے۔ بارش کو تو ہر ایک اوپر سے نازل ہوتا دیکھتا ہے۔ مگر یہ بادل کہاں سے آتے ہیں، بسا اوقات بادل آتے

ہیں، مگر بارش نہیں برستی، پھر اس کے برسنے میں بھی تفاوت ہے۔ کہیں کم کہیں زیادہ۔ یہی رؤیتِ قلبی اور بصیرت ہی بصارت کھول دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اقرار کیے بغیر بات نہیں بنتی۔

﴿السَّمَآءِ﴾ یعنی آسمان، یہ دراصل ''سماء'' سے ہے بعض نے کہا ہے کہ ہر سماء اپنے ماتحت کے اعتبار سے ''سماء'' ہے بارش بھی اوپر سے برستی ہے اس لیے کہا گیا ہے آسمان سے بارش برستی ہے مگر اس سے مراد اوپر بادلوں سے بارش برسنا ہے۔ جیسا کہ قرآنِ مجید میں ہے:

﴿ءَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ﴾ ①

''کیا تم نے اسے بادل سے اتارا ہے یا ہم ہی اتارنے والے ہیں۔''

بارش چونکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے ہر جگہ ایک مقدار کے مطابق برستی ہے ② اس لیے درحقیقت اس کے فیصلے آسمان پر ہوتے ہیں اس اعتبار سے بھی بارش کی نسبت آسمان کی طرف کی گئی ہے۔

﴿فَأَخْرَجْنَا بِهِ﴾ پھر اس بارش سے ہم مختلف رنگوں کے ثمرات نکالتے ہیں۔ کوئی احمق کہہ سکتا ہے کہ بارش کا اوپر سے آنا تو طبعی ہے، اوپر کی چیز نیچے ہی آتی ہے۔ لیکن ہمیں بتلاؤ کہ کیا زمین سے نرم ونازک کونپلوں کا نکلنا بھی طبعی ہے؟ جیسے بارش ہم برساتے ہیں۔ اسی طرح یہ انگوریاں زمین کی تہہ سے بھی ہم ہی نکالتے ہیں۔ پانی ایک ہے زمین ایک ہے۔ مگر اس سے نکلنے والے پودوں میں سے ہر ایک کی رنگت مختلف ہے، شکلیں مختلف ہیں، خوشبوئیں مختلف ہیں۔ حتی کہ ایک نوع مثلاً گلاب، کی مختلف قسمیں ہیں ان کی خوشبوئیں مختلف ہیں۔ یہی صورت پھلوں کی ہے۔ ہر جنس کی کئی کئی قسمیں ہیں۔ ان کی تاثیر ان کے رنگ ڈھنگ اور ذائقے مختلف ہیں۔ یہاں ''مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا'' میں ثمرات کا اختلاف ترکیب میں حال واقع ہوا ہے، جس میں اشارہ ہے کہ ثمرات کا یہ اختلاف بدلتا رہتا ہے اور ان کے رنگ بھی بدلتے رہتے

① الواقعہ: 69 ② المؤمنون: 18

ہیں۔ کبھی سبز، کبھی سرخ اور کبھی سفید۔

﴿وَ مِنَ الْجِبَالِ﴾ یہ تنوع زمین سے نکلنے والے پودوں میں ہی نہیں۔ جمادات کو دیکھو ان میں بھی اللہ کی یہ قدرت کارفرما ہے۔ بعض وہ ہیں جو سفید اور سرخ ہیں۔ بعض وہ ہیں جو سخت سیاہ ہیں۔

﴿جُدَدٌ بِیضٌ﴾ جُدَدٌ کا واحد "جُدَّۃٌ" ہے جس کے معنی قطعے وحصے، ٹکڑے اور کھلے راستے کے ہیں۔ اس سے مراد وہ دھاریاں ہیں جو پہاڑوں میں سفید، سرخ، اور مختلف رنگوں میں ہوتی ہیں۔

﴿غَرَابِیبُ سُوْدٌ﴾ بعض نے کہا ہے غرابیب کا واحد "غربیب" ہے اور اس کے معنی کوے کی طرح بہت زیادہ سیاہ کے ہیں۔[1] اور سخت سیاہ رنگ میں چونکہ اور کوئی رنگ ظاہر نہیں ہوتا، اس لیے اسے مختلف رنگوں سے تعبیر نہیں کیا گیا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مراد "جدد بیض"، "جدد حمر"، "جدد غرابیب سود" مراد ہو۔ یعنی ان میں سفید دھاریاں، سرخ دھاریاں اور سیاہ دھاریاں ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی قطعہ سفید پہاڑوں کا کوئی سرخ اور کوئی سیاہ پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ یہاں ﴿حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُھَا﴾ میں یہ تعبیر بھی ہوسکتی ہے کہ اصل رنگ تو سفید اور سیاہ ہیں۔ باقی سرخ اور مختلف رنگ ان دونوں کے مختلف درجات کے مرکب سے بنتے ہیں۔ یہاں "مختلف" بطورِ صفت ہے۔ جس میں اشارہ ہے کہ پہاڑوں کے جو رنگ ہیں وہ عموماً قائم رہتے ہیں۔

﴿وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ﴾ یہ تنوع انسانوں، جانوروں اور چوپایوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ انسانوں ہی کو دیکھو ان کے قد کاٹھ میں، رنگوں میں فرق ہے کچھ سرخ، کچھ سفید، کچھ سیاہ، کچھ سانولے ہیں۔ حتی کہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد میں یہ فرق پایا جاتا ہے۔ نطفہ ایک مرد کا ہے، رحمِ مادر بھی ایک ہے، مگر نتائج مختلف ہیں۔ دنیا کی مصنوعات کی طرف دیکھیں، جب تلک سانچہ ایک رہتا ہے، ڈیزائن ایک ہی تیار ہوتا ہے مگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی یہ صناعی اور کاری گری ہے کہ ایک ہی سانچے سے

[1] مفردات

مختلف ڈیزائن برآمد ہو رہے ہیں۔ یہی صورت دیگر جانوروں اور چوپایوں میں ہے۔ جو دلیل ہے کہ اس کائنات کو بنانے والا بے نظیر خلاّق ہے۔ جو ایک ہی نمونہ لے کر نہیں بیٹھا بلکہ اس کے پاس ہر ایک چیز کے نئے سے نئے بے شمار ڈیزائن ہیں۔

انسانوں اور جانوروں میں یہ اختلافِ الوان، ظاہری رنگوں ہی میں نہیں بلکہ ان کی عادات میں، خصلتوں میں بھی ہے۔ گویا صورتوں میں ہی نہیں سیرتوں میں بھی اختلاف ہے۔ ''کذلک'' کے بعد جمہور کے نزدیک وقف ہے۔ الصحاح میں ہے کہ اس کا اطلاق گدھے کی پیٹھ پر مختلف رنگوں کی دھاریوں پر ہوتا ہے اور یہاں اس کا تعلق پہلے جملے سے ہے۔ کہ اسی طرح انسانوں اور حیوانوں کو مختلف رنگوں اور صورتوں میں بنایا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت کی دلیل ہے۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَ فِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝﴾ [1]

''اور زمین ایک دوسرے سے ملے مختلف ہوئے ٹکڑے ہیں اور انگوروں کے باغ اور کھیتی اور کھجور کے درخت کئی تنوں والے اور ایک تنے والے، جنہیں ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے اور ہم ان میں بعض کو پھل میں بعض پر فوقیت دیتے ہیں، بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو سمجھتے ہیں۔''

ایک ہی پانی سے سیراب ہونے والے پودوں، درختوں اور ان کے پھلوں میں یوں اختلاف منہ بول کے کہہ رہا ہے کہ ان کے پیچھے قادرِ مطلق کا ہاتھ ہے۔

---

[1] الرعد : 4

﴿اِنَّمَا يَخۡشَى اللّٰهَ﴾ جس طرح ثمرات ، پہاڑوں ، انسانوں اور حیوانوں میں فرق ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ سے ڈرنے میں بھی انسان مختلف ہیں۔ اللہ سے وہی ڈرتا ہے جسے اللہ کی معرفت حاصل ہے۔ جو اللہ کی عظمت وسطوت ، اس کی کبریائی، اس کی جباری وقہاری ، اس کی قدرت اور اس کے علم کو سمجھتا ہے۔ گویا جو عالم باللہ ہے وہی اللہ سے ڈرنے والا ہے۔

''اِنَّمَا'' عربی زبان میں کلمۂ حصر ہے اور یہ حصر طرفین میں ہے۔ یعنی صرف علماء ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں، اور عالم وہی ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔ علم نہیں تو خوف وخشیت نہیں، اسی طرح خوف وخشیت نہیں تو علم نہیں۔ یہاں علم سے علمِ نافع مراد ہے، جس سے خشیت وخوف آتا ہے۔ ورنہ علم تو شیطان کو بھی تھا۔ انبیائے کرام علیہم السلام کے منکرین ان کی سچائی کو سمجھتے تھے۔ مگر تکبر وتمرد کی وجہ سے انکار کرتے تھے۔ جیسے قومِ فرعون کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿وَ جَحَدُوۡا بِهَا وَ اسۡتَيۡقَنَتۡهَاۤ اَنۡفُسُهُمۡ ظُلۡمًا وَّ عُلُوًّا ؕ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُفۡسِدِيۡنَ۝﴾ [1]

''اور انہوں نے ظلم اور تکبر کی وجہ سے ان کا انکار کر دیا، حالاں کہ ان کے دل ان کا اچھی طرح یقین کر چکے تھے۔''

یہودیوں سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَلۡبِسُوۡنَ الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ وَ تَكۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ۝﴾ [2]

''اے اہلِ کتاب! تم کیوں حق کو باطل سے خلط ملط کرتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو، حالاں کہ تم جانتے ہو۔''

[1] النمل : 14 [2] آلِ عمران : 71

کفارِ مکہ کے بارے میں بھی فرمایا ہے:

﴿فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ﴾ ①

''تو بے شک وہ تجھے نہیں جھٹلاتے اور لیکن وہ ظالم اللہ کی آیات ہی کا انکار کرتے ہیں۔''

یہ جحود یعنی حق کا انکار حق کی معرفت کے بعد ہی ہوتا ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کو بہر نوع سچا سمجھتے تھے۔ مگر ان کا تکبر وتمرد اس حقیقت کو ماننے سے مانع تھا۔ اس موضوع کی اور آیاتِ مبارکہ بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کے باوجود منکرین نے انکار کیا۔ ادھر انہی منکرین کو اللہ تعالیٰ نے جاہل بھی قرار دیا ہے۔ چناں چہ فرمایا:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ۝﴾ ②

''درگزر اختیار کر اور نیکی کا حکم دے اور جاہلوں سے کنارہ کر۔''

عباد الرحمٰن کی علامات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ

﴿وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾ ③

''کہ جب جاہل لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام ہے۔''

یعنی سلام کہہ کر ان سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔ ان آیات میں انہی منکرین کو جاہل بھی قرار دیا گیا ہے، جو جانتے تھے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور یہ کبھی غلط بات نہیں کہتے۔ اس کے باوجود اللہ نے انہیں جاہل کہا ہے۔ اس لیے کہ ان کا علم، علمِ نافع نہیں تھا جیسے درج ذیل آیت میں جادوگروں کے بارے میں علم اور عدمِ علم دونوں کا ذکر کیا ہے:

﴿وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَّ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۝﴾ ④

① الانعام: 33 ② الأعراف: 199 ③ الفرقان: 63 ④ البقرة: 102

”حالاں کہ بلاشبہ یقیناً وہ جان چکے تھے کہ جس نے اسے خریدا آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں اور بے شک بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا تھا، کاش! وہ جانتے ہوتے۔“

یہاں ان کے علم کے باوجود فرمایا ہے کاش وہ جانتے ہوتے۔ گویا ان کا علم، علمِ نافع نہیں۔ اسی طرح شیطان اور منکرین کا علم بھی علمِ نافع نہیں۔ علمِ نافع ہی سے خوف وخشیت حاصل ہوتی ہے۔ ملخصاً[1]

مگر علامہ ابن عطیہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ”اِنَّمَا“ حصر کے علاوہ اختصاص کے لیے بھی آتا ہے اور یہاں یہی مراد ہے کہ خشیت علماء کا وصف ہے۔ یوں نہیں کہ جو عالم نہیں اس میں خشیت نہیں۔ علماء چوں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو صحیح معنوں میں جانتے ہیں۔ اس لیے وہ اللہ سے زیادہ ڈرتے ہیں۔ ”علماء“ سے یہاں عام پیشہ ور علماء مراد نہیں، جو قرآن وحدیث، فقہ، نحو اور صرف وغیرہ علوم کے ماہر ہیں اور پڑھتے پڑھاتے ہیں، اور کرمِ کتابی ہیں بلکہ وہ علماء مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((لَيْسَ الْعِلْمُ عَنْ كَثْرَةِ الْحَدِيْثِ، وَلٰكِنَّ الْعِلْمَ عَنْ كَثْرَةِ الْخَشْيَةِ))[2]

”علم کثرتِ حدیث کا نام نہیں بلکہ علم، اللہ تعالیٰ سے باکثرت ڈرنے کا نام ہے۔“

امام مالک رحمہ اللہ بھی فرماتے ہیں:

((اِنَّ الْعِلْمَ لَيْسَ بِكَثْرَةِ الرِّوَايَةِ، وَأَمَّا الْعِلْمُ نُوْرٌ يَجْعَلُهُ اللّٰهُ فِي الْقَلْبِ))

”علم کثرتِ روایت کا نام نہیں، بلکہ علم نور ہے، جسے اللہ دل میں ڈال دیتا ہے۔“

① شفاء العليل لابن قيم ② ابن کثیر: 730/3، جامع بيان العلم: 25/2

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علم تو وہی ہے جو کتاب وسنت سے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمۂ سلف سے حاصل ہوتا ہے اور یہ روایت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے قول کا مفہوم یہ ہے کہ علم نور ہے اور اس کا فہم وادراک اور اس کے مفاہیم ومعانی کا جاننا علم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اس آیت کا مصداق وہ ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ اللہ ہر شے پر قادر ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اسی بنا پر تمام انبیاء وصلحاء اللہ سے ڈرتے تھے۔ ہمیشہ اللہ سے ہدایت کے طلب گار رہتے اور ہدایت پر استقامت کی دعائیں کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ 'لا یُسئل عما یفعل' اللہ جو چاہے فیصلہ فرمائے اسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ

'اِنَّ الْفَقِیْهَ حَقَّ الْفَقِیْهِ مَنْ لَمْ یُقْنِطِ النَّاسَ مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ، وَلَمْ یُرَخِّصْ لَهُمْ فِیْ مَعَاصِی اللّٰهِ تَعَالٰی، وَلَمْ یُؤَمِّنْهُمْ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ، وَلَمْ یَدَعِ الْقُرْآنَ رَغْبَةً عَنْهُ اِلٰی غَیْرِهٖ، اِنَّهٗ لَا خَیْرَ فِیْ عِبَادَةٍ لَا عِلْمَ فِیْهِ، وَلَا عِلْمٍ لَا فِقْهَ فِیْهِ، وَلَا قِرَاءَةٍ لَا تَدَبُّرَ فِیْهِ' [1]

''بے شک فقیہ کامل وہ ہے جو لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ کرے اور نہ انہیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی رخصت دے، اور نہ انہیں اللہ کے عذاب سے بے خوف کرے، اور قرآن کو چھوڑ کر کسی دوسری چیز کی طرف رغبت نہ کرے، اس عبادت میں کوئی خیر نہیں جو علم کے بغیر ہو، اور اس علم کا کوئی فائدہ نہیں جو بے سمجھ بوجھ کے ہو، اور اس قراءت میں خیر نہیں جو بغیر تدبر کے ہو۔''

سعد بن ابراہیم رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ اہلِ مدینہ میں سب سے بڑا فقیہ کون ہے؟ انہوں نے فرمایا: جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہے۔ [2]

---

(1) قرطبی: 344,343/14، دارمی: 304 (2) دارمی: 301

اسی طرح حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'اَلْعَالِمُ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ، وَرَغِبَ فِيمَا رَغِبَ اللّٰهُ فِيهِ، وَزَهِدَ فِيمَا سَخِطَ اللّٰهُ فِيهِ' ①

''عالم وہ ہے جو بن دیکھے اللہ سے ڈرے، جو اللہ پسند کرے اس کی طرف راغب ہوجائے اور جس سے اللہ ناراض ہو اس سے کنارہ کشی اختیار کرے۔'' ②

اس لیے عالم وہ نہیں جو باکثرت معلومات رکھتا ہو۔ کتاب خواں اور کتاب دان ہو۔ یہود اہلِ کتاب، ''اہل الذکر'' تھے مگر اللہ کی خشیت اور عمل سے عاری تھے اسی لیے فرمایا:

﴿مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ﴾ ③

''ان لوگوں کی مثال جن پر تورات کا بوجھ رکھا گیا، پھر انہوں نے اسے نہیں اٹھایا، گدھے کی مثال کی سی ہے جو کئی کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔''

انہوں نے تورات کو لفظاً لفظاً تو پڑھا مگر نہ اسے سمجھا، نہ ہی اس پر عمل کیا۔ بلکہ الٹا انہوں نے تاویل وتحریف کی راہ اختیار کی، ان کا حال گدھے سے بھی بدتر ہے۔ گدھے کو تو فہم وادراک نہیں، مگر یہ عقل وفہم رکھتے ہوئے بھی اس کو سمجھنے اور عمل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اسی طرح کتاب خوانی علم نہیں، بلکہ اس کا فہم اور اس پر عمل اصل علم ہے اور یہی علم اللہ کا خوف اور ڈر پیدا کرتا ہے۔ اسی لیے اہلِ علم کہتے ہیں کہ علماء کی تین قسمیں ہیں:

1: عَالِمٌ بِاللّٰهِ وَبِاَمْرِ اللّٰهِ: جسے اللہ کی معرفت اور اس کے اوامر ونواہی کا علم ہے وہی اللہ سے ڈرتا اور حدود وفرائض کی پابندی کرتا ہے۔ یہ علم کا اعلیٰ درجہ ہے۔

① ابن كثير: 730/3 ② مزيد ملاحظه فرمائيں الدرارمي: 76,75/1 ③ الجمعة: 5

۲: عَالِمٌ بِاللّٰهِ وَلَيْسَ بِعَالِمٍ بِأَمْرِ اللّٰهِ: جسے اللہ کی معرفت ہے اور اس سے ڈرتا ہے مگر اللہ کے اوامر ونواہی سے بے خبر ہے۔ گویا وہ عابد ہے عالم باحکام اللہ نہیں۔ یہ اللہ سے ڈرتے ہوئے بھی معرض خطر میں ہے۔ بدعات وخرافات کا دروازہ ایسے عابدوں نے ہی کھولا ہے۔

۳: عَالِمٌ بِأَمْرِ اللّٰهِ لَيْسَ بِعَالِمٍ بِاللّٰهِ: جو احکامِ الٰہی تو جانتا ہے مگر اللہ سے نہیں ڈرتا اور احکام کی پابندی نہیں کرتا۔ قرآن کا مطلوب عالم یہ نہیں۔ یہ شرک وبدعت کی راہ ہموار کرنے والا بن جاتا ہے۔

اسی طرح ''علماء'' سے مراد سائنس کا علم جاننے والے سائنٹسٹ نہیں۔ اگر مظاہرِ قدرت کا نظارہ کرنے کے باوجود یہ اللہ سے ڈرنے والے نہیں تو یہ علما نہیں، بلکہ جہلا ہیں۔ اسی طرح علم کا اطلاق تو ان علوم پر بھی ہوتا ہے جو انسان کے لیے مفید ہیں۔ جیسے حساب وکتاب اور دیگر فنون کا علم ہے۔ ان علوم کی اہمیت وضرورت کا انکار نہیں۔ مگر قرآنِ پاک نے جس علم کا ذکر فرمایا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت وعظمت اور اللہ کے اوامر ونواہی کا علم ہے اور جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں وہ علماء ہیں۔ باقی علم رکھتے ہوئے بھی جاہل ہیں یا علمِ نافع سے بے بہرہ ہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی سب سے زیادہ معرفت انبیائے کرام علیہم السلام کو ہوتی ہے اسی لیے وہ سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

((إِنِّي لَأَعْلَمُهُمْ بِاللّٰهِ وَأَشَدُّهُمْ لَهُ خَشْيَةً))[1]

''بے شک مجھے ان سے زیادہ اللہ کا علم ہے اور ان سے زیادہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔''

یہی کیفیت دیگر انبیائے کرام علیہم السلام اور صلحاء کی تھی۔ انہی کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ

[1] بخاری: 6101

﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ﴾ ①

''ان کا بدلہ ان کے ربّ کے ہاں ہمیشہ کے باغات ہیں، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ہمیشہ۔ اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اس سے راضی ہوگئے، یہ اس کے لیے ہے جو اپنے ربّ سے ڈر گیا۔''

یہی اللہ سے ڈرنے والے علماء ہیں جو اللہ کے عبادت گزار ہیں۔

﴿اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَ يَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴾ ②

''(کیا یہ بہتر ہے) یا وہ جو رات کی گھڑیوں میں سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے عبادت کرنے والا ہے، آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے ربّ کی رحمت کی امید رکھتا ہے۔ کہہ دے کیا برابر ہیں وہ لوگ جو جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے! نصیحت تو بس عقلوں والے ہی قبول کرتے ہیں۔''

یہ ہے علم رکھنے والوں کا طرزِ عمل۔ اور جو علم سے بے خبر ہیں وہی شرک میں مبتلا اور آخرت سے بے خوف ہیں۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ﴾ اللہ سب پر غالب ہے۔ اللہ جب چاہے جسے چاہے پکڑ لے۔ اس لیے اس سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ وہ ''غفور'' بھی ہے جو معافی کا طلب گار ہوتا ہے اسے معاف کر دیتا ہے۔ بلکہ معاف کرنا اسے پسند ہے۔ بلکہ معاف کرنے کے وصف میں تبھی کمال ہے کہ جب کوئی انتقام پر قدرت ہونے کے باوجود

① البینة : 8 ② الزمر : 9

معاف کر دے جو انتقام کی قدرت ہی نہیں رکھتا اس کے معاف کرنے میں کمال ہی کیا؟ کمال یہ ہے کہ وہ غالب ہے، پھر معاف کر دیتا ہے۔ وہ ''غالب'' ہے کہ جو نافرمانیوں کا مرتکب ہے۔ اسے سزا دینے پر غالب ہے۔ نہ کوئی مجرم بھاگ کر روپوش ہوسکتا ہے، نہ ہی وہ ایسا کہ اس پر کوئی ہاتھ ڈال سکے بلکہ وہ اللہ کی دسترس میں ہے اور اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا۔ وہ ''غفور'' بہت بخشنے والا ہے۔ ایک دو جرم نہیں بلکہ زندگی اگر جرائم میں گزری ہو آخری لمحات میں بھی توبہ کر لیتا ہے اور ندامت سے سر جھکا لیتا ہے تو وہ اسے بھی معاف کر دیتا ہے۔

:: :: ::

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَٰبَ اللَّهِ وَ أَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَ أَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَارَةً لَّن تَبُورَ ○ لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُورَهُمْ وَ يَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِ إِنَّهُ غَفُورٌ شَكُورٌ ○﴾ (فاطر:۲۹، ۳۰)

”بے شک جو لوگ اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں اور انہوں نے نماز قائم کی اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا اس میں سے انہوں نے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کیا، وہ ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جو کبھی برباد نہ ہوگی۔ تاکہ وہ انہیں ان کے اجر پورے پورے دے اور اپنے فضل سے انہیں زیادہ بھی دے، بلاشبہ وہ بے حد بخشنے والا، نہایت قدر دان ہے۔“

پہلی آیت میں ”علماء“ کا یہ وصف بیان ہوا ہے کہ وہ اللہ سے ڈرتے ہیں۔ اللہ سے ڈرنے والوں کے ہی طرزِ عمل کا یہاں مزید بیان اور ان کی کامیابی کا ذکر ہے۔ چناں چہ فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَٰبَ اللَّهِ﴾ بے شک وہ لوگ جو اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں۔ اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ پہلے ان کے قلب کی درستی، اب ان کی زبان پھر عمل کی اصلاح اور ساتھ انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر ہے۔ گویا اختصاراً ان کی قولی، بدنی اور مالی عبادت کا بیان ہے۔ قرآنِ کریم کی تلاوت کا حکم اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو دیا ہے:

﴿اُتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَٰبِ﴾ [1]

”اس کی تلاوت کر جو کتاب میں سے تیری طرف وحی کی گئی ہے۔“

---

[1] العنکبوت: 45

اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کے فرائضِ منصبی کا ذکر کرتے ہوئے ایک وصف یہ بیان فرمایا ہے: ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ [1] جو ان کے سامنے اس کی آیات پڑھتا ہے۔ چناں چہ آپ اپنے مواعظ وخطبات میں، نمازوں میں، قرآنِ مجید کی تلاوت کرتے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے قرآن پڑھتے تھے۔ اور قرآن پڑھنے کا حکم فرماتے تھے اور اس کے فضائل وبرکات سے آگاہ فرماتے تھے۔ جس کی تفصیل کتبِ احادیث میں موجود ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور سلفِ امت رحمۃ اللہ علیہم اسی بنا پر تلاوت قرآنِ پاک کا اہتمام کرتے۔ اور اسی عمل کے عاملوں کا یہاں ذکر ہے۔ حضرت مطرف بن عبداللہ بن شخیر جو بصرہ کے عابد وزاہد تابعین میں شمار ہوتے ہیں، فرماتے ہیں: هٰذِهٖ اٰيَةُ الْقُرَّاءِ . یہ آیت قاریوں کے لیے ہے جو تلاوت کو اپنا مشغلہ بناتے ہیں۔

﴿وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ﴾ یہ ان کا دوسرا وصف ہے۔ گویا تلاوت کے ساتھ قرآن پر ان کا عمل بھی ہے۔ جس کا اوّلین تقاضا نماز ہے۔ جس کا حکم قرآنِ پاک میں کم وبیش اسّی بار آیا ہے۔ ''اقامتِ صلاۃ'' کے معنی صرف نماز پڑھنا اور اس کی ظاہری ہیئت کا ادا کرنا ہی نہیں بلکہ اسے جملہ شرائط کے ساتھ خشوع وخضوع سے ادا کرنا اور اس پر مداومت اختیار کرنا مراد ہے۔ قرآنِ پاک ہی میں یہی لفظ ''اقاموا'' اہلِ کتاب کے حوالے سے بھی آیا ہے کہ

﴿وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ﴾ [2]

''اگر وہ واقعی تورات اور انجیل کو قائم رکھتے، ان کی پابندی کرتے۔'' اس کے ایک آیت بعد فرمایا:

﴿قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ﴾ [3]

''کہہ دے اے اہلِ کتاب! تم کسی چیز پر نہیں ہو، یہاں تک کہ تم تورات اور انجیل کو قائم کرو۔'' یعنی ان کی پابندی کرو اور ان پر عمل کرو۔

---

① الجمعه: 2 ② المائدة: 66 ③ المائدة: 68

اسی طرح قرآنِ پاک میں جہاں کہیں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے یا نمازیوں کی تعریف کی گئی ہے وہاں مصدر ''اقامۃ'' سے صیغہ استعمال ہوا ہے۔ جیسے ' اَقَامُوا الصَّلَاۃَ، اَقِیمُوا الصَّلَاۃَ، یُقِیمُونَ الصَّلَاۃَ، اَلْمُقِیمِینَ الصَّلَاۃَ '

اس لیے ''اقاموا'' کے معنی ہیں خشوع وخضوع کے ساتھ نماز کی پابندی کرنا اور اس پر قائم رہنا۔ نماز میں نمازی اللہ کی توحید کا قیام میں رکوع وسجدہ میں، قومہ میں، تشہد میں اعتراف واقرار کرتا ہے تو نماز کے بعد بھی توحید پر قائم رہنا چاہیے، نماز میں کامل عبدیت اور عاجزی وانکساری کا اظہار ہے تو یہ عبدیت اور انکساری باقی لمحات میں بھی باقی رکھنا مطلوب ہے۔ نماز میں آنکھیں جھکی رہنی چاہییں، قیام اور رکوع میں سجدہ گاہ سے اور تشہد میں انگشتِ شہادت سے نگاہ متجاوز نہیں ہونی چاہیے۔ باقی لمحات میں بھی نگاہ نیچی رکھنے کا حکم ہے۔

نماز میں تلاوتِ قرآن اور ذکر وتسبیحات ہیں تو اس عملِ خیر کا اہتمام باقی اوقات میں بھی ہونا چاہیے، یہ اوقات بھی غفلت میں نہیں گزرنے چاہئیں۔ ایک رکعت میں نمازی پانچ بار ''اللہ اکبر'' کہہ کر اللہ کی کبریائی کا اعتراف کرتا ہے تو اس کے دل ودماغ میں کسی اور سپر پاور کا خوف نہیں سمانا چاہیے۔ وہ دائیں بائیں اپنے نمازی بھائیوں کو اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ اور ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ '' کہہ کر سلامتی کا پیغام دیتا ہے تو پھر ان سے دھینگا مشتی اور لڑائی جھگڑا نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ ہمیشہ دوسروں کے لیے سلیم الصدر رہنا چاہیے۔

یہ ہے نماز پر قائم رہنا، اور ایسی نماز ہی ﴿تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ بے حیائی اور برائی سے روکنے والی ہے۔ اگر نماز پڑھنے والے اور بے نماز کی زندگی میں اور ان کے معاملات میں کوئی فرق نہیں تو یہ اسی لیے ہے کہ نمازی اپنی نماز پر قائم نہیں، وہ نماز کی راہ چھوڑے ہوئے ہے اور جو اس راہ پر قائم ہے وہی اللہ تعالیٰ کے ہاں محمود اور محبوب ہے۔

﴿وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ﴾ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کا یہ تیسرا وصف

ہے کہ وہ پوشیدہ اور ظاہر، ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اپنی جان کو اللہ کی عبادت میں، مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ رزق اللہ نے ہی انہیں دیا ہے۔ اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ یہاں محلِ خرچ کا ذکر نہیں کہ وہ کہاں خرچ کرتے ہیں۔ قرآنِ مجید میں دوسرے مقامات پر صراحت ہے کہ وہ اللہ کی راہ مسکینوں، یتیموں اور بے سہارا انسانوں پر خرچ کرتے ہیں۔ اور بڑی فیاضی سے سراً وعلانیۃً خرچ کرتے ہیں۔

﴿عَلَانِيَةً﴾ سے بعض حضرات نے فرمایا ہے جہاں مال خرچ کرنا فرض اور ضروری ہے وہاں علانیہ خرچ کرتے ہیں جیسے زکاۃ، صدقۂ فطر اور قربانی ہے یا جہاں دوسروں کو ترغیب دینا یا اور مصلحت دینی مطلوب ہو وہاں علانیہ خرچ کرتے ہیں، جیسے نماز فرض ہے، جو مساجد میں ادا کی جاتی ہے۔ اس کے لیے اذان ہے اور اجتماع کا حکم ہے۔ باقی نفلی نماز جیسے گھر میں پوشیدہ طور پر افضل ہے، اسی طرح نفلی صدقہ بھی پوشیدہ طور پر افضل ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس دن اللہ کے (عرش کے) سائے کے بغیر اور کوئی سایہ نہیں ہوگا اس دن سات نوعیتوں کے انسان اللہ کے (عرش کے) سائے میں ہوں گے:

۱: امام عادل۔
۲: وہ شخص جو اپنے ربّ کی عبادت میں جوان ہوا (جوانی عبادت میں لگائی)۔
۳: وہ جس کا دل مسجد سے معلق رہتا ہے۔
۴: وہ دو شخص جو اللہ کی محبت میں باہم ملتے ہیں اور اللہ کی محبت میں جدا ہوتے ہیں۔
۵: وہ شخص جسے حسن و جمال کی پیکر اور مقتدر عورت نے گناہ کی دعوت دی مگر اس نے کہا: میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔
۶: وہ شخص جو اس طرح صدقہ کرے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو پتا نہ چلے کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے۔

۷: وہ شخص جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوں۔[1]

درپردہ اور پوشیدہ طور پر صدقہ کرنے کی فضیلت میں اور احادیث بھی ہیں۔ شائقین اس بارے میں الترغیب والترہیب[2] ملاحظہ فرمائیں۔

''سِرًّا'' خرچ کرنے میں انسان ریا ونمود سے بچ جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس احساس کی بنا پر خرچ نہیں کرتا کہ مجھے کوئی دکھلاوے کے لیے خرچ کرنے والا نہ سمجھے، تو امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ ''عین الریاء'' بالکل ریا ہے۔ شیطان کی چالیں بھی بڑی خطرناک ہیں وہ ریا کا وسوسہ ڈال کر نیکی سے روکتا ہے اور دوسروں کو تاثر دیتا ہے کہ یہ بڑا مخلص ہے۔ ریا سے بچنے کے لیے نہیں دے رہا۔ ریا محض عمل کرنے میں نہیں بسا اوقات عمل نہ کرنے میں بھی ریا کا عمل دخل ہوتا ہے۔ مثلاً عشاء کے بعد وتر نہیں پڑھتا کہ لوگ سمجھیں تہجد گزار ہے، آخری رات وتر پڑھ لے گا۔

ع بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں

﴿سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً﴾ کا یہ مفہوم بھی ہے کہ وہ ہر حال میں، ہر وقت خرچ کرتے رہیں۔ لوگوں کو پتا چلے نہ چلے۔ اس فکر سے بے نیاز ہو کر ہر حال میں وہ خرچ کرتے ہیں۔ کیوں کہ مقصود اللہ کی رضا ہے کسی اور کو دکھلانا یا راضی کرنا نہیں۔

﴿يَرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ﴾ وہ تلاوت کرتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور صدقہ وخیرات کرتے ہیں اس امید کے سہارے کہ یہ تجارت کبھی برباد اور کساد بازاری کا شکار نہیں ہوگی۔ بلکہ اس میں برکت ہی برکت ہوگی۔ 'يَرْجُوْنَ' کے لفظ میں اشارہ ہے کہ یہ عبادت گزار اور وفا شعار اپنے کسی عمل پر بھروسہ نہیں رکھتے کہ یہ اعمال یقیناً ان کی بخشش کا ذریعہ ہوں گے اور ان کا اجر وثواب بھی یقینی ہوگا۔ کیوں کہ:

اوّلاً: ان اعمال کی توفیق بھی تو اللہ تعالیٰ کی عنایت ونوازش ہی کا نتیجہ ہے۔

ثانیاً: انسان جس قدر بھی عبادت گزار ہو وہ اللہ کی عظمت وجلالت کا حق اور اس کے

---

[1] بخاری: 660، مسلم: 1031 [2] الترغیب والترھیب: 29/2

انعامات کا شکر ادا نہیں کرسکتا۔ فرشتے بھی قیامت کے روز اعتراف کریں گے کہ مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ ہم سے تیری عبادت کا حق ادا نہیں ہوسکا۔

ثالثاً: اعمال میں یہ خطرہ دامن گیر رہتا ہے کہ اس کی ادائیگی میں کہیں کمی یعنی اخلاص سے سرانجام دینے میں کمی، اور سنت کی موافقت میں کوتاہی نہ رہ گئی ہو یا اس میں کسی وسوسۂ شیطانی کا عمل دخل نہ ہوگیا ہو۔

رابعاً: یہ خوف بھی لاحق ہوتا ہے کہ کوئی ایسا عمل نہ ہوجائے جو نیک عمل کی قبولیت سے مانع بن جائے۔ انہی خدشات کی بنا پر وہ اپنے اعمال کو نجات کا یقینی ذریعہ اور درجات کی بلندی کا باعث نہیں سمجھتا بلکہ بس اس کی امید رکھتا ہے اور ڈرتا رہتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَ الَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ﴾ [1]

"اور وہ کہ انہوں نے جو کچھ دیا اس حال میں دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرنے والے ہوتے ہیں کہ یقیناً وہ اپنے ربّ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا اس آیت کا مصداق وہ ہیں جو چوری کرتے، بدکاری کرتے اور شراب پیتے ہیں اور اللہ سے ڈرتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

' لَا يَا بِنْتَ الصِّدِّيْقِ، وَلٰكِنَّهُ الَّذِيْ يُصَلِّيْ وَيَصُوْمُ وَيَتَصَدَّقُ وَهُوَ يَخَافُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ ' [2]

"نہیں، اے صدیق کی بیٹی! بلکہ اس کا مصداق وہ ہے جو نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے اور صدقہ کرتا ہے اور وہ اللہ عزوجل سے ڈرتا ہے۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[1] المؤمنون: 60 [2] مسند احمد: 205/6

'لَنْ يُنجِيَ اَحداً مِنكُمْ عَمَلُهٗ. قَالُوا: وَلَا اَنتَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ!
قَالَ: وَلَا اَنَا، اِلَّا اَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ' ①

''ہرگز تم میں سے کسی کا عمل اسے نجات نہیں دلا سکتا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کو بھی؟ فرمایا: اور میں بھی نہیں، الا یہ کہ اللہ مجھے اپنی رحمت میں ڈھانپ لے۔''

تقریباً یہی روایت صحیح مسلم ② میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ ہیں:

'لَا يُدْخِلُ اَحداً مِنكُمْ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ، وَلَا يُجِيرُهٗ مِنَ النَّارِ، وَلَا أَنَا اِلَّا بِرَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ' ③

''کسی کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا اور نہ آگ سے بچائے گا، اور نہ ہی مجھے، الَّا یہ کہ اللہ کی طرف سے رحمت ہو جائے۔''

عمل کا دائرہ بہرحال محدود ہے اور جنت اللہ تعالیٰ کی دائمی نعمت ہے۔ اس لیے جنت اعمال کا نتیجہ کیوں کر ہو سکتی ہے۔ مگر قرآنِ مجید میں ہے کہ فرشتے اہلِ ایمان کی روح قبض کرتے ہوئے کہتے ہیں:

﴿سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ ④

''سلام ہو تم پر، جنت میں داخل ہو جاؤ، اس کے بدلے جو تم کیا کرتے تھے۔''

اسی طرح اہلِ جنت کے بارے میں ہے کہ

﴿وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ ⑤

① بخاری: 6463، مسلم: 2816 ② مسلم: 2818 ③ مسلم: 2817
④ النحل: 32 ⑤ الاعراف: 43

''اور انہیں آواز دی جائے گی کہ یہی وہ جنت ہے جس کے وارث تم اس کی وجہ سے بنائے گئے ہو جو تم کیا کرتے تھے۔''

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت اعمالِ حسنہ کا بدل ہے۔ علمائے کرام نے اس اشکال کا یہ جواب دیا ہے کہ جنت میں داخلہ تو اللہ کی رحمت سے ہوگا، عمل تو بجائے خود اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہے۔ اس کی رحمت نہ ہو تو کوئی نیک عمل کر نہیں سکتا۔ پھر یہ عمل اگر اللہ کی رضا کے مطابق بھی ہو تو وہ کسی نعمت کے قائم مقام نہیں ہوسکتا۔ بلکہ تمام اعمال بھی ایک نعمت کے قائم مقام نہیں ہوسکتے۔ اس لیے اعمال کا بدلہ جنت نہیں البتہ جنت کے درجات ومراتب اعمال کی مناسبت سے ملیں گے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اعمال میں قبولیت کی شرط ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان آیات میں قبولیت کا اظہار ہے کہ جو تم مقبول عمل کرتے رہے ان کے بدلے میں جنت ہے۔

اس آیت میں اعمالِ صالحہ، تلاوت، نماز، انفاق کو تجارت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ کو تجارت اور خرید وفروخت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

﴿يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ [1]

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! کیا میں تمہاری ایسی تجارت کی طرف راہنمائی کروں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچا لے؟ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔''

[1] الصف: 11,10

اسی طرح سورۂ توبہ میں فرمایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰةِ وَ الْاِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ ؕ وَ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۝﴾[1]

''بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے ہیں، اس کے بدلے کہ یقیناً ان کے لیے جنت ہے، وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں، پس قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، یہ تورات اور انجیل اور قرآن میں اس کے ذمہ پکا وعدہ ہے اور اللہ سے زیادہ اپنا وعدہ پورا کرنے والا کون ہے؟ تو اپنے اس سودے پر خوب خوش ہوجاؤ جو تم نے اس سے کیا ہے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔''

یہاں بھی اعمالِ صالحہ کے تناظر میں تجارت کا ذکر ہے، تجارت میں تاجر اپنا سرمایا، اپنا وقت، اپنی صلاحیت صرف کرتا ہے تاکہ اسے نفع حاصل ہو اور اس کے سرمائے میں اضافہ ہو مگر اس کے باوجود بعض اوقات نفع کی بجائے نقصان ہوتا ہے۔ اور دنیا میں ہر تجارت اسی نفع ونقصان کے مابین معلق ہوتی ہے۔ نفع کے ساتھ نقصان کا اندیشہ بھی رہتا ہے۔ لیکن اللہ کے ساتھ تجارت میں ﴿لَنْ تَبُوْرَ﴾ سے اشارہ ہے کہ اس تجارت میں نقصان کا ہرگز احتمال نہیں۔ اس کی کامیابی اور اس کے نفع کی پیشگی تمھیں مبارک ہو۔ یہ اللہ کا تمھارے ساتھ ایسا وعدہ ہے جو تورات اور انجیل میں ہے اور قرآنِ پاک میں بھی، بھلا اللہ سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے؟

یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کا کرم ہے وہ اپنے دیئے ہوئے مال اور عطا کی ہوئی

[1] التوبۃ: 111

صحت کو اس کی اطاعت میں صرف کرنے کو تجارت سے تعبیر کرتا ہے اور حوصلہ بڑھاتا ہے کہ میرے ساتھ تمہارا معاملہ نقصان کا نہیں بہر نوع نفع کا ہے۔ ورنہ بندہ وغلام کا اپنا کیا ہے یہ غلام ہے مزدور نہیں کہ مزدوری کا اجر طلب کرے، وہ بس یہ چاہتا ہے کہ مالک راضی ہو جائے اور اپنی رحمتوں کی برکھا برسائے۔

اللہ کا یہ یقیناً وعدہ ہے اسی لیے ایمان وعملِ صالح کرنے والے امیدوار ہیں کہ ان کی تجارت کھوٹی نہیں ہوگی۔ بعد کی آیت میں وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی امیدوں سے بھی زیادہ عطا فرمائیں گے۔

﴿لِیُوَفِّیَهُمْ اُجُوْرَهُمْ﴾ ان کی تجارت میں خسارہ نہیں ہوگا بلکہ انہیں پورا پورا اجر ملے گا۔ ایک عمل کا اجر کم سے کم دس گنا اور زیادہ سے زیادہ سات سو گنا تک ہوگا۔ اور حسب حال انہیں پورا اجر ملے گا۔ عمل کا اجر ہی نہیں ﴿وَ یَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ﴾ بلکہ اپنے فضل واحسان سے اور بھی بہت کچھ نوازے گا۔ سات سو سے بھی زیادہ اجر وثواب سے نوازے گا اور اپنے دیدار کا شرف بھی انہیں بخشے گا۔ جیسے فرمایا:

﴿لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ فِیْهَا وَ لَدَیْنَا مَزِیْدٌ﴾[1]

''ان کے لیے جو کچھ وہ چاہیں گے اسی میں ہوگا اور ہمارے پاس مزید بھی ہے۔''

اور یہ مزید جنت میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا دیدار ہے۔ اس حوالے سے ایک نظر اس پر بھی ڈالی جائے جو ہم اسی آیت کی تفسیر میں لکھ چکے ہیں۔ اور اس اضافے میں وہ اعزاز واکرام بھی شامل ہے جو اللہ تعالیٰ انہیں گناہ گاروں کی سفارش کے لیے عطا فرمائے گا۔ ایمان وعمل صالح پر کاربند رہنے والوں کے لیے اسی اجر وفضل کا ذکر سورۃ النساء میں بھی ہے۔[2] ایک اور مقام پر فرمایا ہے:

---

[1] ق: 35 [2] النساء: 173

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ ۝ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ [1]

''وہ مرد جنھیں اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم کرنے اور زکاۃ دینے سے نہ کوئی تجارت غافل کرتی ہے اور نہ کوئی خرید وفروخت، وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی۔ تاکہ اللہ انہیں اس کا بہترین بدلہ دے جو انہوں نے کیا اور انہیں اپنے فضل سے زیادہ دے اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔''

بیع وشرا میں مشغول رہنے کے باوجود کچھ ایسے ہیں جو میری یاد سے غافل نہیں رہتے، نماز وقت پر پڑھتے ہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر بھی اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں۔ انہی کے عمل کا بہترین اجر ہے اور اللہ انہیں اپنے فضل سے مزید نوازے گا۔

﴿اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ﴾ بلاشبہ وہی بے حد بخشنے والا، نہایت قدر دان ہے۔ ''غفور'' یہ ''غَفَرَ'' سے ہے جس کے معنی ہیں چھپانا، پردہ پوشی کرنا، ڈھانپ دینا۔ اسی سے محاورہ ہے ''اغفر ثوبک فی الوعاء'' اپنے کپڑوں کو صندوق وغیرہ میں چھپا دو۔ ''مِغْفَرٌ'' لوہے کا خود۔ اللہ تعالیٰ ''غفور'' ہے کہ وہ اپنے بندوں کے گناہوں کو چھپا دیتا ہے۔ جس طرح ہم گندی اور قابلِ نفرت چیز پر مٹی ڈال دیتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ ہماری آلودگیوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں ان کی باز پرس نہیں کرتے بلکہ اپنے بندے کو شرمندگی سے بچانے کے لیے انہیں نشر بھی نہیں کرتے۔

[1] النور :38,37

قرآنِ مجید میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی یہ صفت غَافِرُ، اَلْغَفُوْر اور اَلْغَفَّار کے الفاظ سے آئی ہے۔ الغفور میں غافر سے زیادہ مبالغہ ہے اور الغفار میں الغفور سے زیادہ مبالغہ ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے: کہ اللہ تعالیٰ غافر ہیں کہ نامۂ اعمال میں سیاہ کاریوں پر پردہ ڈال دیں گے، الغفور ہیں کہ گناہوں کو فرشتوں کی نگاہوں سے بھی چھپا دیں گے اور الغفار ہیں کہ اپنے بندوں کے دلوں سے بھی اس کی یاد بھلا دیں گے۔ بعض نے کہا ہے الغافر دنیا میں ہیں الغفور قبر میں ہیں اور الغفار میدانِ محشر میں۔

امام رازی رحمہ اللہ نے ایک اور عجیب بات فرمائی ہے کہ جس طرح الغافر، الغفور، الغفار اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں اسی طرح معصیت کی بنا پر گناہ گاروں کے تین نام ہیں:

۱: ظالم: جیسے فرمایا: ﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ﴾[1] پھر ان میں سے کوئی اپنے آپ پر ظلم کرنے والا ہے۔

۲: الظلوم: جیسے فرمایا: ﴿اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا﴾[2] بلاشبہ وہ ہمیشہ سے بہت ظالم، بہت جاہل ہے۔

۳: الظلّام: جیسے فرمایا: ﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ﴾[3] کہہ دے اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے۔ جو معصیت میں اسراف کرتا ہے وہ ظلّام ہے۔

گو اشارہ ہے کہ اگر تم ظالم ہو تو میں غافر ہوں، تم اگر ظلوم ہو تو میں غفور ہوں، تم اگر ظلام ہو تو میں غفار ہوں۔ پھر انسان کی صفت تو متناہی ہے۔ ایک نہ ایک دن اسے ختم ہونا ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کی صفات لامتناہی ہیں وہ ہمیشہ سے ان صفات سے متصف ہے اور رہے گا۔ اس نے فرمایا:

﴿اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا﴾[4]

[1] فاطر: 32 [2] الاحزاب: 72 [3] الزمر: 53 [4] نوح: 10

"اپنے رب سے معافی مانگ لو، یقیناً وہ ہمیشہ سے بہت معاف کرنے والا ہے۔"

یوں نہیں فرمایا: ﴿إِنَّهُ غَفَّارٌ﴾ بلکہ فرمایا: ﴿إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا﴾ کہ وہ ازل سے ابد تک، ہمیشہ سے بہت معاف کرنے والا ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بخشش ومغفرت دنیا اور آخرت دونوں میں ہے۔ احادیث میں ہے کہ مومن کو ایک کانٹا بھی چبھے گا تو اس کی کوئی غلطی معاف کردی جائے گی، بیمار ہو، کوئی نقصان ہو یا کوئی پریشانی آئے تو یہ سب خطاؤں کی معافی کا باعث ہیں۔ آخر میں اگر پھر بھی کچھ بچ گیا تو اس کی وفاداریوں کی بنا پر اسے معاف کردیا جائے گا۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ نامۂ اعمال ہی سے اسے صاف کردیا جائے یا اللہ تعالیٰ اپنے پاس بلا کے معافی کا اعلان کردے اور اسے رسوائی سے بچانے کے لیے اس بات کی باز پرس نہ کرے کہ تم دنیا میں یہ اور یہ کرتے رہے ہو۔ اطاعت گزاروں کی خطاؤں کو ہی نہیں بلکہ ان کے اعمالِ حسنہ میں اگر کمی کوتاہی ہوگی تو اس پر بھی پردہ پوشی فرما کے قبول کرلے گا۔ بلکہ جب تک اللہ تعالیٰ ان کوتاہیوں سے درگزر نہ فرمائے ان کی کوئی نیکی قبول ہی نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ انسان کتنا ہی اخلاص کا اہتمام کرلے پھر بھی کوئی نہ کوئی کوتاہی رہ جاتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی بخشش ومغفرت جہاں معصیتوں کے بارے میں ہے، وہاں قبولیت اعمال میں بھی ہے۔

﴿إِنَّهُ غَفُورٌ﴾ میں یہ بات بھی پیش نگاہ رہنی چاہیے کہ "بے شک وہی بے حد بخشنے والا ہے۔" تمام اوامر ونواہی، من جانب اللہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے اوامر ونواہی بھی درحقیقت من جانب اللہ ہیں۔ اس لیے ان کی نافرمانی یا کوتاہی میں انسان اللہ تعالیٰ ہی مجرم ہے۔ اس لیے بخشنے اور معاف کرنے والا بھی وہی ہے۔ جیسے ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝﴾ [1]

[1] الحجر: 49

"میرے بندوں کو خبر دے دے کہ بے شک میں ہی بے حد بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہوں۔"

ایک جگہ فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا اللّٰهُ ﴾ [1]

"اور اللہ کے سوا اور کون گناہ بخشتا ہے۔"

رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جو دعا سکھلائی اس کے الفاظ یہ ہیں:

'اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ ظُلْمًا كَثِيْرًا وَلَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْلِيْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِيْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ' [2]

"اے اللہ، بے شک میں نے ظلم کیے اپنی جان پر بہت زیادہ اور نہیں کوئی بخشنے والا گناہوں کو تیرے سوا، پس مجھے بخش دے خاص اپنی طرف سے اور مجھ پر رحم کر۔ بے شک تو ہی بڑا بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے۔"

رسول اللہ ﷺ نے جس استغفار کو "سید الاستغفار" قرار دیا ہے اس کے آخری الفاظ یہ ہیں:

((فَاِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ)) [3]

"بے شک آپ کے بغیر گناہوں کو کوئی بخشنے والا نہیں۔"

گویا یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندے کا معاملہ ہے۔ بندہ خواہ کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو تنہائی میں دو آنسو بہا کر صدقِ دل سے معافی مانگ لے تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں بلکہ معاف کرنے پر خوش ہوتے ہیں۔

مگر عیسائیت میں بخشش گناہ کے لیے چرچ میں گناہ گار، پوپ پادری کے سامنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہے اور وہ اسے بخشش کا پروانہ دیتا ہے۔ یہ عقیدہ وفکر

---

[1] آلِ عمران: 135 [2] بخاری: 834 [3] بخاری: 6306

جہاں توحید کے منافی ہے وہاں انسان کی تذلیل کا بھی باعث ہے۔ جب کہ اسلام گناہ گار کو کسی دوسرے انسان کے سامنے گناہ کے اعتراف کا پابند نہیں کرتا بلکہ وہ اسے آقا و غلام کا معاملہ قرار دیتا ہے اور کسی بھی انسان کے سامنے شرمندہ ہونے کی بجائے تنہائیوں میں کسی وقت اپنے آقا کے سامنے ندامت سے توبہ کرتا ہے۔ تو اللہ اس کے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔

﴿ شَكُورٌ﴾ یہ ''شکر'' سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر انعام کرنا اور ان کی معمولی عبادت گزاری پر وافر جزا دینا مراد ہے۔ ہم روز مرہ کے معاملات میں اپنے محسنین کے لیے شکریہ کا لفظ بولتے ہیں وہ بھی اسی ''شکر'' سے ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے شکر یہ اللہ کی قدر افزائی اور قدر دانی مراد ہے۔ جب کسی مالک کا خادم یا ملازم مالک کی دی ہوئی ذمہ داریوں سے بڑھ کر اطاعت بجا لاتا ہے اور مالک کے مفادات کا تحفظ دل وجان سے کرتا ہے تو مالک کے دل میں اپنے ملازم کی قدر بڑھے گی اور وہ دل ہی دل میں اس کا قدر دان ہوگا یہی مالک کا شکر ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ تو بہت ہی قدر دان ہیں وہ اپنے بندے کے معمولی عمل کو بھی نظر انداز نہیں فرماتے، یہ اس کی قدر دانی ہی تو ہے کہ زندگی کے چند دنوں میں کی ہوئی نیکی پر ہمیشہ کے لیے جنت کی نعمتوں سے نواز دیتے ہیں۔ بلکہ انسان ستر سال تک کفر وشرک میں مبتلا رہے پھر دولتِ ایمان میسر آجائے تو اس پر بھی جنت سرمدی کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ انسان کا عمل کوتاہیوں اور معصیتوں سے ملا ہوا ہوتا ہے (الا ما شاء اللہ) مگر اللہ تعالیٰ اسے خالص اجر وثواب سے نوازتے ہیں جس میں جفا وکدورت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔

آیت میں اطاعت گزاروں کے بارے میں اجر وثواب دینے بلکہ ان کے اعمال کے تناسب سے زیادہ نوازشات سے نوازنے کا ذکر ہے۔ اسی مناسبت سے

فرمایا: ﴿إِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ﴾ کہ وہ اپنے ان اطاعت گزاروں کی خطاؤں کو بخشنے والا ہے۔ اعمال میں کوتاہی ہوگی تب بھی پردہ پوشی فرما کے بخش دیتا ہے۔ وہ ایک ایک غلطی پر مواخذہ نہیں فرمائے گا بلکہ نیکیاں زیادہ ہوں گی تو معاف فرما دے گا۔ وہ ''غفور'' کے ساتھ ''شکور'' بھی ہے کہ وہ معمولی نیکی کو بوجہ اپنی تمام تر عظمتوں کے نظر انداز نہیں کرے گا۔ اس نے تو کتے کو پانی پلانے والی عورت کو بخش دیا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انسانوں کے ساتھ قدردانی کا معاملہ کتنا عظیم تر ہے۔

:: :: ::

﴿وَالَّذِیۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ ہُوَ الۡحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِعِبَادِہٖ لَخَبِیۡرٌۢ بَصِیۡرٌ ○ ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ الَّذِیۡنَ اصۡطَفَیۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ۚ فَمِنۡہُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِہٖ ۚ وَ مِنۡہُمۡ مُّقۡتَصِدٌ ۚ وَ مِنۡہُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَیۡرٰتِ بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَضۡلُ الۡکَبِیۡرُ﴾

(فاطر: ۳۱،۳۲)

''اور وہ جو ہم نے تیری طرف کتاب میں سے وحی کی ہے وہی حق ہے، اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے ہے۔ بے شک اللہ اپنے بندوں کی یقیناً پوری خبر رکھنے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ پھر ہم نے اس کتاب کے وارث اپنے وہ بندے بنائے جنھیں ہم نے چن لیا، پھر ان میں سے کوئی اپنے آپ پر ظلم کرنے والا ہے اور ان میں سے کوئی میانہ رو ہے اور ان میں سے کوئی نیکیوں میں آگے نکل جانے والا ہے، اللہ کے حکم سے، یہی بہت بڑا فضل ہے۔''

پہلی آیت میں ''کتاب اللہ'' کی تلاوت کرنے والوں کا اور دیگر اعمالِ حسنہ کا اہتمام کرنے والوں اور ان کے اجر وثواب کا ذکر ہے۔ اس آیت میں اسی کتاب کے بارے میں بتلایا جارہا ہے کہ یہ کتاب حق ہے جس کی ہم نے تمہاری طرف وحی کی ہے۔ جیسے سورۂ آلِ عمران میں فرمایا: ﴿نَزَّلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ﴾ [1] اس نے تجھ پر یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری۔

یا یہ کہ جو ہم نے تمہاری طرف وحی کی ہے وہ لوح محفوظ میں سے ہے۔ یوں ''من'' تبعیضیہ ہوگا جیسا کہ علامہ زمخشری رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے۔

[1] آلِ عمران: 3

﴿هُوَ الْحَقُّ﴾ جملۂ حصر ہے کہ وہی حق ہے۔ حق کے متلاشیوں کو اسے حرزِ جان بنانا چاہیے۔ اس سے پہلے کی کتابیں اپنے اپنے دور میں حق تھیں۔ لیکن ان میں تحریف ہوجانے کی وجہ سے اب وہ حق نہیں رہیں۔ توحید کی بجائے شرک کی آمیزش ان میں کردی گئی ہے۔ احکامِ الٰہی کو تبدیل کردیا گیا ہے۔ اس لیے کتابِ حق اب یہی ہے۔ نہ اس میں باطل کا تصور ہے نہ ہی کسی ریب وتردد کا۔

﴿مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ یہ کتاب تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے ہے کہ وہ منزل من اللہ کتابیں ہیں۔ یا یہ ان کی مصدق ہے جو پہلی کتابوں میں اصولی مسائل منزل من اللہ ہیں۔ رہے وہ مسائل جو ان کے ماننے والوں نے اختراع کر لیے تھے یا جن میں تحریف کردی گئی تھی ان کی قرآن تصدیق نہیں بلکہ تردید کرتا ہے۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ یہ کتاب ان پیش گوئیوں کو سچا ثابت کر رہی ہے جو تورات میں آخری نبی اور اس کے ہاتھ میں آتشی شریعت کے حوالے سے بیان ہوئی ہیں۔

لہٰذا یہ کوئی نرالی کتاب نہیں نہ اس کی تعلیمات پہلی کتابوں کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ اس میں اسی حق سچ کی دعوت ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت رہی ہے۔

پہلی کتابوں کی یوں تصدیق بجائے خود اِس کتاب کے حق ہونے کی دلیل ہے کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کوئی کتاب پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے ہی پہلی کتابوں کی تعلیمات کی موافقت کی خبر دی ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ بِعِبَادِهِ لَخَبِيرٌ﴾ کیوں کہ اللہ ہی ہر چیز کے حقائق سے خبردار ہے۔ وہ اپنے بندوں کو خود ان سے زیادہ جانتا ہے۔ ان کے باطن سے آگاہ ہے اور ان کے ظاہر کو بھی دیکھتا ہے۔ اس لیے اس نے محمد رسول اللہ ﷺ کو رسول بنایا ہے اور اس پر کتابِ حق وحی کی ہے تو اس لیے کہ وہ انہی کو اس عظیم منصب کا حق دار سمجھتا ہے۔ اور جو کتابِ حق دی ہے وہ اس کے بندوں کی راہنمائی کے لیے نہایت موزوں اور ان کی مصلحت کے عین مطابق ہے۔ کیوں کہ وہی اپنے بندوں کی ضروریات سے

واقف ہے اور ہر چیز پر اس کی نظر ہے۔

﴿ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ﴾ ''ثم'' حرف عطف ہے اور تراخی (وقفہ اور فاصلہ) کے لیے ہے۔ اس کا عطف ''اَوۡحَيۡنَا'' پر ہے۔ یعنی پہلے یہ کتابِ حق وحی کے ذریعے آپ پر نازل کی، پھر اس کتاب کا وارث ہم نے انہیں بنایا جنھیں ہم نے منتخب کیا اور چنا۔ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کی امت ہے۔ آیت میں ''اصطفینا'' کے لفظ سے اس امتِ محمدیہ کی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔ کیوں کہ ''اصطفاء'' کے معنی صاف اور خالص چیز لینے کے ہیں اور اس کا اکثر استعمال انبیائے کرام اور اللہ کے منتخب بندوں پر ہوا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿اَللّٰهُ يَصۡطَفِيۡ مِنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ﴾ ①

''اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے چنتا ہے اور لوگوں سے بھی۔''

ایک اور مقام پر ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ وَ اٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ۝﴾ ②

''بے شک اللہ نے آدم اور نوح کو اور ابراہیم علیہم السلام کے گھرانے اور عمران کے گھرانے کو جہانوں پر چن لیا۔''

حضرت ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کا ذکر کر کے فرمایا گیا ہے:

﴿وَ اِنَّهُمۡ عِنۡدَنَا لَمِنَ الۡمُصۡطَفَيۡنَ الۡاَخۡيَارِ ۝﴾ ③

''اور بلاشبہ وہ ہمارے نزدیک یقیناً چنے ہوئے بہترین لوگوں سے تھے۔''

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ④ اور سیّدہ مریم صدیقہ علیہا السلام کے بارے میں ⑤ بھی منتخب ہونے کا ذکر ہوا ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيۡنَ اصۡطَفٰى﴾ ⑥

① الحج: 75 ② آلِ عمران: 33 ③ ص: 47 ④ الاعراف: 144 ⑤ آلِ عمران: 42
⑥ النمل: 59

''اور کہہ دے سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اور سلام ہے اس کے ان بندوں پر جنھیں اس نے چن لیا۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام سفیان ثوری رحمہ اللہ اور السُّدِّی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے مراد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ ①

اس آیت میں تو پوری امت کو ''اصطفاء'' کے اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ گو انبیائے کرام اور ملائکہ کا ''اصطفاء'' اعلیٰ درجہ کا ہے اور امتِ محمدیہ کا ان سے ادنیٰ درجہ کا۔ اسی امت کو اللہ تعالیٰ نے 'خَیْرُ اُمَّةٍ' اور 'اُمَّةً وَّسَطاً' قرار دیا ہے اور باقی امتوں پر گواہ بنایا ہے:

﴿لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ ②

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بن حیدہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'اَنْتُمْ تُتِمُّوْنَ سَبْعِيْنَ اُمَّةً، اَنْتُمْ خَيْرُهَا وَاَكْرَمُهَا عَلَى اللّٰهِ' ③

''تم پورا کرتے ہو ستر امتوں کو، یعنی تم سترویں امت ہو، تم ان میں سے بہترین ہو اور ان سب سے مکرم و محترم ہو اللہ کے نزدیک۔''

یہ روایت ترمذی کے علاوہ ابن ماجہ، دارمی، مسند احمد، المستدرک للحاکم اور طبرانی میں بھی ہے۔ امام ترمذی نے اسے حسن، امام حاکم نے صحیح اور حافظ ابن حجر نے فتح الباری، میں حسن صحیح کہا ہے۔ ④

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'أُعْطِيْتُ مَا لَمْ يُعْطَ اَحَدٌ مِنَ الْاَنْبِيَاءِ، فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَاهُوَ؟ قَالَ: نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ، وَاُعْطِيْتُ مَفَاتِيْحَ الْاَرْضِ، وَسُمِّيْتُ أَحْمَدَ، وَجُعِلَ التُّرَابُ لِيْ طُهُوْراً، وَجُعِلَتْ أُمَّتِيْ

① مسند ابی القاسم الجوہری: 82، ابن کثیر: 490/3، الدر المنثور: 113/5 ② البقرۃ: 143 ③ ترمذی: 83/4 وغیرہ ④ فتح الباري 22/8

خَیْرَ الْاُمَمِ ‘ [1]

”مجھے ایسی چیزیں دی گئی ہیں جو دیگر انبیائے کرام علیہم السلام میں سے کسی کو نہیں دی گئیں۔ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! وہ چیزیں کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: میری مدد رعب سے کی گئی ہے، مجھے زمین کی چابیاں دی گئی ہیں، میرا نام احمد رکھا گیا ہے، مٹی میرے لیے طہارت کا باعث بنائی گئی ہے اور میری امت تمام امتوں سے بہتر قرار دی گئی ہے۔“

حافظ ابن کثیر نے تفسیر [2] میں اور حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ [3]

ان احادیثِ مبارکہ سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی عظمت اور مرتبت معلوم ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے اوّلین مصداق تمام صحابۂ کرام ہیں۔ مگر روافض ”اصطفاء“ کا مصداق اہلِ بیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمۂ اہلِ بیت ہی کو قرار دیتے ہیں۔ حالاں کہ اہلِ بیت تو صحابہ کرام میں شامل ہیں اور اہلِ سنت جب صحابہ کرام کا نام لیتے ہیں تو ان میں اہلِ بیت شامل ہوتے ہیں۔ رہے باقی ائمۂ اہلِ بیت تو وہ بھی امت کے افراد ہیں ان کا اختصاص امرِ واقع کے خلاف ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآنِ پاک ایک جگہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جمع کروایا۔ جو ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس، پھر امّ المومنین سیّدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہا۔ حضرت عثمان غنی کے دور میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بن یمان کے مشورہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے یہی مصحف طلب کر کے حضرت زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن عاص اور عبدالرحمٰن بن حارث رضی اللہ عنہم کو دیا اور ان سے اسی مصحف کے مختلف نسخے لکھوائے اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا مصحف انہیں واپس کر دیا۔ اور ان نسخوں کو دوسرے شہروں میں بھجوا دیا۔ جیسا کہ صحیح بخاری [4] وغیرہ میں اس کی تفصیل ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک نسخہ مکۂ مکرمہ میں، ایک بصرہ،

---

[1] مسند احمد: 98/1 [2] تفسیر ابن کثیر: 25/1 [3] فتح الباری: 225/8

[4] صحیح بخاری: 4987،4986

ایک کوفہ، ایک بحرین، ایک شام بھجوا دیا اور ایک نسخہ مدینۂ طیبہ میں رکھا۔ آج امت کے پاس وہی مصحف پاک ہے جو ان صحابۂ کرام کی مساعیِ جمیلہ سے جمع ہوا تھا اور صحابۂ کرام سے اختلاف کے باوجود اور ان کی مساعیِ جمیلہ کی ناسپاسی کے باوصف روافض کے پاس بھی وہی مصحف ہے جو ان صحابۂ کرام نے جمع کیا تھا۔ اہلِ بیت کے فضائل ومراتب بجا ہیں مگر حقیقت وہی ہے جسے مختصراً ہم نے عرض کردیا ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے امتِ محمدیہ کو قرآنِ پاک کا ''وارث'' بنایا ہے۔ اس میں ایک معنویت اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ وارث کو جو میراث ملتی ہے وہ بغیر کسی احسان اور معاوضہ کے ملتی ہے یہ وارث کے کسی عمل اور کوشش کے نتیجہ میں نہیں ہوتی۔ بالکل اسی طرح کتابِ حق کی وراثت امتِ محمدیہ کو کسی عمل ومحنت کے نتیجہ میں نہیں دی گئی بلکہ یہ خاص اللہ کی عطا اور مہربانی کا نتیجہ ہے۔ اس امت سے پہلے بنی اسرائیل ''الکتاب'' کے وارث تھے۔

﴿وَ اَوْرَثْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْکِتٰبَ﴾[1]

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب کا وارث بنایا۔''

مگر مسلسل ان کی نافرمانیوں اور انبیائے کرام کی مخالفتوں کے نتیجے میں یہ منصب ان سے چھن گیا، اب یہ ''کتابِ حق'' رسول اللہ ﷺ پر نازل کی گئی اور اس کا وارث ان کی امت کو بنایا۔ جس میں ان کا اعزاز بھی ہے اور امتحان بھی کہ کیا یہ اس وراثت کے امین بنتے ہیں یا نہیں۔

﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ﴾ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جو اپنے بندوں کے بارے میں علیم وخبیر ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ قرآن کے ان وارثوں کی حالت کیا ہوگی؟ چناں چہ فرمایا ان میں تین قسموں کے افراد ہیں۔ ظالم، مقتصد اور سابق۔ ان تینوں کے بارے میں آرا نہایت مختلف ہیں۔ حضرت عمر، عثمان، ابوالدرداء، ابن مسعود، عقبہ بن عمرو اور سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ظالم سے مراد فاسق اور صغائر کا

[1] المؤمن: 53

مرتکب ہے۔ یہی جمہور مفسرین کی رائے ہے۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے یہ چھ صحابہ کا قول ہے اور یہی تمہارے لیے کافی ہے۔

یہی ایک قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی منقول ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے۔ امت کے ظالموں کی بخشش ہو جائے گی، مقتصدین سے آسان حساب ہوگا اور سابقین بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے۔ امام ابن جریر اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو درست قرار دیا ہے۔ اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی اسی کی وضاحت ہے، فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فرماتے تھے کہ اس آیت میں سبقت لے جانے والے وہ ہیں جو بغیر حساب جنت میں جائیں گے۔ اور مقتصدین سے آسان آسان حساب ہوگا اور جو اپنے آپ پر ظلم کریں گے وہ میدانِ محشر میں دیر تک کھڑے رہیں گے پھر اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمت فرمائے گا۔ مسند امام احمد میں یہ حدیث ثقہ راویوں سے مروی ہے۔ علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اس کے راوی الصحیح کے ہیں۔[1]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے جامع ترمذی اور مسند احمد[2] میں ہے کہ یہ سب ایک مرتبہ میں ہیں اور سب جنت میں جائیں گے اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے دیگر شواہد کے تناظر میں اسے حسن قرار دیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کے شواہد اور طرق نقل کیے ہیں۔[3] اور علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی الدر المنثور[4] میں ان روایات کو بیان کیا ہے۔ جن سے اسی تفسیر کی تائید ہوتی ہے اور یہی جمہور مفسرین کی رائے ہے۔ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے طریق الھجر تین میں اس پر بڑی تفصیل سے نہایت نفیس بحث کی ہے اور جو حضرات اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں ان کے اعتراضات کا جائزہ بھی لیا ہے شائقین طریق الھجر تین[5] ملاحظہ فرمائیں یہاں اس تفصیل کی گنجائش نہیں۔

اسی حوالے سے اسلاف کے اقوال مختلف اور اس کی متنوع تعبیرات ہیں۔ مثلاً

---

① مجمع : 7/ 95 ② جامع ترمذی : 4/ 171، مسند احمد : 3/ 78 ③ ابن کثیر : 3/ 733,732 ④ الدرالمنثور : 5/ 251 ⑤ طریق الھجرتین : 187-202

سہل بن عبداللہ تستری فرماتے ہیں: السابق عالم ہے، مقتصد متعلم ہے اور ظالم جاہل ہے۔

ذوالنون مصری کہتے ہیں: ظالم جو صرف زبان سے ذکر کرنے والا ہے، مقتصد دل سے ذکر کرنے والا اور سابق تو اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتا۔

الانطاکی کہتے ہیں: ظالم صاحب الاقوال اور مقتصد صاحب الافعال اور سابق صاحب الاحوال ہے۔

ابن عطاء کہتے ہیں: ظالم وہ جو اللہ سے دنیا کے لیے محبت کرے، مقتصد وہ جو آخرت کے لیے محبت کرے اور سابق وہ جو فنا فی اللہ ہے۔ یعنی اللہ کی مراد ہی اس کی مراد ہوتی ہے۔

بعض نے کہا ہے: کہ ظالم وہ ہے جسے مال دیا گیا مگر وہ اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتا، مقتصد وہ جو خرچ کرتا ہے اور سابق وہ ہے جو مال نہ ہوتے ہوئے بھی شکر کرتا اور ایثار کرتا ہے۔ کہتے ہیں دو اللہ والے باہم ملے تو ایک نے پوچھا بصرہ کے بھائیوں کا کیا حال ہے۔ دوسرے نے جواب دیا: خوش ہیں، اگر مل جائے تو شکر کرتے ہیں نہ ملے تو صبر کرتے ہیں۔ اس نے کہا: یہ تو ہمارے بلخ کے کتے بھی کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں عبادت گزاروں کی حالت یہ ہے کہ نہ ملے تب بھی شکر کرتے اور اگر کچھ مل جائے تو ایثار کرتے ہیں۔

بعض کہتے ہیں: سابق وہ جو مسجد میں اذان سے پہلے آتے ہیں، مقتصد وہ جو اذان کے بعد آتے ہیں اور ظالم وہ جو اقامتِ صلاۃ کے بعد آتے ہیں۔ اس نوعیت کے اور بہت سے اقوال ہیں جنھیں علامہ قرطبی، علامہ شوکانی اور علامہ آلوسی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ یہاں استیعاب مقصود نہیں اور نہ ہی ان کی صحت وصواب سے بحث ہے بلکہ بتلانا یہ ہے کہ نتیجہ ان سب کا یہی ہے کہ اس سے مراد امتِ محمدیہ کے افراد ہیں۔

''ظلم'' کا اطلاق صغیرہ وکبیرہ گناہوں پر ہوتا ہے اور کفر وشرک پر بھی۔ مگر یہاں ظلم سے مراد گناہ ہے کفر وشرک نہیں۔ اس لیے سابقین اور مقتصدین کے ساتھ گناہگاروں کا ذکر ''اصطفاء'' کے اور جنت میں جانے کے منافی نہیں۔ اور یہ امتِ

محمدیہ کی خصوصیت ہے کہ عملی اعتبار سے جو ظالم ہیں وہ بھی امت کے شرف وفضل میں شامل ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سابقہ تمام مفسرین کی آرا کو بڑی جامعیت سے یوں بیان کیا ہے کہ ''ظالم'' سے مراد وہ جو بعض واجبات کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہیں اور بعض محرمات کے مرتکب ہوجاتے ہیں۔ ''مقتصد'' وہ ہیں جو واجبات کی پابندی کرتے ہیں محرمات سے اجتناب کرتے ہیں۔ البتہ بعض مستحباب کو چھوڑ دیتے اور بعض مکروہات میں بھی مبتلا ہوجاتے ہیں۔ ''سابقین'' وہ ہیں جو واجبات ومستحبات کا اہتمام کرتے ہیں اور محرمات ومکروہات سے بچتے ہیں حتی کہ بعض مباحات کو بھی کسی شبہ کی بنا پر خیر باد کہہ دیتے ہیں۔

دوسری تاویل:

اس کے برعکس حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ظالم سے مراد کافر ہے۔ یہی قول ان کے شاگرد حضرت عکرمہ سے منقول ہے۔ یہی رائے امام مجاہد اور حسن بصری کی بھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہاں جن تین قسم کے افراد کا ذکر ہے یہ اسی طرح ہے جیسے سورۃ الواقعہ میں سابقین، اصحاب المیمنہ اور اصحاب المشئمہ کا ہے۔ یعنی کافر اصحاب المشئمہ ہیں جن کے بائیں ہاتھ نامۂ اعمال ہوگا۔ المقتصدین اصحاب المیمنہ ہیں جن کے دائیں ہاتھ نامۂ اعمال ہوگا اور سابقین مقربین ہیں جو بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے۔ اور بعد کی آیت میں ''یدخلونها'' کی ضمیر انہی دو کے لیے سمجھتے ہیں۔ مگر اس پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے کہ مقتصد اور سابق کے ساتھ ظالم کو بھی ''اصطفینا'' میں شمار کیا گیا ہے لہٰذا کافر منتخب بندوں میں سے کیوں کر ہوسکتا ہے؟ جس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ''فمنهم'' میں تقسیم ''عباد'' کی طرف ہے یعنی ہمارے بندوں میں سے کچھ ظالم ہیں یعنی کافر ہیں۔ مگر یہ بھی تکلف سے خالی نہیں۔

تیسری تاویل

ایک رائے یہ بھی بیان ہوئی ہے کہ ''اصطفینا من عبادنا'' سے مراد بنو اسماعیل لیے جائیں جو بنو اسرائیل کے بعد اس کتاب کے مخاطب تھے جنھیں قرآنِ مجید میں

''امیین'' کہا گیا ہے اور یہود ان کی اس برتری و بزرگی پر معترض بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ سے ان کی مخالفت کا سب سے بڑا سبب بھی یہی تھا مولانا اصلاحی کی یہی رائے ہے جس کی انھوں نے تفصیلاً تائید کی ہے۔ مگر یہ تفسیر احادیث اور تفسیر سلف کے منافی ہے۔ گو اس بات کی گنجائش ہے کہ اس سے مراد بنو اسماعیل ہوں کہ ان میں بعض ظالم یعنی کافر رہے اور بعض مقتصدین اور بعض سابقین قرار پائے۔

ظالم کو پہلے ذکر کرنے کی توجیہات:

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں ظالم کو پہلے کیوں ذکر کیا گیا ہے حالاں کہ پہلے اس کا ذکر کیا جانا چاہیے جو شرف و فضل میں مقدم ہے۔ تو اس کے علمائے کرام نے متعدد جوابات دیئے ہیں۔

۱: کسی چیز کا پہلے ذکر ہونا اس کی فضیلت کو مستلزم نہیں جیسے سورۃ الحشر میں دوزخیوں کا ذکر پہلے آیا ہے۔ ﴿لَا یَسۡتَوِیۡۤ اَصۡحٰبُ النَّارِ وَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ﴾[1] یا جیسے الشوریٰ[2] میں ہے: ﴿یَهَبُ لِمَنۡ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ یَهَبُ لِمَنۡ یَّشَآءُ الذُّکُوۡرَ﴾

۲: ظالموں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ اسی طرح مقتصدین یعنی متوسطین، سابقین سے زیادہ ہوتے ہیں۔ گویا جن کی تعداد زیادہ ان کا پہلے ذکر ہے۔ یہ توجیہ علامہ زمخشری نے کی ہے۔

۳: ظالم کو اس لیے پہلے ذکر کیا تاکہ وہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اور سابق کو مؤخر اس لیے کیا وہ اپنے عمل کے بارے میں خود پسندی کا شکار نہ ہو۔

۴: حضرت جعفر صادق نے فرمایا ہے کہ ظالم کا پہلے ذکر کیا تاکہ بتلایا جائے کہ اللہ کی رحمت اور اس کے کرم کے بغیر نجات کی کوئی راہ نہیں اور اس کی کرم نوازی ہو تو ظلم اللہ کی پسندیدگی میں مانع نہیں، پھر مقتصدین کا ذکر ہے جن کا معاملہ

---

[1] الحشر: 20 [2] الشوریٰ: 49

خوف ورجا کے مابین ہے پھر سابقین کا تاکہ کوئی بھی اللہ کے عذاب سے بے خوف نہ ہو۔ اگرچہ وہ سب کلمۂ توحید لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی وجہ سے جنت میں جائیں گے۔

۵: سابق کو اس لیے مؤخر کیا کہ اس کے بعد جنت کا ذکر ہے تاکہ اس کا جنت سے قرب ظاہر کیا جائے جیسے سورۃ الحج میں مساجد کو صوامع اور بیع سے مؤخر کیا گیا ہے۔[1] اس کے بعد ذکر اللہ کا ذکر ہے اور ذکراللہ سے سب سے زیادہ مناسبت اور قرب مساجد کو ہے۔

﴿مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَّمِنْهُمْ سَابِقٌ﴾ مقتصد سے مراد میانہ رو ہے یعنی وہ مومن جس سے نیکیوں کے ساتھ گناہوں کا ارتکاب بھی ہوجاتا ہے۔ جیسے سورۂ توبہ میں فرمایا ہے:

﴿وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾[2]

"اور کچھ دوسرے ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا، انھوں نے کچھ عمل نیک اور کچھ دوسرے برے ملا دیے، قریب ہے کہ اللہ ان پر پھر مہربان ہوجائے، یقیناً اللہ بے حد بخشنے والا نہایت رحم والا ہے۔"

یعنی یہ اللہ کے فرماں بردار بننے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان سے خطائیں بھی ہوجاتی ہیں اور وراثت کی ادائیگی میں بھی وہ میانہ رو ہیں، دینِ حق کی دعوت وتبلیغ کا فریضہ بھی سرانجام دیتے ہیں مگر کبھی اغماض کا شکار ہوجاتے ہیں۔

"مِنْهُمْ سَابِقٌ" سے مراد تمام امورِ خیر میں سبقت لے جانے والے ہیں جن میں ایمان اور ہجرت میں سبقت لے جانے والے اور اوّلین انصارِ مدینہ اوّل وہلہ میں شامل ہیں۔ جن کا ذکر خیر سورۃ التوبہ میں ہے۔[3] اللہ تبارک وتعالیٰ نے امورِ خیر

---

[1] الحج : 40 [2] التوبہ : 102 [3] التوبة:100

میں سبقت کا حکم فرمایا ہے:

﴿سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ
السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ۙ﴾ [1]

''اپنے ربّ کی بخشش اور اس جنت کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھو جس کی چوڑائی آسمان اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے۔''

﴿وَ سَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ
الْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ﴾ [2]

''اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دوڑو اپنے ربّ کی جانب سے بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین (کے برابر) ہے، ڈرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

﴿وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّیْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ﴾ [3]

''اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے، جس کی طرف وہ منہ پھیرنے والا ہے، سو نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انبیائے کرام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَ یَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ؕ
وَ كَانُوْا لَنَا خٰشِعِیْنَ﴾ [4]

''بے شک وہ نیکیوں میں جلدی کرتے تھے اور ہمیں رغبت اور خوف سے پکارتے تھے اور وہ ہمارے ہی لیے عاجزی کرنے والے تھے۔''

یہی نیکی کے کاموں میں جلدی کرنا مومنین وصالحین کا وصف سورۃ المومنون [5]

---

[1] الحدید: 21 [2] آلِ عمران: 133 [3] البقرۃ: 148

[4] الانبیاء: 90 [5] المؤمنون: 61

اور آلِ عمران [1] میں بھی بیان ہوا ہے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'اَلتُّؤَدَةُ فِیْ كُلِّ شَیْءٍ خَیْرٌ اِلَّا فِیْ عَمَلِ الْآخِرَةِ.' [2]

''تاخیر ہر معاملہ میں بہتر ہے، مگر آخرت کے لیے عمل میں تاخیر بہتر نہیں۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'بَادِرُوْا بِالْاَعْمَالِ فِتَناً كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ يُصْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِناً وَيُمْسِيْ كَافِراً، اَوْ يُمْسِيْ مُؤْمِناً وَيُصْبِحُ كَافِراً، يَبِيْعُ دِيْنَهٗ بِعَرَضٍ مِنَ الدُّنْيَا' [3]

''اعمال کرنے میں جلدی کرو، ایسے فتنوں کے آنے سے پہلے جو تاریک رات کے ٹکڑوں کی طرح (یکے بعد دیگرے) رونما ہوں گے، آدمی صبح کو مومن ہوگا اور شام کو کافر یا شام کو مومن ہوگا اور صبح کو کافر، وہ اپنے دین کو دنیا کے معمولی سامان کے عوض فروخت کر دے گا۔''

گویا فتنوں کے دور میں لوگوں کی نظریں دنیا پرستی میں اس حد تک بڑھ جائیں گی کہ دنیوی مفادات کے لیے اپنے دین وایمان کا سودا کرنے میں بھی کوئی حجاب محسوس نہیں کریں گے۔ بہروپیوں کی طرح صبح وشام اپنے ایمان کا سودا کریں گے۔ ایسے حالات کے پیدا ہوجانے سے پہلے اعمال صالحہ کے اہتمام اور ان کے کرنے میں جلدی کا حکم فرمایا ہے۔ جیسے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'اِغْتَنِمْ خَمْساً قَبْلَ خَمْسٍ، حَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ، وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سَقَمِكَ، وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ، وَشَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ،

[1] آلِ عمران : 114 [2] ابوداود وغیرہ الصحیحۃ : 1794 [3] مسلم : 118

وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ ‘ ①

”پانچ کو پانچ سے قبل غنیمت جانو، اپنی زندگی کو اپنی موت سے پہلے، اور اپنی صحت کو اپنی بیماری سے پہلے اور اپنی فراغت کو اپنی مصروفیت سے پہلے اور اپنی جوانی کو اپنے بڑھاپے سے پہلے اور اپنی تونگری کو اپنی فقیری سے پہلے۔“

اس لیے اہلِ ایمان کو نیکیوں کے حصول، اپنی بخشش و مغفرت اور جنت کو پانے میں مسابقت کی کوشش کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے نیک لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۝ عَلَی الْاَرَآئِكِ یَنْظُرُوْنَ ۝ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ ۝ یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۝ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ وَ فِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۝﴾ ②

”بے شک نیک لوگ یقیناً بڑی نعمت میں ہوں گے۔ تختوں پر (بیٹھے) دیکھ رہے ہوں گے۔ تُو ان کے چہروں میں نعمت کی تازگی پہچانے گا۔ انہیں ایسی خالص شراب پلائی جائے گی جس پر مہر لگی ہوگی۔ اس کی مہر کستوری ہوگی اور اسی (کو حاصل کرنے) میں ان لوگوں کو مقابلہ کرنا لازم ہے جو (کسی چیز کے حاصل کرنے میں) مقابلہ کرنے والے ہیں۔“

حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کی یہی تگ و دو تھی۔ اور وہ اسی کے حصول میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صدقہ کرنے کا حکم فرمایا۔ اتفاقاً اس وقت میرے پاس بہت سا سامان تھا۔ میں نے سوچا: ’اَلْیَوْمَ اَسْبِقُ اَبَا بَكْرٍ اَنْ سَبَقْتُهٗ یَوْمًا ‘ ”آج میں ابوبکر سے سبقت لے جا سکتا ہوں اگر کسی دن اس پر سبقت لے جانا میرے لیے ممکن ہے۔ چنانچہ میں نے نصف مال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔

① حاکم: 306/4، صحیح الجامع: 1077 ② المطففین: 22-26

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنے اہل وعیال کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو؟ میں نے عرض کیا گھر پر اتنا مال ہی چھوڑ آیا ہوں۔ ادھر ابوبکر رضی اللہ عنہ تو سارا مال لے کر آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابوبکر اپنے اہل وعیال کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو؟ تو انہوں نے عرض کیا: میں ان کے لیے اللہ اور اس کا رسول چھوڑ آیا ہوں۔ میں نے کہا: 'لَا اَسْبِقُه' اِلٰی شَیْءٍ اَبَدًا' ''میں کبھی بھی ابوبکر سے سبقت نہیں لے جا سکوں گا۔''[1]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ فقراء صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: کہ دولت مند حضرات نے تو بلند درجات اور جنت کی دائمی نعمتوں کو حاصل کرلیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کس طرح؟ صحابہ نے عرض کیا وہ نماز پڑھتے ہیں جیسے ہم نماز پڑھتے ہیں، وہ روزہ رکھتے ہیں جیسے ہم روزہ رکھتے ہیں، وہ صدقہ کرتے ہیں مگر ہم صدقہ نہیں کرتے، وہ غلام آزاد کرتے ہیں ہم غلام آزاد نہیں کرتے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتلاؤں کہ تم اس کے ذریعے وہ درجات حاصل کرلو جو تم سے آگے بڑھ جانے والوں نے حاصل کیے ہیں اور تم اس کے ذریعے آگے بڑھ جاؤ گے ان سے جو تمہارے پیچھے ہیں اور تم سے کوئی بھی بہتر اور افضل نہ ہوگا، سوائے اس کے جو وہی عمل کرے جو تم کرتے ہو۔ صحابہ نے عرض کیا: ہاں، یا رسول اللہ وہ عمل بتلائیے۔ آپ نے فرمایا: ہر نماز کے بعد ۳۳، ۳۳، ۳۳ بار سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر پڑھا کرو۔ امراء صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کا علم ہوا تو وہ بھی یہ پڑھنے لگے۔ فقراء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہمارے مالدار بھائی بھی اسی طرح کرنے لگے ہیں جیسے ہم کرتے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا: یہ اللہ کا فضل ہے وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔[2]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک ساتھی نے غزوۂ احد کے دن رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: اگر میں کفار کے ہاتھوں شہید ہوجاؤں تو کہا جاؤں گا؟ آپ نے فرمایا: جنت میں، اس نے اپنے ہاتھ کی کھجوریں پھینک دیں پھر لڑا حتی کہ

---

[1] ترمذی: 3675، ابوداود: 1678 وغیرہ [2] بخاری: 843، مسلم: 595

شہید ہو گیا۔①

یہ اور اسی موضوع کی دیگر احادیث وواقعات سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے جذبۂ مسابقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ایک مسلمان اسی جذبہ پر عمل کر کے اللہ کی خوشنودی پاتا ہے اور بلند ترین مقام پر سرفراز ہو جاتا ہے۔ صفِ اوّل میں حاضری کا ثواب بھی اسی جذبۂ مسابقت سے حاصل ہوتا ہے۔ جمعہ کے روز اوّل وقت حاضر ہونا اور پہلی صفوں میں بیٹھنا اسی جذبہ کی تحریک ہے۔ سب سے پہلے صدقہ وخیرات کر کے دوسروں کے لیے مثال بننے والا ان کے صدقہ میں برابر کا اجر وثواب حاصل کرتا ہے۔ اسی جذبہ سے سرشار خوش نصیب وراثتِ دینی کی ادائیگی میں بھی کسی ملامت کی پروا نہیں کرتا اور تبلیغِ حق کا کوئی موقعہ ضائع نہیں ہونے دیتا۔ اور یہ سب توفیق انہیں "باذن اللہ" اللہ کے حکم سے حاصل ہوتی ہے۔ اس میں ان سابقین کے لیے بڑی تنبیہ ہے کہ یہ نیکی میں آگے بڑھنے کی سعادت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی خاص عنایت ہے اور یہ کمال بھی اللہ کی عطا ہے۔ اگر اللہ کی مرضی وتوفیق نہ ہو تو کوئی ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔

﴿ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ﴾ یہ بہت بڑا فضل ہے جو انہیں حاصل ہے۔ "ذلک" کا اشارہ "وراثت کتاب" اور "اصطفاء" کی طرف ہے۔ یعنی یہ بہت بڑا فضل ہے کہ انھیں اللہ نے اپنی کتاب کا وارث بنایا اور انھیں منتخب فرمایا۔ اور اس اشارے کا امورِ خیر میں سبقت لے جانے والے بھی مصداق ہیں کہ سابق بالخیرات کا اعزاز بہت بڑا فضل وانعام ہے کہ اللہ نے انہیں ہر نیکی میں کوئے سبقت لے جانے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ یہ خوش قسمت امت میں سب سے افضل ہیں جن کے پیشرو حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ ہیں۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہاں یہ بات بھی فرمائی ہے کہ جب اس آیت کا مصداق یہ امت ہے جسے کتاب کا وارث بنایا گیا ہے تو علمائے امت سب سے زیادہ اس اعزاز کے مستحق ہیں۔ علما ہی انبیاء کرام کے وارث ہیں۔ علم اور اہلِ علم کے مقام و مرتبہ کے لیے شائقین علامہ ابن عبدالبر کی جامع بیان العلم اور حافظ ابن قیم کی مفتاح دار السعادۃ ملاحظہ فرمائیں۔

---

①بخاری: 4046

﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا وَ لِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ٥﴾

(فاطر:۳۳)

''ہمیشگی کے باغات، جن میں وہ داخل ہوں گے، ان میں انہیں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور ان کا لباس ان میں ریشم ہوگا۔''

یہ انہی وارثین کتابِ حق کے لیے جنت کی بشارت ہے۔ ﴿يَدْخُلُوْنَهَا﴾ میں وہ تینوں گروہ شامل ہیں جو سب کے سب بالآخر جنت میں جائیں گے۔ خواہ بغیر محاسبہ کے جیسے سابقین ہیں، خواہ حسابِ یسیر یعنی کچھ محاسبہ کے بعد جیسے مقتصدین ہیں، خواہ سزا پانے کے بعد جیسے ظالمین ہیں۔ قرآنِ پاک کا ظاہر سیاق اسی کا متقاضی ہے جمہور مفسرین کی بھی یہی رائے ہے۔ بلکہ احادیثِ پاک سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابۂ کرام کی روایت قبل ازیں ہم ذکر کر آئے ہیں۔ ''ظالمین'' کی سزا کی نوعیت مختلف ہوگی۔ بعض وہ ہیں جنہیں محشر میں روک لیا جائے گا اور ان کی قسمت کا فیصلہ جلدی نہیں ہوگا، یہ مدت کتنی طویل ہوگی اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔ بالآخر اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے گا اور انہیں جنت میں جانے کا حکم فرمائے گا۔ بعض ظالمین ایسے بھی ہوں گے جن سے شرک کے علاوہ کچھ سنگین نوعیت کے جرائم سرزد ہوئے ہوں گے۔ جیسے عمداً قتلِ مسلم ہے، سود ہے، یا مالِ یتیم کھانے والے، زکوٰۃ نہ دینے والے، نماز نہ پڑھنے والے، تکبر کرنے والے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنے والے، اور دیگر اُن کبائر کا ارتکاب کرنے والے جن کے بارے میں جہنم کی وعید ہے۔ انہیں سزا کے بعد بالآخر جنت میں داخل کیا جائے گا۔

بعض مفسرین کی یہ رائے ہے کہ جنت کی بشارت ''سابقین بالخیرات'' کے لیے ہے۔ رہے پہلے دو گروہ تو انہیں اشارہ ہے کہ اپنے انجام کی فکر کریں اور اپنی حالت

سے نکل کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ یہ رائے علامہ زمخشری کی ہے اور اس میں ان کے اعتزال کا اثر ہے۔ یہی رائے امام رازی اور مولانا اصلاحی کی بھی ہے۔ مگر پہلے ہم حضرت ابن عباس، مجاہد، حسن بصری سے نقل کر آئے ہیں کہ وہ ''ظالم'' سے کافر مراد لینے کے ساتھ ساتھ جنت کی بشارت کا مستحق مقتصدین اور سابقین کو قرار دیتے ہیں اور سورۃ الواقعہ میں بیان ہونے والے مراتبِ ثلاثہ کی طرح ظالم کو اصحاب المشئمۃ اور مقتصدین کو اصحاب المیمنۃ اور سابقین کو سابقین الاوّلین میں شمار کرتے ہیں۔ اور مولانا اصلاحی نے اس کا حوالہ بھی دیا ہے اس لیے یہاں صرف ''سابقین بالخیرات'' ہی کو جنت کی بشارت کا حق دار سمجھنا درست معلوم نہیں ہوتا۔

﴿جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَهَا﴾ عدن کے معنی کسی جگہ قرار پکڑنے اور ٹھہرنے کے ہیں جس میں ہمیشگی کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ جہاں اطمینان ہو وہی ہمیشہ رہنے کی جگہ ہوسکتی ہے۔ اور وہ جنت ہے نہ کہ دنیا۔ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ﴿جنت عدن﴾ یعنی رہنے کی جگہ کو پہلے ذکر کیا اور اس میں داخل ہونے کو بعد میں۔ اس لیے کہ اس اسلوبِ بیان میں داخل ہونے والے کو اطمینان دلانا ہے اور داخلے سے پہلے مدخل ومسکن کا تعارف ہے تاکہ اسے کوئی توقف وتامل نہ ہو۔

﴿یُحَلَّوۡنَ فِیۡهَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَهَبٍ﴾ ﴿یُحَلَّوۡنَ﴾ میں اشارہ ہے کہ انہیں فوراً جنت میں داخل کیا جائے گا اور جنت میں داخل ہوتے ہی انہیں سونے کے کنگن پہنا دیے جائیں گے۔ یوں نہیں کہ ان کی قسمت کا فیصلہ ہونے کے بعد پہلے کنگن پہنائے جائیں گے پھر جنت میں داخل کیا جائے گا۔[1]

''اَسَاوِرَ'' جمع الجمع ہے 'اَسۡوِرَۃٌ' کی اور 'اَسۡوِرَۃٌ' جمع ہے 'سَوَارٌ' کی۔ اور اس سے قبل ''مِنۡ'' تبعیضیہ ہے۔ یعنی سونے کے بنے ہوئے بعض کنگن پہنائے جائیں گے۔ یہ مقربین کا زیور ہوگا ان کے علاوہ ''ابرار'' کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے جیسے ان کے بارے میں سورۃ الدھر میں ہے ﴿وَ حُلُّوۡۤا اَسَاوِرَ مِنۡ فِضَّۃٍ﴾[2] اور انہیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ جیسا کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ

---

[1] رازی وغیرہ [2] الدھر: 21

نے بیان کیا ہے۔ مگر علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ ہر جنتی کے ہاتھ میں ایک سونے کا ایک چاندی کا اور ایک موتیوں کا کنگن ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے سونے کے زیورات میں موتی جڑے ہوئے ہوں۔

﴿وَّ لُؤْلُؤًا وَ لِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ﴾ سونے کے علاوہ موتیوں کے زیور پہنائے جائیں گے اور ان کا لباس ریشم کا ہوگا۔ کفار سونے کے زیورات کو شرف وفضل سمجھتے تھے۔ فرعون نے بھی کہا تھا:

﴿فَلَوْ لَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ﴾ ①

''پس اس پر سونے کے کنگن کیوں نہیں ڈالے گئے۔''

دنیا کے بادشاہوں کا عموماً لباس بڑے کرّ وفر کا ہوتا تھا۔ ریشم کا لباس، اس پر ہیرے وجواہرات جڑے ہوئے، ہاتھوں میں سونے کے کنگن، ہیرے وجواہرات سے مرصع تاج، گلے میں بھی زیورات ،اور یہ ہوتے تھے ایک خطے اور علاقے کے بادشاہ۔ مگر ایک جنتی کو اور وہ بھی جو سب سے آخر میں جنت میں جائے گا، اس دنیا سے دس گنا جنت کا بادشاہ بنا دیا جائے گا۔ باقی آسائش اور آرام کا تو یہاں تصور ہی کیا ہے؟ اس کے شاہی لباس کا دنیا کے تناظر میں یہ ایک تصور ہے ورنہ کہاں دنیا کے یہ زیورات اور کہاں جنت کے زیورات وملبوسات! شَتَّانَ بَيْنَهُمَا

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک بادشاہ نے، ایک روایت میں ہے کہ اکیدر دومہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ریشم کی ایک چادر تحفۃً بھجوائی، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اسے ہاتھوں سے ٹٹولتے اور اس کی نرمی پر تعجب کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَتَعْجَبُوْنَ مِنْ لِيْنِ هٰذِهٖ؟ لَمَنَادِيْلُ سَعْدِ بْنِ مَعَاذٍ خَيْرٌ مِنْهَا ②

''کیا تم اس کی نرمی پر تعجب کرتے ہو؟ سعد بن معاذ کا (جنت میں) رومال اس سے بہتر ہے۔''

① الزخرف: 53 ② بخاری: 3802, 5836 وغیرہ

اس لیے دنیا کی کسی چیز کو جنت کی اشیاء سے کوئی تناسب نہیں۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت کی خاتون کو جو موتی پہنائے جائیں گے ان میں سے کم تر درجے کے موتی کی روشنی مشرق و مغرب کو روشن کر دے گی۔ ①

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'تَبْلُغُ الْحِلْيَةُ مِنَ الْمُؤْمِنِ حَيْثُ يَبْلُغُ الْوَضُوْءُ' ②

''مومن کا جہاں تک وضو پہنچتا ہے وہاں تک اس کا زیور پہنچے گا۔''

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ جنت کے زیور کا ذکر فرمایا کہ ان کو سونے چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے جن میں موتی اور یاقوت جڑے ہوئے ہوں گے، ان پر بادشاہوں کی طرح تاج ہوں گے، چہرے بے ریش ہوں گے، آنکھیں سرمگیں ہوں گی۔ ③

مومن مرد کے لیے دنیا میں ریشم کا لباس حرام ہے۔ اسی طرح سونے کا زیور بھی حرام ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے دیکھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہاتھ میں ریشم دوسرے میں سونا لیا پھر فرمایا:

'إِنَّ هٰذَيْنِ حَرَامٌ عَلٰى ذُكُوْرِ أُمَّتِيْ' ④

''بے شک یہ دونوں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں۔''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'مَنْ لَبِسَ الْحَرِيْرَ فِي الدُّنْيَا لَمْ يَلْبَسْهُ فِي الْآخِرَةِ' ⑤

''جو دنیا میں ریشم پہنتا ہے وہ جنت میں ریشم نہیں پہنے گا۔''

بلکہ حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

① ابن حبان، احمد ② مسلم: 250 وغیرہ ③ ابن کثیر

④ ابو داود: 4057، نسائی: 5148 ⑤ بخاری: 5834 وغیرہ

مَنْ لَبِسَ الْحَرِيْرَ فِي الدُّنْيَا لَمْ يَلْبَسْهُ فِي الْآخِرَةِ ، وَإِنْ دَخَلَ الْجَنَّةَ لَبِسَهُ أَهْلُ الْجَنَّةِ وَلَمْ يَلْبَسْهُ ، [1]

”جو دنیا میں ریشم پہنتا ہے وہ اسے آخرت میں نہیں پہنے گا، اور اگر وہ جنت میں داخل ہوا بھی تو اہلِ جنت اسے پہنیں گے، وہ اسے نہیں پہنے گا۔“

ریشم اور سونا پہننا ہی حرام نہیں بلکہ سونے اور چاندی کے برتن میں کھانا پینا بھی حرام ہے اور ریشم کے بستر بھی حرام ہیں۔ چناں چہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

’ نَهَانَا النَّبِيُّ ﷺ أَنْ نَّشْرَبَ فِي آنِيَةِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، وَأَنْ نَّأْكُلَ فِيهَا، وَعَنْ لُبْسِ الْحَرِيْرِ وَالدِّيْبَاجِ وَأَنْ نَجْلِسَ عَلَيْهِ ، [2]

”نبی ﷺ نے ہمیں سونے، چاندی کے برتنوں میں پینے اور کھانے سے منع فرمایا، اور ریشم اور دیباج پہننے سے اور ان پر بیٹھنے سے منع فرمایا۔“

”دیباج“ اسے کہتے ہیں جس کا پیٹا ریشم کا ہو۔ ابن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ مدائن میں تھے انھوں نے پینے کے لیے پانی طلب کیا تو ایک دہقان نے چاندی کے پیالے میں پانی پیش کیا۔ انھوں نے اُسے پھینک دیا اور فرمایا: میں اسے نہ پھینکتا، میں نے اسے اس سے منع کیا مگر وہ باز نہیں آیا، اس لیے اسے پھینک دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”سونا، چاندی، ریشم اور دیباج یہ دنیا میں کافروں کے لیے ہیں اور جنت میں تمھارے لیے۔“ [3]

بلکہ مسلم وغیرہ میں ہے کہ انھوں نے اس پیالے کو توڑ دیا اور اسے اس کے منہ پر مارا تھا۔ [4]

---

① نسائی کبریٰ: 471/5، رقم: 9611، ابن حبان: 397/7، رقم: 5413

② بخاری: 5837 ③ بخاری: 5831،5632 ④ فتح الباری: 95/10

ضرورتاً دو انگلیوں کے برابر ریشم کا ٹکڑا پیوند کے طور پر لگانے کی اجازت ہے۔
اسی طرح خارش کی وجہ سے آپ ﷺ نے حضرت زبیر اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کو ریشم پہننے کی اجازت دی تھی۔ ①

عام حالات میں مردوں کے لیے اس کا لباس بہرحال حرام ہے اور سونا پہننا بھی حرام ہے۔ عورتوں کے لیے ریشم اور سونا پہننا جائز ہے تاہم ریشم کے بستر دونوں کے لیے حرام ہیں اور مرد چاندی کی انگوٹھی پہن سکتے ہیں، اور سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا بھی دونوں کے لیے حرام ہے۔

① بخاری

﴿وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُۨ ۝ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ۝﴾ (فاطر: ٣٤، ٣٥)

''اور وہ کہیں گے سب تعریف اس اللہ کی ہے جس نے ہم سے غم دور کر دیا، بے شک ہمارا رب یقیناً بے حد بخشنے والا، نہایت قدر دان ہے۔ جس نے ہمیں اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے گھر میں اتارا، نہ ہمیں اس میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے اور نہ ہمیں اس میں کوئی تھکاوٹ پہنچتی ہے۔''

اہلِ جنت جب جنت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے تمام وعدوں کی صداقت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو بے ساختہ پکاریں گے: الحمد للہ۔ ایک دوسرے مقام پر اس کی کچھ تفصیل ہے:

﴿دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [1]

''ان کی دعا ان میں یہ ہوگی: ''پاک ہے تُو اے اللہ!'' اور ان کی آپس کی دعا اس میں ''سلام'' ہوگی اور ان کی دعا کا خاتمہ یہ ہوگا کہ سب تعریف اللہ کے لیے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔''

گویا جب جنت کی بہار دیکھیں گے یا کسی چیز کو چاہیں گے تو سبحان اللہ کہیں گے۔ باہم ملتے ہوئے فرشتے اور خدام آتے جاتے سلام، سلام کہیں گے، اور ہر تازہ نعمت سے مستفید ہونے پر الحمد للہ رب العالمین کہیں گے۔

---

[1] یونس: 10

یہاں جنت میں چلے جانے کے بعد جب تمام غم ختم ہوجائیں گے تو اہلِ جنت سکھ کا سانس لیں گے اور اللہ کا شکر اور اس کی حمد وثنا بیان کریں گے۔

غم سے کیا مراد ہے؟ اہل تفسیر کی آرا مختلف ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ ہر قسم کا غم اس کا مصداق ہے۔ دنیا دار الحزن ہے، اور اس میں جو ہموم وغموم ہیں جنت میں وہ بھی سب ختم۔ دنیا میں حسنات کی قبولیت وعدمِ قبولیت کا غم، قبر وقیامت کا غم، حساب کتاب کا غم، جہنم کا غم، غرض یہ کہ جنت میں نہ ماضی کا پچھتاوا نہ مستقبل کا غم۔ دنیا میں مومن کو فکر وغم سے فرصت نہیں بلکہ دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے۔ جنت میں اللہ تعالیٰ تمام غموں سے نجات دے دے گا، بلکہ اس میں جنت کی نعمتوں کے دائمی ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے کیوں کہ جیسے غم کسی چیز کے نہ ملنے کا ہوتا ہے اسی طرح حاصل ہونے کے بعد اس کے چھن جانے کا بھی ہوتا ہے۔ گویا اب مومن ہمیشہ عیش وعشرت سے رہیں گے اور موت کو بھی وہاں موت آجائے گی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے امام طبرانی رحمہ اللہ کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لا الٰہ الا اللہ پڑھنے والوں کو نہ موت کے وقت گھبراہٹ ہوگی، نہ قبر میں نہ محشر میں، گویا میں ان کو صور پھونکے جاتے وقت دیکھ رہا ہوں، وہ اپنے سروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے اور کہتے ہوئے اٹھیں گے: 'اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ'

مگر یہ روایت صحیح نہیں۔ علامہ ہیثمی نے اسے مجمع الزوائد[1] میں ذکر کرکے فرمایا ہے:

((فِیْهِ جَمَاعَةٌ لَمْ اَعْرِفْھُمْ))

''اس میں راویوں کی ایک جماعت ہے جنھیں میں نہیں پہچانتا۔''

---

[1] مجمع الزوائد: 333/10

اسی طرح ابن ابی حاتم سے بھی انھوں نے ایک حدیث تقریباً انھی الفاظ سے ذکر کی ہے مگر اس میں بھی عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم راوی ضعیف ہے۔ اور معناً بھی اس میں نکارت پائی جاتی ہے، نیز دیکھیے العلل المتناہیہ۔ ①

﴿اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ﴾ ہمارا رب بڑا غفور ہے، اس کی بندگی میں ہم سے جو کمی کوتاہی ہوئی اس نے اسے معاف کر دیا۔ ''شکور'' ہے کہ ہماری ایک ایک نیکی کا پھل ہمیں ملا ہے بلکہ ہماری توقعات سے کہیں بڑھ کر ملا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ان دونوں صفات کے بارے میں پہلے آیت نمبر ۳۰ کے تحت ضروری وضاحت گزر چکی ہے اس کی طرف مراجعت کر لی جائے۔

﴿الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ ''جس نے محض اپنے فضل واحسان سے ہمیشہ رہنے والے گھر میں ہمیں اتارا ہے۔'' گویا یہ ہمارے اعمال کا نتیجہ نہیں اس کا فضل ہے۔ اس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ''دَارُ الْمُقَامَةِ'' ہے۔ ہمیشہ رہنے کا گھر ہے۔ رہنے کی جگہ تو دنیا میں بھی تھی مگر ہمیشگی کے لیے نہیں۔ دنیا سے قبر میں، قبر سے حشر میں۔ دار المقامہ کو ''جَنَّةُ الْخُلْدِ'' بھی کہا گیا ہے۔ ②

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی کو ''نصب'' یعنی تکلیف اور مشقت نہیں اٹھانی پڑے گی، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا:

﴿لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا﴾ ③

''بے شک ہم نے اپنے اس سفر سے تو بڑی مشقت پائی۔''

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ''لغوب'' (کسی قسم کی تھکاوٹ) نہیں ہوگی۔ دنیا میں گھر تھے مگر وہاں آنے جانے میں مشقت اور اس کے نتیجے میں تھکاوٹ۔ مگر یہاں نہ مشقت نہ ہی تھکاوٹ کہ آرام کی فکر ہو۔ بلکہ ہر لمحہ چاق چوبند ہوں گے۔

① العلل المتناهية: 431/2 ② الفرقان: 15 ③ الكهف: 62

''نصب'' اور ''لغوب'' دونوں لفظ تھکاوٹ کے معنی میں مستعمل ہیں، تاہم امام رازی نے فرمایا ہے کہ نصب کا اطلاق تھکاوٹ کے سبب پر ہوتا ہے: 'هو السبب للاعياء' امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دونوں کی نفی سے مراد جسمانی اور روحانی تھکاوٹ کی نفی بھی ہو سکتی ہے۔ انسان کو بہترین گھر اور بہترین عیش بھی حاصل ہو تو اس میں ہمیشہ رہنے میں بھی اکتاہٹ سی محسوس کرتا ہے، مگر جنت میں یہ اکتاہٹ بھی نہیں ہوگی۔ اس میں متنوع لازوال عیش ہوگا۔

﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا﴾ [1]

''ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، وہ اس سے جگہ بدلنا نہ چاہیں گے۔''

کیوں کہ وہاں ہر لمحہ اور ہر آن نئی شان بان اور نئی کشش ہوگی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے کیا خوب فرمایا ہے:

''فردوسی زندگی سے لوگ منتقل اس لیے نہیں ہونا چاہیں گے کہ اس زندگی میں لامحدود کمالات رکھنے والی ذات اپنے انھی لامحدود کمالات کو لامحدود کلمات کے ذریعے ظاہر کرتی رہے گی۔ انسانی احساسات اپنے اردگرد، پس وپیش، اندر وباہر، ہر لمحہ ہر لحظہ ایسی نت نئی تجلیات کو مسلسل بغیر کسی انقطاع کے چاہتے چلے جائیں گے جن کی نہ کوئی حد ہوگی نہ انتہا۔ اور یوں لامحدود مطالبات والی فطرت کو لامحدود مطلوبات سے متمتع اور لذت گیر ہونے کا موقع ابد الآباد تک ملتا جائے گا۔ اس وقت تک جس کی کوئی انتہا نہیں اور جس کا کوئی اختتامی نقطہ نہیں۔'' [2]

---

[1] الکہف: 108 [2] اسلامی معاشیات: 141

﴿وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ﴾ (فاطر:۳٦)

''اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے جہنم کی آگ ہے، نہ ان کا کام تمام کیا جائے گا کہ وہ مر جائیں اور نہ ان سے اس کا کچھ عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا۔ ہم ایسے ہی ہر ناشکرے کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔''

اس سے پہلے اللہ کی آیات کی تلاوت کرنے والوں، نماز پڑھنے والوں اور انفاق فی سبیل اللہ کرنے والوں کو جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ یہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نافرمانی اور ناشکری کرنے والوں کے انجام سے خبردار کیا گیا ہے کہ ان کے لیے جہنم کی آگ ہے۔ آگ تو بہرحال آگ ہے، مگر وہ جہنم کی آگ میں جائیں گے جو دنیا کی آگ سے ستر گنا زیادہ سخت ہوگی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'نَارُكُمْ هٰذِهٖ مَا يُوْقِدُ بَنُوْ آدَمَ جُزْءٌ وَاحِدٌ مِنْ سَبْعِيْنَ جُزْءً مِنْ نَّارِ جَهَنَّمَ' [1]

''تمھاری یہ آگ، جسے اولادِ آدم جلاتی ہے، جہنم کی آگ کے ستر حصوں کا ایک حصہ ہے۔''

﴿لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ﴾ دنیا کی آگ میں انسان جل کر مر جاتا ہے۔ جہنمی چاہیں گے کہ مر جائیں مگر مریں گے نہیں۔ وہ جہنم کے فرشتے سے کہیں گے:

﴿وَ نَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ﴾ [2]

---

[1] مسلم: 2843، مسند احمد: 467/2 [2] الزخرف: 77

”اور وہ پکاریں گے: اے مالک! تیرا ربّ ہمارا کام تمام ہی کر دے۔ وہ کہے گا: بے شک تم (یہیں) ٹھہرنے والے ہو۔“

”مالک“ سے مراد جہنم کا فرشتہ ہے۔ جہنمی اس سے کہیں گے: کہ اللہ ہمیں موت دے دے، ہماری ارواح قبض کر لے، تاکہ ہمیں آرام آ جائے۔ فرشتہ جواب دے گا: یوں نہیں ہوگا، تم یہیں رہو گے۔ مر کے آرام پانے کا تصور تو کیا، یہاں تو عذاب میں تخفیف بھی نہیں ہوگی:

﴿ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَ هُمْ فِيهِ مُبْلِسُوْنَ ۝ ﴾ [1]

”وہ ان سے ہلکا نہیں کیا جائے گا اور وہ اسی میں نا امید ہوں گے۔“

جو اللہ کا انکار کرتا ہے اور حق کی تکذیب کرتا ہے اس کا یہی انجام ہے۔ جہنمیوں کے بارے میں ایک وضاحت حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

((أَمَّا أَهْلُ النَّارِ الَّذِينَ هُمْ أَهْلُهَا، فَإِنَّهُمْ لَا يَمُوتُونَ فِيهَا وَلَا يَحْيَوْنَ، وَلٰكِنْ نَاسٌ أَصَابَتْهُمُ النَّارُ بِذُنُوبِهِمْ (أَوْ قَالَ: بِخَطَايَاهُمْ) فَأَمَاتَتْهُمْ إِمَاتَةً حَتّٰى إِذَا كَانُوا فَحماً أُذِنَ بِالشَّفَاعَةِ، فَجِيءَ بِهِمْ ضَبَائِرُ ضَبَائِرُ، فَبُثُّوا عَلٰى أَنْهَارِ الْجَنَّةِ، ثُمَّ قِيلَ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ! أَفِيضُوا عَلَيْهِمْ، فَيَنْبُتُونَ نَبَاتَ الْحِبَّةِ تَكُونُ فِي حَمِيلِ السَّيْلِ)) [2]

”وہ جہنمی جو جہنم کے اصل مستحق ہیں (اور ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں) وہ تو اس میں نہ مریں گے نہ جییں گے، لیکن کچھ لوگ جنھیں ان کی غلطیوں اور گناہوں کی وجہ سے جہنم پکڑ لے گی، وہ انھیں ایک بار فوت کر دے گی حتی کہ جب وہ جل کر کوئلہ ہو جائیں گے تو ان کے حق میں شفاعت کی اجازت مل جائے گی، چنانچہ انھیں گروہ گروہ کر کے لایا جائے گا اور جنت کی نہروں (کے کنارے) پر بکھیر دیا جائے گا، پھر کہا

[1] الزخرف: 75 [2] مسلم: 185، ابن ماجه: 4309

جائے گا: جنت والو! ان پر پانی ڈالو۔ پانی سے وہ اس طرح اگیں گے
جس طرح سیلاب کی لائی ہوئی مٹی میں دانہ اُگتا ہے۔‘‘

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن گناہ گار کو سزا پانے کے بعد جہنم سے نکال لیا جائے گا اور اس پر یک گونہ موت طاری ہوگی مگر کافر ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور اس کو موت بھی نہیں آئے گی۔ (اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْ نَّارِ جَھَنَّمَ)

﴿وَ هُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِىْ كُنَّا نَعْمَلُ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَ جَآءَكُمُ النَّذِيْرُ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ﴾ (فاطر:۳۷)

''اور وہ اس میں چلائیں گے، اے ہمارے ربّ! ہمیں نکال لے، ہم نیک عمل کریں گے، اس کے خلاف جو ہم کیا کرتے تھے۔ اور کیا: ہم نے تمھیں اتنی عمر نہیں دی کہ اس میں جو نصیحت حاصل کرنا چاہتا حاصل کر لیتا اور تمھارے پاس خاص ڈرانے والا بھی آیا۔ پس چکھو کہ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔''

جہنمی چیخیں گے، چلائیں گے۔ ''يَصْطَرِخُوْنَ'' صَرَخَ سے ہے۔ جسے عذاب دیا جا رہا ہو، اس کی آواز پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، جو داد خواہی اور فریاد رسی کے لیے ہوتی ہے۔

''سَمِعْتُ صَارِخَةَ الْقَوْمِ'' یعنی میں نے قوم کی داد خواہی کی آواز سنی۔ جہنمیوں کی چیخ و پکار بھی اسی لیے ہوگی کہ کوئی ہماری مدد کے لیے پہنچے۔ مدد کے لیے تو کوئی آئے گا نہیں۔ اللہ ربّ العزت سے کہیں گے ہمیں جہنم سے نکال، اب ہم اچھے عمل کریں گے۔ دنیا میں توحید کا انکار کیا، آئندہ ہم اس کا اقرار کریں گے۔ پہلے ہم نے شب و روز نافرمانیوں میں گزارے، آئندہ فرمانبرداری میں بسر کریں گے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ جنتی جنت سے نکلنے کی خواہش نہیں کریں گے کہ وہ دار المقامہ ہے۔ مگر جہنمی جہنم سے نکلنے کے لیے چلائیں گے کہ وہ ٹھہرنے کے لیے نہیں بلکہ عذاب کے لیے بنائی گئی ہے۔

اس میں ان کے اپنے جرم کا اعتراف ہے اور ان کی گمراہی کی طرف اشارہ بھی ہے کہ وہ یوں نہیں کہیں گے کہ اے اللہ! آپ نے جنتیوں پر تو بڑا احسان فرمایا اور

اپنے فضل سے انھیں بہت کچھ نوازا، ہم گناہ گار ہیں، مجرم ہیں، آپ کے فضل کے زیادہ مستحق ہیں، اپنے شایانِ شان معاف کر دے یا عذاب میں تخفیف فرما دے، ہمارے ساتھ وہ معاملہ نہ فرما جو تیرے عدل کے مطابق ہے اور ہم اس کے مستحق ہیں بلکہ اپنے عفو و بخشش کا معاملہ فرما۔ مگر اس کی بجائے کہیں گے: ہمیں یہاں سے نکال لے، آئندہ ہم نیک عمل کریں گے۔

یہ پچھتاوا جہنم میں جا کر ہی نہیں موت کے وقت بھی ہوگا، جیسے فرمایا:

﴿حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ○ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا﴾ [1]

”یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے پاس موت آتی ہے تو کہتا ہے: اے میرے ربّ! مجھے واپس بھیجو تا کہ میں جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں کوئی نیک عمل کرلوں۔ ہرگز نہیں!“

میدانِ محشر میں بھی یہی التجا کریں گے:

﴿وَ لَوْ تَرٰٓی اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ○﴾ [2]

”اور کاش! تُو دیکھے جب مجرم لوگ اپنے ربّ کے پاس اپنے سر جھکائے ہوں گے: اے ہمارے ربّ! ہم نے دیکھ لیا اور ہم نے سن لیا، پس ہمیں واپس بھیج ہم نیک عمل کریں گے، بے شک ہم یقین کرنے والے ہیں۔“

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تو اس برے وقت سے پہلے ہی خبردار کر دیا ہے:

﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ○ وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا وَاللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ○﴾ [3]

---

[1] المؤمنون: 99، 100 [2] السجدۃ: 12 [3] المنافقون: 10، 11

”اور اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمھیں دیا ہے، اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے، پھر وہ کہے: اے میرے ربّ! تُو نے مجھے قریب مدت تک مہلت کیوں نہ دی کہ میں صدقہ کرتا اور نیک لوگوں میں سے ہو جاتا۔ اور اللہ کسی جان کو ہرگز مہلت نہیں دیتا جب اس کا وقت آجائے۔ اور اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے جو تم کر رہے ہو۔“

یہی بات سورۂ ابراہیم[1] میں بھی بیان ہوئی ہے۔ دنیا میں خبردار کر دینے کے بعد اس کی تمنا بے کار ہے۔ نہ موت سے چھٹکارا ہے اور نہ جہنم سے بچنے کی کوئی سبیل۔

﴿اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ﴾ کیا ہم نے تمھیں پہلے عمر نہیں دی تھی؟ تب تو تم نے کوئی نصیحت نہیں پکڑی تو آئندہ کیا کرو گے۔ اس سے مراد کتنی عمر ہے؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح ترین قول یہ ہے کہ وہ ساٹھ سال کی ہے، یہی قول حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔ بلکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’أَعْذَرَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلَى امْرِئٍ أَخَّرَ عُمُرَهٗ حَتّٰى بَلَّغَهٗ سِتِّيْنَ سَنَةً‘[2]

”اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے کوئی عذر نہیں چھوڑا جس کی عمر لمبی کی، حتی کہ اسے ساٹھ سال تک پہنچا دیا۔“

اتنی عمر پانے والا یہ عذر نہیں کرسکتا کہ مجھے مہلت نہیں ملی۔ امام بخاری رحمہ اللہ اور شارح صحیح بخاری کا بھی یہی موقف ہے۔[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو راجح کہا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ عمر چالیس سال ہے، یہ موقف امام ابن جریر رحمہ اللہ کا ہے اور یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، طاؤس رحمہ اللہ، حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ہے۔ تیسرا قول ستر سال کا ہے۔ مگر صحیح پہلا قول ہے کیوں کہ صحیح حدیث میں اس کی تصریح ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس حدیث کی صحت میں تامل کیا ہے مگر ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا:

---

[1] ابراھیم: 44 [2] بخاری: 6419 [3] فتح الباری: 239/11

'لَا يُلْتَفَتُ إِلَيْهِ بَعْدَ تَصْحِيحِ الْبُخَارِيِ'

''امام بخاری کی تصحیح کے بعد ابن جریر کا قول نا قابلِ التفات ہے۔''

اطباء کہتے ہیں کہ انسان کی طبعی عمر ایک سو بیس سال ہے۔ ساٹھ سال کے بعد اس میں ضعف واضمحلال شروع ہو جاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'أَعْمَارُ أُمَّتِي بَيْنَ السِّتِّيْنَ إِلَى السَّبْعِيْنَ، وَأَقَلُّهُمْ مَنْ يَّجُوْزُ ذٰلِكَ' (1)

''میری امت کی عمر ساٹھ سے ستر سال کے مابین ہے اور بہت کم اس سے آگے بڑھنے والے ہوں گے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی دی ہوئی عمر کو غنیمت سمجھ کر اسے اللہ کی اطاعت میں صرف کرنا چاہیے۔ مومن صادق کے لیے طویل عمر ایک بڑی نعمت ہے جبکہ کفر وعصیان میں زندگی گزارنے والے کے لیے طویل عمر وبال جان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سائل نے پوچھا: بہتر انسان کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

((خَيْرُكُمْ مَنْ طَالَ عُمُرُهُ وَحَسُنَ عَمَلُهُ' قَالَ: فَأَيُّ النَّاسِ شَرٌّ؟ قَالَ: 'مَنْ طَالَ عُمُرُهُ وَسَاءَ عَمَلُهُ)) (2)

''تم میں سے بہتر وہ ہے جس کی عمر لمبی اور عملِ نیک ہو۔'' سائل نے کہا: لوگوں میں سے برا کون ہے؟ فرمایا: ''وہ جس کی عمر لمبی اور عمل برا ہو۔''

مومن زندگی میں نیک عمل کر کے جنت میں بلند مقام حاصل کرتا ہے جبکہ کفر وعصیان میں مبتلا انسان اپنے لیے جہنم کی گہرائیوں میں اترنے کا سامان تیار کرتا ہے۔

ساٹھ سے ستر سال کے مابین امت کے افراد کی عمومی عمر ہے۔ انسان ساٹھ سال کا ہو جائے تو اسے اپنے آخری وقت سے غافل نہیں ہونا چاہیے بلکہ جانے کی

(1) ترمذی: 3550، ابن ماجہ: 4236، ابن حبان وغیرہ (2) ترمذی: 2330 وغیرہ

تیاری دوچند ہو جانی چاہیے۔ ساٹھ کے بعد تو گویا رعایتی عمر مل رہی ہے۔ اسے غنیمت سمجھ کر رضائے الٰہی میں بسر کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

﴿وَ جَآءَكُمُ النَّذِيرُ﴾ علاوہ ازیں تمھارے پاس خبردار کرنے والا بھی آیا۔ اس کے بعد اب کیوں کر مہلت طلب کرتے ہو۔ ''النذیر'' سے مراد رسول ہے۔ بلکہ جب جہنم میں داخل ہوں گے تب ہی فرشتہ اس کے بارے میں سوال کرے گا، جیسے فرمایا:

﴿كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝﴾ [1]

''جب بھی کوئی گروہ اس میں ڈالا جائے گا، اس کے نگران ان سے پوچھیں گے: کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں! یقیناً ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تو ہم نے جھٹلا دیا اور ہم نے کہا: اللہ نے کوئی چیز نہیں اتاری تو تم ایک بڑی گمراہی میں ہی پڑے ہوئے ہو۔''

بلکہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک کسی کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتے جب تک اس کے پاس رسول نہ بھیجا جائے، جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل [2] میں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، عکرمہ، ابوجعفر باقر، قتادہ اور سفیان بن عیینہ رحمہم اللہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد بڑھاپا اور بالوں کی سفیدی ہے۔ گویا بڑھاپا بھی اللہ کی طرف سے پیغام ہے کہ کھیل تماشے کا وقت گزر گیا۔ اب چل چلاؤ کا وقت آ گیا ہے، اللہ سے ڈرنا چاہیے اور آخرت سنوارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

بعض نے کہا ہے: اس سے مراد اقارب واحباب کی موت ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] الملك: 8,9 [2] بنی اسرائیل: 15

'أَكْثِرُوْا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ يَعْنِي الْمَوْتَ' [1]

''لذتوں کو ختم کر دینے والی موت کو اکثر یاد کیا کرو۔''

ایک ضعیف روایت میں ہے:

'كَفٰى بِالْمَوْتِ وَاعِظاً' [2] ''سمجھانے کے لیے موت کافی ہے۔''

ایک عورت نے سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے قساوتِ قلب کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا: ''موت کو اکثر یاد کرو اس سے دل نرم ہو جاتا ہے۔'' [3]

قبروں کی زیارت کی اجازت بھی اسی لیے دی کہ اس سے آخرت یاد آتی ہے اور دنیا سے بے رغبتی ہوتی ہے۔ غرضیکہ تمھاری نصیحت کے لیے نبی بھیجے، دوسرے طریقوں سے بھی تمھیں خبردار کیا گیا مگر تمھاری آنکھیں نہ کھلیں۔ لہٰذا آج تم اللہ کا عذاب چکھو، تم خواہ کتنا ہی چیخو چلاؤ، تمھاری مدد کو کوئی نہیں آئے گا۔ جن کے بارے میں تم سمجھتے تھے یہ آڑے وقت ہماری مدد کریں گے وہ بھی جواب دے دیں گے۔

① ترمذی: 2307، نسائی: 1825 ② السلسلة الضعيفة، رقم: 502

③ التذكرة للقرطبي: 21

﴿اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ (فاطر:۳۸)

''بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کی چھپی چیزیں جاننے والا ہے، بے شک وہ سینوں کی باتوں کو خوب جاننے والا ہے۔''

یہ کفار کے دائمی عذاب کی ایک دلیل ہے، اور اس اشکال کا بھی جواب ہے کہ کفر وشرک کی زندگی تو محدود اور چند روز کی ہے، اس کے بدلے میں دائمی عذاب اللہ کی رحمت کے منافی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ ہر چھپی اور مخفی بات کو جاننے والا ہے۔ تمام کے احوال اس پر آشکارا ہیں۔ انسانوں کے دلوں کی باتیں بھی وہی جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر ان کفار کو مہلت دے دی جائے تو وہ وہی کچھ کریں گے جو پہلے کرتے رہے ہیں، اس لیے جو یہ کہہ رہے ہیں کہ مہلت ملے تو ہم نیک زندگی گزاریں گے، یہ محض جھوٹ ہے۔ اللہ ان کے جھوٹ کو خوب جانتے ہیں، جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴾ [1]

''اور اگر انھیں واپس بھیج دیا جائے تو ضرور پھر وہی کریں گے جس سے انھیں منع کیا گیا تھا اور بلاشبہ یقیناً وہ جھوٹے ہیں۔''

اس لیے اگر دوبارہ انھیں زندگی دے دی جائے تو یہ پھر بھی وہی کچھ کریں گے جو پہلے کرتے رہے ہیں۔ ہم نے کیا پہلے انھیں کم عمر دی تھی کہ آج یہ مہلت کا بہانہ ڈھونڈ رہے ہیں! اگر انھیں موت نہ آتی اور انھیں ہمیشہ کی زندگی دے دی جاتی تو بھی کافر ہی رہتے۔ موت کی وجہ سے ان کا کفر وشرک ختم ہوا ہے خود انھوں نے کفر نہیں چھوڑا۔ ہر بیماری وتکلیف کا ایک سبب ہوتا ہے سبب دور ہو جائے تو بیماری

[1] الأنعام: 28

زائل ہو جاتی ہے یوں کفروشرک کی بیماری ان کی روح کے ساتھ پیوست ہے۔
'وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا' میں اشارہ ہے کہ اگر انھیں دوبارہ زندگی دے دی جائے تو پھر بھی کفر وشرک کا مظاہر کریں گے کیونکہ کفراور ان کی روح لازم ملزوم ہیں لہٰذا جب کفر دور نہیں ہوگا تو عذاب بھی ختم نہیں ہوگا۔

نیز یہ اس کی بھی دلیل ہے کہ فی الواقع ان ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا کیوں کہ اللہ ذوالجلال والاکرام کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ زمین وآسمان کی کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں۔ اگر ان کے کسی مددگار کا کسی وقت پہنچنا ممکن ہوتا تو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا اور اللہ تعالیٰ اس کی نفی نہ کرتے۔ اس لیے دونوں اعتبار سے یہ آیت کفار کے دائمی عذاب کی دلیل ہے۔

:: :: ::

﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَیْهِ كُفْرُهٗ وَ لَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا وَ لَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا۝﴾ (فاطر:۳۹)

''وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں جانشین بنایا، پھر جس نے کفر کیا تو اس کا کفر اسی پر ہے اور کافروں کو اُن کا کفران کے ربّ کے ہاں ناراضی کے سوا کچھ زیادہ نہیں کرتا اور کافروں کو ان کا کفر اُن کے ربّ کے ہاں خسارے کے سوا کچھ زیادہ نہیں کرتا۔''

یہ خطاب عام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی تمھیں زمین پر خلیفہ بنایا ہے۔ ایک کے بعد دوسرا، اور اس کے بعد تیسرا۔ جس جگہ، جس مکان اور محل کو آج تم اپنی ملکیت کہتے ہو یہ کل کسی اور کی ملکیت تھا، تمھارے بعد کوئی اور اس کا دعوے دار ہوگا یوں یہ سارا سلسلہ اسی اللہ کا قائم کیا ہوا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا گیا ''یا خلیفۃ اللہ!'' تو انھوں نے فرمایا: ''میں اللہ کا نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ ہوں۔''[1]

''خلائف'' خلیفہ کی جمع ہے اور ''خلفاء'' خلیف کی جمع ہے۔ اس کا اصل مادہ ''خَلَفٌ'' ہے جس کے معنی ''پیچھے'' کے ہیں جو ''قدام'' یعنی ''آگے'' اور ''سَلَف'' کی ضد ہے۔ اور خَلَفٌ کے معنی پیچھے رہ جانے، کسی کا جانشین ہونے، قائم مقام اور گدی نشین ہونے کے ہیں اور جو درجے و مرتبے میں گرا ہوا ہو، نالائق ہو اسے خَلْفٌ کہتے ہیں، اسی بنا پر ردی چیز کو ''خَلْفٌ'' کہتے ہیں۔[2] قرآنِ مجید میں ہے۔

﴿فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا

---

[1] قرطبی [2] (مفردات)

الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ یَلۡقَوۡنَ غَیًّا ﴿ﮐ﴾ [1]

''پھر ان کے بعد ایسے نالائق جانشین ان کی جگہ آئے جنھوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے تو وہ عنقریب گمراہی کو ملیں گے۔''

خلیفہ یا الخلافت کے معنی دوسرے کا نائب ہونے کے ہیں، خواہ یہ نیابت کسی کی غیر حاضری کی وجہ سے ہو یا موت کی وجہ سے یا محض نائب کے شرف وفضل کی غرض سے ہو۔

یہاں ''خلائف'' سے مراد پہلی نسل کے بعد ان کی جانشین نسل مراد ہے یا پہلی قومِ یہود کے بعد بنو اسماعیل کی یا امت محمدیہ کی جانشینی بھی ہوسکتی ہے۔ یہود کو جس شرف وفضل سے نوازا گیا تھا وہ اپنی مسلسل بدعہدیوں کے نتیجے میں اس منصب کے اہل نہ رہے تو ان کی جگہ اس امت یا بنو اسماعیل کو ان کا جانشین بنایا۔ علامہ ابوحیان نے فرمایا ہے کہ ظاہراً یہ خطاب عام ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا مصداق اہلِ مکہ ہیں۔ [2]

خلافت اور ایک دوسرے کی جانشینی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دنیا دار القرار نہیں دار الفنا ہے۔ یہاں کی لذتیں بھی عارضی اور یہاں کے آلام ومصائب بھی عارضی ہیں بلکہ یہاں کی ہر چیز عارضی ہے۔ جو بھی آیا ہے اس نے یہاں سے جانا ہے۔ آنے والوں کو چلے جانے والوں سے سبق سیکھنا چاہیے کہ انھوں نے اپنے پیچھے نیک نامی کمائی ہے یا بدنامی۔ انھوں نے توحید اور اتباعِ سنّت کی راہ اختیار کر کے اللہ کی رضا حاصل کی ہے یا شرک وکفر اور ضلالت کا طریقہ اختیار کر کے اللہ کی ناراضی مول لی ہے۔ اس لیے آنے والوں اور دوسروں کا جانشین بننے والوں کو خبر دار رہنا چاہیے کہ اگر تم نے بھی نافرمانی کی اور وہی روش اختیار کی جو تم سے پہلوں نے اختیار کی تھی تو تم اسی انجام سے دوچار ہوگے جس سے وہ ہوئے تھے۔ یہ جانشینی اور خلافت بھی تمھیں متنبہ کر رہی ہے کہ یہ سلسلہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا نہیں۔ ایک کی جگہ دوسرے کو یہاں لا بسانا ایک بے مقصد اور عبث شغل نہیں ہے۔ کسی خرابی کے بعد گھر

[1] مریم: 59 [2] البحر المحیط

تعمیر کرنے والے کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمھیں تمکنت دی ہے اس میں بھی ایک مقصد کارفرما ہے اور وہ ہے تمھارا امتحان کہ تم کیا کرتے ہو، جیسا کہ سورۃ الاعراف ① اور یونس ② میں بیان ہوا ہے۔ اللہ نے تمھیں عقل وشعور عطا فرمایا، تمھیں سمجھانے کے لیے ''النذیر'' بھیجا۔ جس نے تمھیں تمھارے سابقین کے انجام سے خبردار کیا کہ اب تمھیں خود فیصلہ کرنا ہے کہ تم نے بھی بغاوت وسرکشی کر کے نشانِ عبرت بننا ہے یا اطاعت گزار بن کے کامیاب ہونا ہے۔ یہ سارا نظام بتلا رہا ہے کہ ایک دن تم نے اپنے اللہ کے ہاں حاضر ہونا ہے، تب تمھیں وہ بتلائے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔

﴿فَمَنْ كَفَرَ﴾ جو کفر وعصیان کی زندگی گزارے گا اس کا نقصان اور وبال اسی پر ہوگا۔ اللہ کا اس میں کوئی نقصان نہیں۔ ایک شخص ہی کیا:

﴿اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ﴾ ③

''اگر تم اور وہ لوگ جو زمین میں ہیں، سب کے سب کفر کرو تو بے شک اللہ یقیناً بڑا بے پروا، بے حد تعریف والا ہے۔''

ان کا کفر اللہ کی ناراضی میں اور خود ان کے نقصان اور خسارے میں اضافے کا باعث بنے گا۔

﴿مَقْتًا﴾ کے معنی ناخوشی، ناراضی، ناپسندیدگی اور سخت غصے کے ہیں۔ اپنی ماؤں سے نکاح کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا ۭ وَسَآءَ سَبِيْلًا﴾ ④

''بے شک یہ ہمیشہ سے بڑی بے حیائی اور سخت غصے کی بات ہے اور برا راستہ ہے۔''

---

① الاعراف: 129. ② یونس: 14 ③ ابراهيم: 8 ④ النساء: 22

ایک اور مقام پر ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○﴾ [1]

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کیوں کہتے ہو جو تم نہیں کرتے۔ اللہ کے نزدیک ناراض ہونے کے اعتبار سے بڑی بات ہے کہ تم وہ کہو جو تم نہیں کرتے۔"

﴿خسارا﴾ یعنی "اَلْخُسْرُ وَالْخُسْرَانُ" اس نقصان کو کہتے ہیں جو مال کے منافع کی بجائے، راس المال میں ہو۔ دنیا میں انسان کی عمر اس کا راس المال ہے۔ اسی سے انسان بہت کچھ بناتا اور بگاڑتا ہے۔ جس نے عمر اطاعت میں گزاری اس نے نفع کمایا اور جس نے نافرمانی میں صرف کی اس نے عمر ہی برباد کردی۔ یا یوں سمجھیے کہ جس نے شرک کیا اور اللہ کے سوا کسی دوسرے کی اس امید کے سہارے عبادت کی کہ یہ میرا سفارشی ہوگا، یہ مجھے اللہ کے قریب کردے گا تو یہ اللہ کے تقرب کی بجائے اللہ کو مزید ناراض کرنے کا باعث بنے گا، اور نفع کی بجائے مزید نقصان کا سبب بنے گا۔

[1] الصف: 3,2

﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْهُ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا﴾

(فاطر: ٤٠)

"کہہ دے: کیا تم نے اپنے شریکوں کو دیکھا جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو؟ مجھے دکھاؤ زمین میں سے انھوں نے کون سی چیز پیدا کی ہے یا آسمانوں میں سے ان کا کوئی حصہ ہے یا ہم نے انھیں کوئی کتاب دی ہے کہ وہ اس کی کسی دلیل پر قائم ہیں؟ بلکہ ظالم لوگ، ان کے بعض بعض کو دھوکے کے سوا کچھ وعدہ نہیں دیتے۔"

اس آیتِ مبارکہ میں معبودانِ باطلہ کی بے حقیقتی کا بیان ہے کہ اللہ کے سوا جن کی عبادت اور پوجا پاٹ میں تم نے انھیں اللہ کا شریک بنا رکھا ہے اور اپنی حاجات میں انھیں پکارتے ہو، کیا تم نے دیکھا ہے۔

﴿اَرَءَيْتُمْ﴾ "همزه" استفہام کے لیے ہے اور عموماً یہ لفظ 'اَخْبِرُوْنِيْ' کے معنی میں لیا گیا ہے یعنی مجھے اپنے شرکاء کے بارے میں بتلاؤ۔ کیوں کہ استفہام کا تقاضا یہی ہے کہ جب یہ کہا جائے "أَرَأَيْتَ مَا ذَا فَعَلَ زَيْدٌ؟" تو سننے والا یہی کہتا ہے کہ وہ فلاں کام میں مشغول ہے۔ اگر استفہام خبر کو متضمن نہ ہو تو جواب یوں دیا جاتا ہے: میں نے دیکھا ہے یا میں نے نہیں دیکھا۔ اور "أروني" کو بعض نے "أرأیتم" سے بدل بنایا ہے مگر ابوحیان نے کہا ہے کہ یہ جملہ تاکیدِ کلام کے لیے ہے۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کیا تم نے دیکھا ہے؟ مجھے بھی دکھاؤ۔ یہاں 'شرکاء

کم' میں اشارہ ہے کہ یہ تمھارے بنائے ہوئے شریک ہیں، اللہ نے تو انھیں اپنا شریک نہیں بنایا۔ بتلاؤ تمھارے ان شرکاء نے زمین اور آسمان کا کوئی حصہ بنایا ہے یا اس کے کسی حصہ کے مالک ہیں یا ان میں تصرف کی قدرت رکھتے ہیں؟

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ بتاؤ اگر تمھارے معبود عاجز ہیں تو ان کی عبادت کیوں کرتے ہو اور اگر سمجھتے ہو کہ ان میں قوت وقدرت ہے تو بتلاؤ زمین وآسمان میں سے کون سا حصہ انھوں نے بنایا ہے؟ جیسا کہ بعض کا خیال تھا آسمانوں میں معبود اللہ ہے اور زمین پر یہ ہمارے شرکاء ہیں۔ اور ان میں وہ بھی تھے جو کہتے تھے کہ اللہ نے آسمانوں کو فرشتوں کے تعاون سے بنایا ہے اور یہ بت انھی کی شکلیں اور صورتیں ہیں۔ بعض ایسے تھے جو کہتے تھے کہ زمین کے معاملات ستاروں سے وابستہ ہیں اور یہ بت ان ستاروں کی تشبیہیں ہیں۔ بعض یہ سمجھتے تھے کہ یہ فرشتے اللہ کے ہاں ہماری سفارش پر قادر ہیں، ان کی بدولت اللہ کا قرب حاصل ہوجائے گا۔ بتلاؤ انھوں نے زمین وآسمان میں سے کچھ بنایا ہے؟ جب ان کا اس میں کوئی حصہ نہیں تو عقل کا تقاضا ہے کہ وہ معبود بھی نہیں ہیں۔

﴿اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا﴾ ''یا ہم نے انھیں کوئی کتاب دی ہے۔'' ''ھم'' کی ضمیر کا مرجع لفظ ''شرکاء'' بھی ہوسکتا ہے یعنی کیا تمھارے شرکاء کو ہم نے کوئی کتاب دی ہے جس میں لکھا ہو تم میرے شریک ہو اور میں تمھاری سفارش ردّ نہیں کروں گا؟ یا ''ھم'' کا مرجع مشرکین ہیں یعنی ان مشرکین کے پاس کوئی نقلی دلیل ہے کہ ہم نے انھیں ان کی پرستش کی اجازت دی ہے؟ اگر ہم نے انھیں سجدہ کرنے کی اجازت دی ہوتی تو کہا جاسکتا تھا کہ یہ بھی آدم کو سجدے اور کعبے کی طرف سجدے کے حکم کی مانند ہے مگر ہم نے تو ایسا حکم نہیں دیا۔ گویا عقلاً اور نقلاً کسی اعتبار سے بھی ان کا معبود ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

قرآنِ پاک میں یہی اسلوبِ بیان اور مقامات پر بھی ہے، چنانچہ ایک جگہ فرمایا: کہ یہ آسمان، یہ زمین، یہ پہاڑ، زمین میں ہر طرح کے جانور، آسمان سے بارش، پھر اس سے زمین کی ساری پیداوار، یہ سب کچھ تو اللہ کی مخلوق ہے:

﴿هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ ①

''یہ ہے اللہ کی مخلوق تو تم مجھے دکھاؤ کہ ان لوگوں نے جو اس کے سوا ہیں کیا پیدا کیا ہے؟ بلکہ ظالم لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ ②

''یا انھوں نے اللہ کے لیے کچھ شریک بنا لیے ہیں جنھوں نے اس کے پیدا کرنے کی طرح پیدا کیا ہے تو پیدائش ان پر گڈ مڈ ہوگئی ہے، کہہ دے: اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے اور وہی ایک ہے، نہایت زبردست ہے۔''

شاید یہ اس مغالطے میں ہیں کہ ہمارے شریکوں نے بھی کچھ بنایا ہے۔ انھوں نے ایسی ہی مخلوق بنائی ہے جیسی اللہ نے بنائی ہے، اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کون سی اللہ نے بنائی اور کون سی ہمارے شرکاء نے بنائی۔ فرمایا: ایسا ہرگز نہیں ہر چیز اللہ ہی نے بنائی ہے، وہی سب پر غالب ہے اور باقی سب مغلوب ہیں۔

﴿بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ظالم روسا اور پیشوا اپنے زیردستوں کو اور اپنے مریدوں کو دھوکا دیتے ہیں کہ یہ معبود تمھارے مددگار اور سفارشی ہیں۔ فلاں فلاں جگہ کے اختیارات فلاں کے دائرۂ عمل میں ہیں اور فلاں جگہ سے یہ اور یہ فوائد وبرکات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ سب فریب ہے اور سب سے بڑے فریب کار شیطان نے بھی انھیں اسی دھوکے میں مبتلا کیا ہے۔ اور ان شرکاء کی عبادت کو ایسا خوب صورت انداز دے دیا ہے کہ وہ اسی پر فریفتہ ہوگئے ہیں۔

① لقمان: 11 ② الرعد: 16

﴿إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضَ أَنْ تَزُوْلَا وَ لَئِنْ زَالَتَآ إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهٖ إِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا﴾ (فاطر:٤١)

''بے شک اللہ ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے رکھتا ہے اس سے کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹیں اور یقیناً اگر وہ ہٹ جائیں تو اس کے بعد کوئی ان دونوں کو نہیں تھامے گا، بیشک وہ ہمیشہ سے نہایت بردبار، بے حد بخشنے والا ہے۔''

پہلی آیت میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ آسمان اور زمین بلکہ پوری مخلوق میں سے کسی چیز کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علاوہ کسی نے نہیں بنایا۔ اور جن کو مشرکین نے اللہ کے سوا معبود بنایا ہے اور انھیں اللہ کی بادشاہت میں شریک سمجھ کر اپنی حاجات میں پکارتے ہیں، ان کے پاس اس فکر کی کوئی عقلی اور نقلی دلیل نہیں۔ اس آیت میں بھی اسی تناظر میں اللہ کی قدرتِ کاملہ اور معبودانِ باطلہ کی بے بسی کا بیان ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ﴾ جس طرح اللہ ہی نے آسمانوں اور زمین کو بنایا۔ اسی طرح اللہ ہی نے آسمانوں اور زمین کو تھام رکھا ہے کہ وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ اپنے اپنے مقام اور کرہ پر برقرار رہیں۔ اگر بالفرض ان میں سے کوئی ایک اپنے محور سے ہٹ جائے تو پوری دنیا نیست ونابود ہو جائے۔ یہ اپنے اپنے محل ومدار پر قائم ہیں تو صرف اللہ کے حکم سے قائم ہیں۔ اس میں تمھارے کسی شریک کا، خواہ وہ فرشتہ ہو یا نبی، ولی ہو یا دیوتا، کوئی دخل نہیں۔ آسمان وزمین اور اس کے مابین تمام کُرات کو سنبھالنا تو کجا، یہ تو اپنے وجود کو سنبھالنے اور برقرار رکھنے پر بھی قادر نہیں۔ انھوں نے کسی کو کیا سنبھالا دینا ہے!

جس طرح اللہ کے علاوہ اس نظام کا اور کوئی خالق نہیں اسی طرح اس کے علاوہ اس کا انتظام وانصرام کرنے والا بھی اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ اس کے ان تکوینی امور

میں سب بے بس ہیں۔ بالفرض ان میں سے کوئی اپنے مقام سے ہٹ جائے تو اسے تھامنے والا اور کوئی نہیں۔ یہ زمین بھی چاند، سورج اور ستاروں کی طرح اپنے مدار میں متحرک ہے:

﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝ وَ الْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ۝﴾ [1]

"اور سورج اپنے ایک ٹھکانے کے لیے چل رہا ہے، یہ اس سب پر غالب، سب کچھ جاننے والے کا اندازہ ہے۔ اور چاند، ہم نے اس کی منزلیں مقرر کردیں، یہاں تک کہ وہ دوبارہ پرانی (کھجور کی) ٹیڑھی ڈنڈی کی طرح ہوجاتا ہے۔ نہ سورج، اس کے لیے لائق ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آنے والی ہے اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔"

سب سیارے بڑی سبک رفتاری سے ایک رخ پر اپنے اپنے مدار میں چل رہے ہیں۔ اور سورج کے بارے میں موجودہ ماہرین فلکیات نے یہ محیر العقول انکشاف کیا ہے کہ وہ اپنے پورے نظام شمسی کو لیے ۲۰ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے حرکت کررہا ہے۔ اس تیزی کے ساتھ چلنے کے باوجود کوئی سیارہ کسی دوسرے سے ٹکراتا نہیں، نہ رفتار میں فرق آتا ہے، نہ اپنا مدار اور اپنا رخ تبدیل کرتا ہے۔ یہ پورے سلیقے سے بندھا ہوا پورا نظام منہ بولتا ثبوت ہے کہ اسے چلانے والا اور اسے قائم رکھنے والا زبردست قوت وقدرت کا مالک ہے۔ اگر اللہ کے علاوہ کوئی اور صاحبِ اقتدار اور اختیار ہوتا تو یہ نظام برقرار نہ رہتا:

﴿لَوْ كَانَ فِیْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ [1]

---

[1] یٰس: 38-40

''اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے۔''

یہ سارا نظام اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے اور اسے اپنے اپنے مدار میں تھام رکھا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ انھیں اپنے مدار میں نہ رکھے تو چشمِ زدن میں یہ سارا نظام تباہ و برباد ہو جائے، کسی میں کوئی طاقت نہیں کہ اسے تھام سکے۔

اس آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ذکر کی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں یہ خیال آیا کہ کیا اللہ سبحانہ وتعالیٰ سوتے ہیں یا نہیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک فرشتہ بھیجا۔ اس نے تین دن تک موسیٰ علیہ السلام کو سونے نہ دیا پھر انھیں دو شیشے کی بوتلیں دیں کہ انھیں تھامے رکھو۔ ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نیند آنے لگی اور بوتلیں باہم ٹکرانے ہی لگی تھیں کہ موسیٰ علیہ السلام ہوشیار ہو گئے۔ بالآخر انھیں نیند آ گئی تو بوتلیں ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گئیں۔ یوں مثال دے کر موسیٰ علیہ السلام کو سمجھایا گیا کہ اگر اللہ تعالیٰ سو جائیں تو آسمانوں اور زمین کو کون سنبھالے گا۔

یہ روایت تفسیر ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابویعلی، ابن مردویہ، الأفراد للدارقطني اور الأسماء والصفات للبیھقي وغیرہ میں منقول ہے مگر یہ مرفوعاً قطعاً صحیح نہیں، نہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ صحیح ہے۔ جس کی تفصیل العلل المتناھیۃ، المیزان، البدایۃ اور التفسیر لابن کثیر [2] میں موجود ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ اسرائیلی روایت ہے اور بنی اسرائیل نے اس کا سوال حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا، یوں نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خیال آیا تھا۔

﴿اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا﴾ وہ نہایت بردبار، بے حد بخشنے والا ہے۔ ''حلیم'' حِلْمٌ سے ہے جس کے معنی ہیں ایسا ضبط و تحمل کہ غیظ و غضب کے موقع پر بھڑک نہ اٹھے۔ بعض نے اس کے معنی ''عقل'' کیے ہیں اور کہا ہے کہ دراصل ''حلم'' کے معنی متانت اور سنجیدگی کے ہیں اور متانت بھی عقل سے آتی ہے۔ اس لیے حلم کا لفظ بول

---

[1] الانبیاء : 22 [2] العلل المتناھیۃ لابن الجوزی :28,27/1، المیزان :276/1، البدایۃ : 293/1، التفسیر لابن کثیر :308/1

کر عقل مراد لیتے ہیں، چنانچہ قرآنِ مجید میں ہے:

﴿اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَاۤ﴾ ①

”یا انھیں ان کی عقلیں اس بات کا حکم دیتی ہیں۔“ ②

گویا اللہ تبارک وتعالیٰ نہایت بردبار، نہایت متین ہے۔ انتقام کی پوری قدرت کے باوجود قصور وار سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ امام رازی رحمہ اللہ نے بڑی لطیف بات فرمائی ہے کہ عموماً کہا جاتا ہے کہ ”حلیم“ اسے کہتے ہیں جو انتقام میں جلدی نہیں کرتا مگر جو انتقام میں جلدی نہیں کرتا اور ارادہ رکھتا ہے کہ موقع آنے پر انتقام لوں گا تو اسے ”حاقد“ (کینہ پرور) کہتے ہیں۔ اور اگر وہ یہ ارادہ کرتا ہے کہ میں بالکل انتقام نہیں لوں گا تو اسے عَفُوٌّ وَّغُفْرَانٌ کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ حلیم دراصل اسے کہتے ہیں جو بالکل انتقام کا ارادہ نہ رکھتا ہو اور نہ اس بارے میں کوئی اظہار کرتا ہو۔ اور اگر انتقام نہ لینے کا اظہار کرے تو اسے ”عفو“ کہتے ہیں۔ اور یہی حلیم وعفو میں فرق ہے۔ ③

گویا حلیم وہ ہے جو قدرت کے باوجود قصور وار سے کوئی تعرض نہ کرے، اور انتہائی اشتعال انگیز بات کو برداشت کرے۔

مشرکین کے شرک کا نتیجہ تو وہی ہونا چاہیے جو فرمایا ہے:

﴿تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّاۙ۝ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًاۚ۝﴾ ④

”آسمان قریب ہے کہ اس سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ڈھے کر گر پڑیں کہ انھوں نے رحمان کے لیے کسی اولاد کا دعویٰ کیا۔“

مگر ایسا اس لیے نہیں ہو رہا کہ اللہ بڑا ہی بردبار اور نہایت برداشت کرنے والا ہے۔ اور مہلت دیتا ہے کہ پلٹ آئیں اور اپنی اصلاح کر لیں۔ اللہ بے حد معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔

① طور: 32 ② دیکھیے مفردات القرآن ③ شرح اسماء الحسنی للرازی: 249
④ مریم: 91,90

﴿وَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ لَئِنۡ جَآءَهُمۡ نَذِيۡرٌ لَّيَكُوۡنُنَّ اَهۡدٰى مِنۡ اِحۡدَى الۡاُمَمِ فَلَمَّا جَآءَهُمۡ نَذِيۡرٌ مَّا زَادَهُمۡ اِلَّا نُفُوۡرًا﴾ (فاطر:٤٢)

''اور انھوں نے اپنی پختہ قسمیں کھاتے ہوئے اللہ کی قسم کھائی کہ واقعی اگر کوئی ڈرانے والا ان کے پاس آیا تو ضرور بالضرور وہ امتوں میں سے کسی بھی امت سے زیادہ ہدایت پانے والے ہوں گے، پھر جب ان کے پاس ایک ڈرانے والا آیا تو اس نے ان کو دور بھاگنے کے سوا کچھ زیادہ نہیں کیا۔''

پہلی آیات میں شرک کا ابطال اور توحیدِ باری تعالیٰ کا اثبات تھا کہ اللہ کے سوا جنھیں تم پکارتے ہو نہ وہ کسی چیز کے خالق ہیں، نہ کسی چیز کے مالک اور نہ ہی ان کے شریک ہونے پر کوئی نقلی دلیل ہے۔ شرک کا یہ سارا کاروبار دھوکے اور فریب پر مبنی ہے۔ اپنی اپنی دکانیں چمکانے اور محض لوگوں کو گرویدہ بنانے کے پراپیگنڈے ہیں کہ فلاں صاحب بڑی ہستی ہیں، بڑے اختیار والے ہیں۔ وہاں جو جاتا ہے اپنی مراد پاتا ہے، کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔ یہ سب دھوکا بازی اور فریب کاری ہے۔ اختیارات کا وہی مالک ہے جس کی حکم رانی آسمانوں اور زمین پر ہے۔

اس آیت میں مشرکینِ مکہ کی مزید حماقت کی تردید ہے کہ بات بات پر لات وعزیٰ کی قسمیں کھانے والے، اس بارے میں اللہ کی پختہ قسمیں کھاتے تھے کہ اگر ہمارے پاس رسول آیا تو ہم سب امتوں سے بڑھ کر ہدایت پانے والے ہوں گے۔

قریشِ مکہ یہودیوں سے باخبر تھے کہ وہ اہلِ کتاب ہیں، رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں مگر ان کی نافرمانی کرتے ہیں۔ اہلِ مکہ ''امی'' یعنی کتاب وشریعت سے بے خبر تھے، اسی بنا پر یہود اُن کو حقیر سمجھتے تھے بلکہ بعض تو اپنے لیے ان کا مال ہڑپنا بھی جائز

سمجھتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ﴾ ①

”یہ اس لیے کہ انھوں نے کہا: ہم پر ان پڑھوں کے بارے میں (گرفت کا) کوئی راستہ نہیں۔“

یہود کے ایسے رویے سے ان کا دل برداشتہ ہونا فطری عمل تھا، اسی لیے وہ اللہ کی قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ اگر ہمارے ہاں کوئی رسول آیا تو ہم کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے بلکہ ہدایت قبول کرنے میں سب سے بازی لے جائیں گے۔

ان کی اس خواہش وتمنا کا ذکر ایک اور مقام پر بھی آیا ہے:

﴿وَ اِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ۝ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ۝﴾ ②

”اور بے شک وہ (کافر) تو کہا کرتے تھے: اگر واقعی ہمارے پاس پہلے لوگوں کی کوئی نصیحت ہوتی تو ہم ضرور اللہ کے چنے ہوئے بندے ہوتے۔“

اسی طرح سورۂ انعام میں قرآنِ پاک کی تابعداری کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَ اِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ﴾ ③

”ایسا نہ ہو کہ تم کہو کہ کتاب تو صرف ان دو گروہوں (یہود ونصاریٰ) پر اتاری گئی جو ہم سے پہلے تھے اور بے شک ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے یقیناً بے خبر تھے۔ یا یہ کہو کہ اگر واقعی ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم

① آلِ عمران: 75 ② الصّفّٰت: 167-169 ③ الأنعام: 157,156

ان سے زیادہ ہدایت والے ہوتے۔ پس بے شک تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل اور ہدایت اور رحمت آ چکی۔"

گویا اتمامِ حجت ہو چکا ہے۔ یہاں بھی یہی بات فرمائی گئی ہے کہ ان کی چاہتوں کے مطابق اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجا مگر ان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ آئی۔ ہدایت کی بجائے الٹا نفرت وتمرد میں ہی اضافہ ہوا۔

امام رازی رحمہ اللہ نے یہاں عام مفسرین سے اختلاف کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس آیت میں بھی مشرکینِ مکہ کی مزید تکذیب کا ہی ذکر ہے کیونکہ جب کوئی کسی کا قرض ادا کرنے سے انکار کرتا ہے تو اس نے کبھی یہ کہا ہے کہ اللہ کی قسم! اگر مجھے علم ہوتا کہ میں اس کا مقروض ہوں تو میں ضرور اس کا قرض ادا کر دیتا بلکہ احساناً قرض کی رقم سے زیادہ رقم ادا کرتا۔ یہ بات دراصل وہ اس تناظر میں کہتا ہے کہ مجھ سے قرض کا مطالبہ ہی باطل ہے۔ بالکل اسی طرح اہلِ مکہ رسول کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ اگر رسول آئے تو ہم ہدایت میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے مگر جب رسول آئے تو ان کی نفرت میں اضافہ ہی ہوا۔ وہ پہلے اللہ کے کافر تھے، پھر رسول اللہ کے بھی کافر ہو گئے:

'كَانُوْا كَافِرِيْنَ بِاللّٰهِ وَبَعْدَهَا صَارُوْا كَافِرِيْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ'

انھوں نے محمد ﷺ کا انکار بایں طور کیا تھا کہ آپ ﷺ رسول نہیں ہو سکتے۔ یہ رسالت کا جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں۔ اگر واقعی یہ رسول ہوتے تو ہم تسلیم کر لیتے اور ہدایت میں کسی سے پیچھے نہ رہتے۔

مگر یہ توجیہ وتاویل محلِ نظر ہے۔ اوّلاً: کفارِ مکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے منکر وکافر نہیں تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کے مرتکب تھے اور یہی ان کا کفر تھا۔

ثانیاً: امام رازی رحمہ اللہ نے مثال تو قرض کی ادائیگی سے شدید انکار کی دی ہے کہ مطالبۂ قرض ہی باطل ہے، اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی رسول کی رسالت کے ہی منکر تھے جیسا کہ خود انھوں نے فرمایا بھی ہے: 'كَانُوْا مُنْكِرِيْنَ لِلرِّسَالَةِ' "وہ رسالت کے منکر تھے۔"

لہٰذا اُن کے انکارِ رسالت کے باوجود مطالبۂ رسول اور اس مطالبے کی تکمیل کے بعد ان کے تمرد پر انکار بلاوجہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ مشرکین فی الجملہ رسالت کے منکر نہیں تھے۔ ان کا یہ کہنا ﴿لکنا اهدى من احدى الامم﴾ بھی اس کا مؤید ہے کہ وہ رسالت کے منکر نہیں تھے کیونکہ اس میں بھی یہود ونصاریٰ کی طرف اشارہ ہے۔ البتہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے وہ منکر تھے اور کہتے تھے:

﴿لَسْتَ مُرْسَلًا﴾ ①

''آپ رسول نہیں ہیں۔''

جس طرح وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے کافر ومنکر نہیں تھے، اسی طرح رسالت کے بھی منکر نہیں تھے، البتہ وہ صرف اللہ کی الوہیت میں دوسروں کو شریک بناتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے منکر تھے۔

① الرعد: 43

﴿اِسۡتِکۡبَارًا فِی الۡاَرۡضِ وَ مَکۡرَ السَّیِّیٴِ ؕ وَ لَا یَحِیۡقُ الۡمَکۡرُ السَّیِّیٴُ اِلَّا بِاَہۡلِہٖ ؕ فَہَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا سُنَّتَ الۡاَوَّلِیۡنَ ۚ فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا ۬ۚ وَ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحۡوِیۡلًا ﴿۴۳﴾﴾ (فاطر:۴۳)

''زمین میں تکبر کی وجہ سے اور بری تدبیر کی وجہ سے اور بری تدبیر اپنے کرنے والے کے سوا کسی کو نہیں گھیرتی۔ اب یہ پہلے لوگوں سے ہونے والے طریقے کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں؟ پس تو نہ کبھی اللہ کے طریقے کو بدل دینے کی کوئی صورت پائے گا اور نہ کبھی اللہ کے طریقے کو پھیر دینے کی کوئی صورت پائے گا۔''

اس آیت کی ابتدا میں مشرکین کے نفور و اعراض کا اصل سبب ذکر ہوا ہے کہ ان کی آرزوؤں کے مطابق اللہ نے رسول بھیجا۔ دلائل و براہین اور واضح معجزات کے باوجود ان کی دینِ حق سے نفرت کا اصل سبب ان کا ''استکبار'' ہے۔ وہ یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ ہماری سیادت و قیادت ختم ہو جائے اور سب محمد رسول اللہ ﷺ کو قائد تسلیم کر لیں۔ خاندانی رقابت اس پر مستزاد تھی۔ جیسا پہلے ہم ذکر کر آئے ہیں۔[1] رسول اللہ ﷺ کو یتیم سمجھ کر بھی آپ ﷺ کی اطاعت قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے بلکہ وہ برملا کہتے تھے:

﴿وَ قَالُوۡا لَوۡ لَا نُزِّلَ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الۡقَرۡیَتَیۡنِ عَظِیۡمٍ﴾ [2]

''اور انھوں نے کہا: یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ کیا گیا؟''

---

① دیکھیے تفسیر آیت: 4 ② الزخرف: 31

بلکہ یہ بھی کہا کہ فرشتہ وحی لے کر ہمارے اوپر کیوں نہیں آتا۔[1] محمد ﷺ پر ہی کیوں آتا ہے۔ یہی ''استکبار'' پہلا جرم تھا جو شیطان سے سرزد ہوا تھا، چنانچہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم فرمایا تو شیطان نے سجدہ سے انکار کردیا، فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ o اِلَّآ اِبْلِيْسَ ط اِسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ o﴾[2]

''پس تمام فرشتوں، سب کے سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس نے تکبر کیا اور کافروں سے ہوگیا۔''

پھر ہر دور میں اسی کے متکبر پیروکاروں نے انبیائے کرام اور دینِ حق کا انکار کیا۔ یہودی بھی اسی تکبر میں مارے گئے کہ محمد ﷺ بنو اسماعیل میں سے کیوں نبوت کے لیے منتخب کیے گئے، بلکہ انبیائے کرام کے بارے ان کی عمومی روش یہ تھی:

﴿اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ o﴾[3]

''پھر کیا جب کبھی کوئی رسول تمھارے پاس وہ چیز لے کر آیا جسے تمھارے دل نہ چاہتے تھے، تم نے تکبر کیا تو ایک گروہ کو جھٹلا دیا اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے۔''

مشرکین وکفار بھی اسی استکبار میں مارے گئے اور قرآنِ پاک میں جا بجا ان کی تردید ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تکبر اچھا لباس پہننا نہیں بلکہ تکبر 'بَطَرَ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ'،[4] ''حق کو ردّ کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا'' ہے۔ اس وضاحت کے ساتھ ہی آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

---

[1] الفرقان: 21 [2] ص: 74,73 [3] البقرة: 87 [4] مسلم:91 عن ابن مسعود

’لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ ‘[1]

’’جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔‘‘

اس لیے کسی صحیح اور سچی بات کا انکار اور کسی مسلمان بھائی کو حقیر سمجھنا تکبر ہے۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ۝﴾ [2]

’’اور جب اسے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر تو اس کی عزت اسے گناہ میں پکڑے رکھتی ہے، سو اُسے جہنم ہی کافی ہے اور یقیناً وہ برا ٹھکانہ ہے۔‘‘

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

’إِنَّ مِنْ أَكْبَرِ الذُّنُوبِ عِنْدَ اللّٰهِ أَنْ يَّقُولَ الرَّجُلُ لِأَخِيهِ: اِتَّقِ اللّٰهَ. فَيَقُولُ: عَلَيْكَ بِنَفْسِكَ، أَنْتَ تَأْمُرُنِي!‘ [3]

’’اللہ کے ہاں گناہوں میں سے بڑا گناہ یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے بھائی سے کہے: اللہ سے ڈر، تو وہ کہے: تم اپنی فکر کرو، تم مجھے حکم دیتے ہو!‘‘

گویا وہ اپنی عزت کے منافی سمجھتا ہے کہ کوئی اسے گناہ سے روکے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی تلقین کرے بلکہ الٹا اسے حقیر سمجھتے ہوئے کہتا ہے کہ تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے ٹوکنے والے۔ یہی وہ تکبر ہے جس سے رسول اللہ ﷺ نے خبردار کیا ہے، اور یہی بالآخر انسان کو کفر وشرک میں مبتلا کر دیتا ہے۔

﴿وَ مَكْرَ السَّيِّئِ﴾ ’’اور بری تدبیر‘‘، جو وہ رسول اللہ ﷺ کو زک پہنچانے کے لیے کرتے تھے۔ بعض نے کہا ہے ﴿اِسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ﴾

[1] مسلم: 147 عن ابن مسعود [2] البقرة: 206 [3] ابن المنذر، طبراني، بيهقي، في الشعب بحواله فتح القدير: 209/1

بدل ہے ''نفورا'' سے۔ ① یعنی یہ تو رسول کی دعوت کو قبول کر کے ہدایت میں دوسری امتوں سے آگے بڑھنے کے مدعی تھے مگر جب رسول آیا تو اس سے بگڑ گئے اور تکبر سے ان کا انکار کرنے لگے اور اس کے خلاف بری سازشیں اور تدبیریں کرنے لگے جیسا کہ پہلے ان کی سازشوں کا ذکر ہم کر آئے ہیں۔ ② ''مکر'' کا اطلاق اچھے معنوں میں بھی ہوتا ہے، اس لیے اس کے ساتھ ''اَلسَّیِّءِ'' کا لفظ ان کی بری سازشوں کی طرف اشارہ ہے۔

بعض نے کہا ہے: ﴿اِسۡتِكۡبَارًا فِي الۡاَرۡضِ وَمَكۡرَ السَّيِّئِ﴾ حال ہے۔ ③ یعنی یہ ''نفور'' تکبر اور سازشوں کے ساتھ ہے۔ جس سے ان کے ''نفور'' کی شدت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ علیحدہ ہو کر بیٹھ نہیں گئے بلکہ انھوں نے بڑے تکبر کا مظاہرہ کیا، رسول اللہ ﷺ کے خلاف مکروہ جال بچھائے حتیٰ کہ ان کے قتل کے درپے ہو گئے۔

﴿وَ لَا يَحِيۡقُ الۡمَكۡرُ السَّيِّئُ﴾ حالانکہ حقیقت یہ ہے حق کے خلاف جو سازش کرتا ہے اس کا خمیازہ خود اسی کو بھگتنا پڑتا ہے، حق کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔ جو کسی کے لیے کنواں کھودتا اور سازشوں کا جال بُنتا ہے وہ خود اس میں پھنس جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے: چاہ کن را چاہ درپیش۔

جلیل القدر تابعی محمد بن کعب قرظی فرماتے ہیں: مندرجہ ذیل یہ تین کام کرنے والا نجات نہیں پاتا، ان کا وبال خود اسی پر پڑتا ہے: مکر، بغی (بغاوت)، نکث (عہد توڑنا)۔ مکر وفریب کے بارے میں تو اسی آیت میں وضاحت ہے کہ کسی کے لیے برا مکر کرنے والا خود اس میں پھنستا ہے۔ اسی طرح ''بغی'' کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغۡيُكُمۡ عَلٰۤى اَنۡفُسِكُمۡ﴾ ④

''اے لوگو! تمھاری سرکشی تمھاری جانوں ہی پر ہے۔''

اسی طرح ''نکث'' کے بارے میں فرمایا:

① البحر ② ملاحظہ فرمائیں تفسیر آیت: 10 ③ البحر ④ یونس: 23

﴿فَمَنۡ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنۡكُثُ عَلٰى نَفۡسِهٖ ۚ﴾ ①

''پھر جس نے عہد توڑا تو درحقیقت وہ اپنی ہی جان پر عہد توڑتا ہے۔''

امام ابن ابی حاتم نے ابوزکریا الکوفی سے نقل کیا ہے کہ ایک صاحب نے مجھے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث سنائی کہ مکاریوں سے پرہیز کرو۔ مکر کا وبال مکار پر ہی پڑتا ہے اور اس کی جواب دہی اللہ کے ہاں ہوگی۔ ②

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ بعض اوقات مکر وفریب اور بری سازش کرنے والے کی سازش کامیاب ہوجاتی ہے اور اس کا نقصان بھی دوسرے کو پہنچتا ہے۔ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ بے گناہ کے خلاف ظالم کے ظلم کا وبال ظالم کو عملِ مکافات کے طور پر پہنچتا ہے مگر ظالم اس کا احساس نہیں کرتا اور نہیں سمجھتا کہ میرا یہ نقصان میرے کسی ظلم کا نتیجہ ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ انجام کار آخرت کے اعتبار سے ہے۔ ظلم وتعدّی کرنے والا تو کسی کی دنیا خراب کرتا ہے، مظلوم اس پر صبر کرے تو اسے اجر ملتا ہے اور ظالم کا نقصان آخرت میں عذاب کی صورت میں ہے جو دنیوی نقصان سے بہر نوع زیادہ ہے۔ جیسے حدیث میں ہے کہ دنیا کافر کے لیے جنت ہے اور مسلمان کے لیے قید خانہ ہے۔ بعد کے جملے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

﴿فَهَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ﴾ کیا یہ پہلے لوگوں سے ہونے والے طریقے کے سوا کسی اور طریقے کا انتظار کررہے ہیں۔ پہلے لوگ اللہ کے رسول کی نافرمانی کے نتیجے عذاب میں مبتلا ہوئے تو کیا یہ بھی اسی انتظار میں ہیں کہ اللہ کا عذاب کب آتا ہے۔ بلکہ وہ تو خود اللہ سے عذاب کا مطالبہ کرتے اور کہتے تھے:

﴿اللّٰهُمَّ اِنۡ كَانَ هٰذَا هُوَ الۡحَقَّ مِنۡ عِنۡدِكَ فَاَمۡطِرۡ عَلَيۡنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائۡتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ۝﴾ ③

''اے اللہ! اگر صرف یہی تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے

① الفتح : 10 ② ابن کثیر : 741/3 ③ الأنفال : 32

پتھر برسا یا ہم پر کوئی دردناک عذاب لے آ۔‘‘

مشرکین کے تمرد وعناد کی حد دیکھیے کہ یہ نہیں کہتے کہ اگر یہی حق ہے جو محمد ﷺ کہتے ہیں اور واقعی اللہ کے سوا کوئی معبود اور حاجت روا نہیں تو ہماری حق کی طرف راہنمائی فرما اور اس کی اتباع کی توفیق عطا فرما بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم پر عذاب مسلط کردے اور آسمان سے پتھروں کی بارش برسا کے ہمیں نیست ونابود کردے۔ ہم یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ تیرا کوئی شریک نہیں۔ ان بتوں اور بزرگوں کی یوں توہین ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَ لَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ﴾ ①

’’اور وہ تجھ سے جلدی عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر ایک مقرر وقت نہ ہوتا تو ان پر عذاب ضرور آجاتا۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ان کے مطالبۂ عذاب کے باوجود عذاب میں تاخیر اس لیے ہے کہ میرا رسول ان میں موجود ہے اور ہمارا ضابطہ اور اصول یہ ہے:

﴿وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۝﴾ ②

’’اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ انھیں عذاب دے جب کہ تُو ان میں ہو اور اللہ انھیں کبھی عذاب دینے والا نہیں جب کہ وہ بخشش مانگتے ہوں۔‘‘

تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی امتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہی دستور رہا کہ جب تک وہ اپنی امت میں موجود رہے امت عذاب سے بچی رہی جیسے حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت لوط علیہم السلام اور ان کی امتیں۔ مشرکینِ مکہ کے مطالبۂ عذاب

① العنکبوت: 53 ② الانفال: 33

کے جواب میں ایک تو یہی بات فرمائی گئی ہے کہ آپ ﷺ کے ہوتے ہوئے عذاب نہیں آئے گا۔ دوسرا جواب یہ کہ جب تک وہ توبہ واستغفار کرتے رہیں تب بھی عذاب نہیں آئے گا، چنانچہ مکۂ مکرمہ میں ہجرتِ مدینہ کے بعد ایک تو وہ ضعفاء صحابہ کرام تھے جو استغفار کرتے تھے، دوسرے خود مشرکین تھے جو طواف کے دوران میں "غُفْرَانَكَ غُفْرَانَكَ" کہتے تھے۔[1] اس لیے ان پر سابقہ امتوں کی طرح کا عذابِ استیصال تو نہیں آیا، البتہ صحابۂ کرام کے ہاتھوں وہ تہ تیغ ہوئے اور ان کا غرور خاک میں مل گیا۔

یہاں بھی ان کے اسی مطالبۂ عذاب کے تناظر میں فرمایا گیا ہے کہ وہ کیا سابقہ امتوں کے انجام کی طرح اسی سنت اللہ کے انتظار میں ہیں کہ اگر وہ تباہی و بربادی سے دوچار ہوئے ہیں تو رسول کی تکذیب میں یہ بھی تباہ کردیے جائیں، سن لو ﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا﴾ اللہ کے طریقے کو بدل دینے کی اور پھیر دینے کی کوئی صورت نہیں۔ یہ آج بھی اسی طرح جاری وساری ہے جیسے پہلے تھا۔ جب وہ وقت آئے گا تو نہ کوئی اسے روک سکے گا اور نہ ہی اس کا رخ بدل سکے گا۔ جو مستحق ہوگا وہی پکڑا جائے گا اور اپنے عمل کی سزا پائے گا:

﴿وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ﴾[2]

"اور جب اللہ کسی قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ کرلے تو اسے ہٹانے کی کوئی صورت نہیں۔"

اس لیے یہ ابھی تک بچے ہوئے ہیں تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کے طریقے اور فیصلے کے مطابق بچے ہوئے ہیں کہ آپ ﷺ کے ان میں جیتے جی کسی کو عذاب نہیں دیا جائے گا اور جب تک استغفار کرتے رہیں گے تب بھی عذاب نہیں آئے گا۔ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ جس عذاب کی نفی کا ذکر ہے وہ عذابِ استیصال ہے جس میں پوری منکر قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ جزوی اور کم تر درجے کے عذاب

---

[1] ابن ابی حاتم، ابن کثیر: 403/2 [2] الرعد: 11

ومواخذے کی نفی مراد نہیں۔

سنۃ اللہ کا مفہوم

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت میں جو یہ فرمایا ہے کہ آپ اللہ کی سنت کو، اللہ کے طریقے کو بدل دینے کی کوئی صورت نہ پائیں گے۔سیاقِ کلام سے اس کا مفہوم بالکل واضح ہے۔اس مفہوم میں اللہ تعالیٰ سورۂ بنی اسرائیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کے تناظر میں،جب قریشِ مکہ آپ کو مکۂ مکرمہ سے نکالنے کی فکر میں تھے،فرماتے ہیں:

﴿وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَإِذًا لَّا يَلْبَثُونَ خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا ○ سُنَّةَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا﴾ [1]

اور بے شک وہ قریب تھے کہ تجھے ضرور ہی اس سرزمین سے پھسلا دیں،تاکہ تجھے اس سے نکال دیں اور اس وقت وہ تیرے بعد نہیں ٹھہریں گے مگر کم ہی۔ان کے طریقے (کی مانند) جنھیں ہم نے تجھ سے پہلے اپنے رسولوں میں سے بھیجا اور تو ہمارے طریقے میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا۔"

منافقین اور ان کے ہم نواؤں کے بارے میں فرمایا گیا ہے اگر یہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو ہم تمھیں ان پر مسلط کر دیں گے وہ مدینہ میں نہیں رہ سکیں گے ان پر لعنت ہوگی وہ جہاں بھی ہوں گے(بھاگ نہیں سکیں گے) پکڑے جائیں گے اور بری طرح ان کے ٹکڑے ٹکڑے کیے جائیں گے۔پھر فرمایا:

﴿سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا﴾ [2]

[1] بنی اسرائیل:76-77 [2] الاحزاب:62

"اللہ کے طریقے کی طرح ان لوگوں میں جو پہلے گزرے اور تو اللہ کے طریقے میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں پائے گا۔"

جس سے واضح ہوتا ہے کہ "سنۃ اللہ" میں جس تبدیلی کی نفی ہے وہ یہ ہے کہ مجرم قومیں جب دعوتِ حق قبول نہیں کرتیں انبیاءِ کرام کا وعظ موثر ثابت نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان پر اپنا عذاب مسلط کرتے ہیں۔اور اس عذاب کے نزول کا اللہ کے ہاں وقت مقرر ہوتا ہے حق و باطل اور خیر و شر کے اس معرکے میں ہمیشہ حق غالب ہو کے رہا ہے۔مگر نیچر پرست معجزات کے انکار میں اس "سنت اللہ" کی عدم تبدیلی کو اپنے دعوی کی بنیاد قرار دیتے ہیں کہ یہ دنیا اسباب وعلل سے وابستہ ہے اس میں کوئی کام یا عمل اسباب وعلل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔مگر ان کا یہ استدلال قرآنِ پاک کی اس اصطلاح سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ دنیا کے معاملات اگرچہ اسباب وعلل سے منتھی ہیں مگر اللہ سبحانہ' تعالیٰ اسباب وعلل کا محتاج نہیں وہ جب کسی کام کا فیصلہ فرماتا ہے تو اس کے ایک حکم سے وہ ہو جاتا ہے۔

﴿اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا﴾ (فاطر:٤٤)

”اور کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیسے ہوا جو ان سے پہلے تھے، حالانکہ وہ قوت میں ان سے زیادہ سخت تھے۔ اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں کوئی چیز اسے بے بس کردے، بے شک وہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔“

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اسی سنت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس کا ذکر پہلی آیت میں ہوا ہے کہ کیا انھوں نے مکۂ مکرمہ سے باہر آنے جانے کا کوئی سفر نہیں کیا؟ اور تجارتی سفروں میں شام، عراق اور یمن نہیں گئے؟ انھوں نے نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے کی قومیں جو قوت اور طاقت میں ان سے کہیں زیادہ تھیں، ان کی شان وشوکت اور ان کی عیش وعشرت ان سے کہیں بڑھ کر تھی مگر اپنے انبیاء کی تکذیب کے نتیجے میں ان کا انجام کیا ہوا؟ اگر دیکھا ہے اور ان کے انجام سے کوئی سبق نہیں سیکھا، تو دیکھنے کا انھیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ اور اگر سفر نہیں کیا تو سفر کرکے ان کا انجام دیکھ لیں۔ سورۃ الروم میں بھی فرمایا ہے:

﴿اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اَثَارُوا الْاَرْضَ وَ عَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانَ اللّٰهُ

لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝﴾ [1]

''اور کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے۔ وہ ان سے قوت میں زیادہ سخت تھے اور انھوں نے زمین کو پھاڑا اور اسے آباد کیا اس سے زیادہ جو انھوں نے اسے آباد کیا ہے، اور ان کے پاس ان کے رسول واضح دلیلیں لے کر آئے تو اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے اور لیکن وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔ پھر ان لوگوں کا انجام، جنھوں نے برائی کی، بہت برا ہی ہوا، اس لیے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور وہ ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ۝﴾ [2]

''اور ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی نسلیں ہلاک کر دیں جو پکڑنے میں ان سے زیادہ سخت تھیں۔ پس انھوں نے شہروں کو چھان مارا، کیا بھاگنے کی کوئی جگہ ہے؟''

سورۂ ق کی اسی آیت کے ضمن میں جو کچھ ہم ذکر کر چکے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

﴿وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ﴾ انسان تو کیا، آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز نہیں جو اللہ کی گرفت سے باہر ہو۔ اور کسی میں یہ قدرت وقوت نہیں وہ اپنے آپ کو یا کسی اور کو عذاب سے بچا سکے۔ اللہ ہی سب پر قاہر وقادر ہے، وہ ''علیم وقدیر'' ہے،

---

[1] الروم: 10,9 [2] ق: 36

آسمانوں اور زمین کی کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَآءِ﴾ ①

''بے شک اللہ وہ ہے جس پر کوئی چیز نہ زمین میں چھپی رہتی ہے اور نہ آسمان میں۔''

اسے ہر ایک کا علم ہے۔ کوئی چیز اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں اور کوئی کام اس کے دستِ قدرت سے باہر نہیں، اس لیے نہ کوئی اس سے چھپ سکتا ہے، نہ ہی کہیں بھاگ سکتا ہے۔

① آلِ عمران : 5

﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّ لٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ۝﴾(فاطر:٤٥)

''اور اگر اللہ لوگوں کو اس کی وجہ سے پکڑے جو انھوں نے کمایا تو اس (زمین) کی پشت پر کوئی چلنے والا نہ چھوڑے اور لیکن وہ انھیں ایک مقرر مدت تک مہلت دیتا ہے، پھر جب ان کا مقرر وقت آ جائے تو بے شک اللہ اپنے بندوں کو ہمیشہ سے خوب دیکھنے والا ہے۔''

اس آیت میں بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اسی سنت کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے [1] کہ اللہ تعالیٰ مجرموں کا فی الفور مواخذہ نہیں کرتے بلکہ اپنے حلم وعفو کی بنا پر درگزر فرماتے ہیں۔

﴿كَسَبُوْا﴾ سے مراد ظلم ہے جیسا کہ بالکل اسی اسلوب میں سورۃ النحل میں ہے۔ [2] دوسرے جرائم کے علاوہ تنہا ایک جرم ہی ایسا ہے کہ اس کا نتیجہ ہر چیز کی تباہی وبربادی ہے، جیسے فرمایا:

﴿وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝﴾ [3]

''اور انھوں نے کہا: رحمان نے کوئی اولاد بنا لی ہے۔ بلاشبہ یقیناً تم ایک بہت بھاری بات کو آئے ہو۔ آسمان قریب ہیں کہ اس سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ڈھے کر گر پڑیں کہ انھوں نے رحمان کے

[1] دیکھیے اسی سورت کی آیت: 43 [2] النحل: 61 [3] مریم: 88-91

لیے کسی اولاد کا دعویٰ کیا۔“

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”دنیا کا زوال ایک مسلمان کے قتل کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک بالکل بے قیمت ہے۔“ ①

اس لیے اگر کسی گناہ پر فی الفور مواخذہ ہونا ہوتا تو صرف اسی بات پر کہ (معاذ اللہ) عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں یا ایک مسلمان کا قتل ہوجانا زمین و آسمان کے تہ و بالا ہوجانے کے لیے کافی ہے۔ مگر ایسا ہے کہ اللہ کی رحمت اللہ کے غضب سے سبقت لے گئی ہے: 'سَبَقَتْ رَحْمَتِي غَضَبِي' ②

ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَ رَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ○ وَ تِلْكَ الْقُرٰۤى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَ جَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا﴾ ③

”اور تیرا ربّ نہایت بخشنے والا، خاص رحمت والا ہے۔ اگر وہ انھیں اس کی وجہ سے پکڑے جو انھوں نے کمایا ہے تو یقیناً ان کے لیے جلد عذاب بھیج دے، بلکہ ان کے لیے وعدے کا ایک وقت ہے جس سے بچنے کی وہ ہرگز کوئی پناہ گاہ نہ پائیں گے۔ اور یہی بستیاں ہیں ہم نے انھیں ہلاک کردیا جب انھوں نے ظلم کیا اور ہم نے ان کی ہلاکت کے لیے ایک مقرر وقت رکھ دیا تھا۔“

گویا یہ مہلت اللہ تعالیٰ کی رحمت و بخشش کی وجہ سے ہے۔

یہاں 'و ربك' میں خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہے جس میں آپ ﷺ کو تسلی کے لیے ایک لطیف اشارہ ہے کہ ان کی تمام تر نافرمانیوں کے باوجود، اور ان کی سرکشیوں پر آپ ﷺ کی پریشانیوں کے علی الرغم ان پر فی الفور عذاب اس لیے نہیں

① ترمذی، ابن ماجه، غاية المرام، رقم: 439 ② مسلم: 2751 ③ الكهف: 58,59

اترا کہ تیرا ربّ نہایت بخشنے والا اور خاص رحمت والا ہے۔ میں نے آپ کو ''رحمۃ للعالمین'' بنایا ہے اور آپ ﷺ نے اسی صفت کی بنا پر کبھی ان کے لیے بددعا نہیں کی تو میری اسی صفتِ رحیمیت کی بنا پر ہی عذاب سے انھیں مہلت مل رہی ہے۔ ہر ایک کی ہلاکت کا ایک وقت مقرر ہے۔ پہلی جن ظالم امتوں پر میرا عذاب آیا وہ بھی وقتِ مقرر پر ہی آیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لیے وقت مقرر کر رکھا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ اس سے پہلے اس کی قسمت کا فیصلہ نہیں کرتے:

﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ﴾ ①

''اور اگر وہ بات نہ ہوتی جو تیرے رب کی طرف سے ایک وقتِ مقرر تک پہلے طے ہوچکی تو ضرور اُن کے درمیان فیصلہ کردیا جاتا۔''

﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّأَجَلٌ مُّسَمًّى﴾ ②

''اور اگر وہ بات نہ ہوتی جو تیرے ربّ کی طرف سے پہلے ہوچکی اور ایک مقرر وقت نہ ہوتا تو وہی (پہلے لوگوں والا عذاب) لازم ہوجاتا۔''

اس لیے اگر مواخذہ نہیں ہوتا تو اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی ایک سنت کارفرما ہے۔ ہر ایک کی ''اجل مسمی'' کا فیصلہ پہلے سے ہو چکا ہے، اس لیے عذاب اس وقت تک کے لیے مؤخر کردیا جاتا۔

﴿مَا تَرَكَ عَلَىٰ ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ﴾ مواخذہ ہوتو ان کے جرم کی پاداش میں انسان تو انسان کوئی جاندار بھی زمین کی پشت پر چلنے والا نہ بچے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر عذاب کے نتیجے میں تمام جانور بھی ہلاک ہوگئے تھے اور صرف وہی بچ پائے تھے جو حضرت نوح علیہ السلام کے ہمراہ کشتی پر تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے گناہوں کا اثر جانوروں حتی کہ درختوں پر بھی ہوتا ہے۔ حضرت

① الشوریٰ: 14 ② طٰہٰ: 129

ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُرَّ عَلَيْهِ بِجَنَازَةٍ فَقَالَ: (مُسْتَرِيحٌ أَوْ مُسْتَرَاحٌ مِّنْهُ) قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا الْمُسْتَرِيحُ وَالْمُسْتَرَاحُ مِنْهُ؟ قَالَ: (اَلْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ يَسْتَرِيحُ مِنْ نَصَبِ الدُّنْيَا وَأَذَاهَا إِلٰى رَحْمَةِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ، وَالْعَبْدُ الْفَاجِرُ يَسْتَرِيحُ مِنْهُ الْعِبَادُ وَالْبِلَادُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ ‘ ①

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا، آپ نے فرمایا: ”آرام پانے والا ہے یا آرام دینے والا ہے“، صحابۂ کرام نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! آرام پانے والا یا آرام دینے والا، اس کے کیا معنی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ایماندار بندہ تو مر کر دنیا کی تکالیف سے اور مصیبتوں سے نجات پا کر اللہ کی رحمت میں آرام پاتا ہے۔ اور بدکار بندے کے مرنے سے دوسرے بندے، ملک، درخت اور چوپائے جانور آرام پاتے ہیں۔“

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر اور فاسق وفاجر کے فسق وفجور کا اثر دوسرے انسانوں، شہروں، جانوروں اور درختوں پر بھی ہوتا ہے۔ حجر اسود جو دودھ سے زیادہ سفید تھا، اس کا بھی اولادِ آدم کی خطاؤں سے سیاہ ہونا ایک بیّن حقیقت ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((كَادَ الْجُعَلُ أَنْ يُّعَذَّبَ فِيْ جُحْرِهِ بِذَنْبِ ابْنِ آدَمَ، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ......﴾ الآية‘ ②

”قریب ہے اولادِ آدم کے گناہ کی وجہ سے کیڑے کو اس کے بل میں عذاب دیا جائے، پھر اس کی تائید میں انھوں نے یہی آیت ﴿وَلَوْ

① بخاری: 6512، مسلم: 950 ② ابن کثیر: 742/3

یُؤَاخِذُ اللّٰہُ...... الآیۃ﴾ تلاوت فرمائی۔"

قرآنِ مجید میں فرعون اور اس کے حواریوں کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

﴿فَمَا بَکَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا کَانُوْا مُنْظَرِیْنَ﴾ ①

"پھر نہ ان پر آسمان وزمین روئے اور نہ وہ مہلت پانے والے ہوئے۔"

صحابۂ کرام اور تابعینِ عظام کے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ جب نیک آدمی فوت ہوجائے تو جس زمین کے حصے پر وہ نماز پڑھتا رہا وہ حصہ اس کے فراق میں روتا ہے۔ اور آسمان کے جس دروازے سے اس کے نیک اعمال اوپر اٹھائے جاتے ہیں وہ دروازہ بھی روتا ہے اور چالیس دن تک روتا رہتا ہے۔ آلِ فرعون کا کوئی عمل صالح نہیں تھا، اس لیے نہ ان پر زمین کا کوئی ٹکڑا رویا، نہ ہی آسمان رویا۔ یہ ان کے فسق وفجور کی بنا پر ہی فرمایا گیا ہے:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ لِیُذِیْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ﴾ ②

"خشکی اور سمندر میں فساد ظاہر ہوگیا ہے اس کی وجہ سے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کمایا تاکہ وہ انہیں اس کا کچھ مزہ چکھائے جو انھوں نے کیا، تاکہ وہ باز آجائیں۔"

یعنی نافرمانیوں کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ انھیں عذاب کا "کچھ حصہ" چکھائیں گے، اسی کو دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا ہے:

﴿وَ لَنُذِیْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰی دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَکْبَرِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ﴾ ③

① الدخان: 29 ② الروم: 41 ③ السجدۃ: 21

''اور یقیناً ہم انھیں قریب ترین عذاب کا کچھ حصہ سب سے بڑے عذاب سے پہلے ضرور چکھائیں گے، تاکہ وہ پلٹ آئیں۔''

اس کا ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ''تاکہ انھیں ان کے بعض اعمال کا مزا چکھائیں'' حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وَلَوْ أَذَاقَنَا كُلَّ أَعْمَالِنَا لَمَا ظَهَرَهَا مِنْ دَابَّةٍ'' ①

''اگر وہ (اللہ) ہمارے تمام اعمال کا مزا چکھائے تو زمین پر کوئی جاندار نہ رہے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾ ②

''اور جو بھی تمھیں کوئی مصیبت پہنچی تو وہ اس کی وجہ سے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے کمایا اور وہ بہت سی چیزوں سے درگزر کر جاتا ہے۔''

لہٰذا جو بھی مصیبت آتی ہے اور جس بھی پریشانی سے انسان دوچار ہوتا ہے وہ اس کے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ بہت سے گناہوں سے اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے نظرِ عفو فرماتے ہیں۔ اگر تمام گناہوں پر مواخذہ کریں تو انسان کیا کوئی جاندار بھی زمین پر باقی نہ رہے۔

زمین پر معاصی کا نتیجہ ہے کہ پھلوں اور دانوں میں نقص واقع ہوا ہے۔ حافظ ابن کثیر وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ مسند امام احمد میں ہے کہ ''زیاد'' کے دور میں ایک تھیلی ملی جس میں گندم کا ایک دانہ کھجور کی گٹھلی کے برابر تھا اور اس پر لکھا ہوا تھا:

'هٰذَا نَبَتَ فِيْ زَمَانٍ كَانَ يُعْمَلُ فِيْهِ بِالْعَدْلِ'

''یہ اس زمانے میں پیدا ہوا جب عدل پروری تھی۔''

① الداء والدواء: 92 ② الشوریٰ: 30

اسی طرح آخر زمانہ میں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور ہر سو عدل وانصاف کا بول بالا ہوگا اور کفر وشرک کا خاتمہ ہوجائے گا تو ایک انار کو ایک جماعت کھائے گی، اس کے چھلکے سے لوگ سایہ حاصل کریں گے اور ایک بکری کا دودھ ایک جماعت کے لیے کافی ہوگا۔ [1]

اس لیے فسق وفجور بے برکتی اور عذاب کا باعث ہے جبکہ ایمان اور عمل صالح برکت ورحمت کا سبب ہے۔ اور فسق وفجور کا اثر زمین وآسمان حتی کہ درختوں اور حیوانوں پر بھی ہوتا ہے۔ بعض سلف سے منقول ہے:

((إِنِّي لَأَعْصِي اللّٰهَ، فَأَعْرِفُ ذٰلِكَ فِي خُلُقِ امْرَأَتِي وَدَابَّتِي)) [2]

''میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہوں تو اسے اپنی بیوی اور اپنی سواری کے طور اطوار سے پہچان لیتا ہوں۔'' (وہ بھی میری نافرمانی پر اتر آتے ہیں)

امام مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'إِنَّ الْبَهَائِمَ تُلْعِنُ عُصَاةَ بَنِي آدَمَ إِذَا اشْتَدَّتِ السَّنَةُ وَأُمْسِكَ الْمَطَرُ وَتَقُولُ: هٰذَا بِشُؤْمِ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ' [3]

''جانور اولادِ آدم کے نافرمانوں پر لعنت کرتے ہیں۔ جب قحط سالی ہوتی ہے اور بارش نہیں برستی، وہ کہتے ہیں: یہ نحوست اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ہے۔''

انسان کی بدبختی کا یہ اثر خشک سالی کی صورت میں ہو، زلزلہ یا سیلاب کی صورت میں ہو، اس سے جانور بھی متاثر ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور گندم کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ مکذبین پر عذاب تو ان کے جرائم کی پاداش میں ہے مگر باقی انسانوں اور حیوانوں کو عذاب میں دھر لینا چہ معنی دارد؟ اس کے بارے

[1] ابن کثیر: 577/3 [2] الدواء: 129,73 [3] الداء: 81

میں امام رازی وغیرہ نے فرمایا ہے کہ جانوروں کو اور دیگر اشیاء کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے نفع اور فائدے کے لیے بنایا ہے۔ جب شرک وکفر کا وبال تمام انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے تو جانوروں کو باقی رکھنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ رہے وہ انسان جو اس جرم میں شریک تو نہیں ہوتے مگر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہیں تو وہ بھی اپنے اس جرم کی پاداش میں عذاب میں مبتلا ہوجاتے ہیں جیسے ہفتہ کے روز کی حرمت کو پامال کرنے والوں کے ساتھ وہ بھی شریک عذاب ہوئے تھے جنھوں نے اس نافرمانی سے روکا نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ اتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً﴾ ①

”اور اس فتنے سے بچ جاؤ جو لازماً ان لوگوں کو خاص طور پر نہیں پہنچے گا جنھوں نے تم میں سے ظلم کیا۔“

ایسے ہی موقع پر نافرمانوں کے ساتھ نیک بھی دھر لیے جاتے ہیں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس کا مصداق وہ لوگ ہیں جو منکرات کو دیکھتے ہیں اور ان پر انکار نہیں کرتے وہ بھی مجرموں کے ساتھ عذاب میں دھر لیے جاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(إِذَآ أَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ عَذَاباً أَصَابَ الْعَذَابَ مَنْ كَانَ فِيْهِمْ، ثُمَّ بُعِثُوْا عَلٰى أَعْمَالِهِمْ) ②

”جب اللہ کسی قوم کے بارے میں عذاب کا ارادہ کرتے ہیں تو سب کو عذاب میں مبتلا کردیتے ہیں، پھر انھیں قیامت کے روز ان کے اعمال کے مطابق اٹھایا جائے گا۔“ (اور اعمال کے مطابق انھیں جزا وسزا دی جائے گی)

① الأنفال: 25 ② مسلم: 2879

﴿وَلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ﴾ اس تاخیر سے مراد موت بھی ہے اور قیامت بھی اور ہرامت کی ''اجل مسمی'' بھی مراد ہے، جیسے فرمایا:

﴿لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ﴾[1]

''ہرامت کے لیے ایک وقت ہے، جب ان کا وقت آ پہنچتا ہے تو وہ نہ ایک گھڑی پیچھے رہتے ہیں اور نہ آگے بڑھتے ہیں۔''

مشرکین کی یہ اجل یوم بدر تھی۔[2] جس میں ان کے ستر سردار قتل ہوئے اور ستر قیدی بنے، یوں اس ''یوم فرقان'' میں کفر کی کمر ٹوٹ گئی اور ان کا غرور خاک میں مل گیا۔

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا﴾ یہ جو انھیں مہلت دی جارہی ہے تو یہ اس لیے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی کرتوتوں کا علم نہیں بلکہ اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔ سب اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہیں کہ کون کیا کررہا ہے:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ﴾[3]

''اور تُو اللہ کو ہرگز اس سے غافل گمان نہ کر جو ظالم لوگ کررہے ہیں، وہ تو انھیں صرف اس دن کے لیے مہلت دے رہا ہے جس میں آنکھیں کھلی رہ جائیں گی۔''

اس لیے جب وقت آئے گا تو ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔ اس میں مومنوں کے لیے تسلی بھی ہے اور منکرین کے لیے تخویف بھی، کہ ایماندار کو اس کے ایمان وعمل کی جزا ملے گی اور منکر کو اس کے کفر وفسق کی سزا ملے گی ہے۔

[1] یونس: 49 [2] الرازی [3] ابراھیم: 42

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ. سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَ
بِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰـهَ إِلَّا أَنْتَ، أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ،
رَبِّ اغْفِرْلِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ.

ارشاد الحق اثری

۷ ربیع الآخر ۱۴۳۲ھ

۳ مارچ ۲۰۱۱ء

ادارہ کی دیگر مطبوعات

1 العلل المتناهية في الأحاديث الواهية (2 جلدیں)

2 إعلام أهل العصر بأحكام ركعتي الفجر للمحدث شمس الحق الديانوي رحمه الله

3 المسند للإمام أبي يعلى أحمد بن علي بن المثنى الموصلي رحمه الله (چھ ضخیم جلدوں میں)

4 المعجم للإمام أبي يعلى الموصلي رحمه الله

5 مسند السراج للإمام أبي العباس محمد بن إسحاق السراج الثقفي النيسابوري

6 المقالة الحسنى (المعربة) للمحدث عبدالرحمن المباركفوري رحمه الله

7 جلاء العينين في تخريج روايات البخاري في جزء رفع اليدين (للشيخ الأستاذ بديع الدين شاه الراشدي رحمه الله)

8 فضائل شهر رجب لأبي محمد الحسن بن محمد الخلال رحمه الله

9 تبيين العجب... في فضل رجب للحافظ ابن حجر العسقلاني رحمه الله

10 امام دارقطنی رحمہ اللہ

11 صحاح ستہ اور ان کے مؤلفین

12 موضوع حدیث اور اس کے مراجع

13 عدالت صحابہ رضی اللہ عنہم

14 کتابت حدیث تا عہد تابعین

15 الناسخ والمنسوخ

16 احکام الجنائز

17 امام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ

18 قادیانی کافر کیوں؟

19 پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری نماز

20 مسئلہ قربانی اور پرویز

21 پاک و ہند میں علمائے اہل حدیث کی خدمات حدیث

22 توضیح الکلام فی وجوب القراءۃ خلف الامام (جو بلا مبالغہ اپنے موضوع پر انسا ئیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے)

23 احادیث ہدایہ: فنی و تحقیقی حیثیت

24 مولانا سرفراز صفدر اپنی تصانیف کے آئینہ میں

25 آفات نظر اور ان کا علاج

26 احادیثِ صحیح بخاری و مسلم میں پرویزی تشکیک کا علمی محاسبہ

27 آئینہ ان کو دکھایا تو برا مان گئے

28 حرز المؤمن

29 امام بخاری رحمہ اللہ پر بعض اعتراضات کا جائزہ

30 اسباب اختلاف الفقہاء

31 مسلک اہل حدیث اور تحریکات جدیدہ

32 مسلکِ احناف اور مولانا عبدالحی لکھنوی

33 مشاجرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور سلف کا موقف

34 مقالات 1-2

35 فلاح کی راہیں

36 اسلام اور موسیقی پر اشراق کے اعتراضات کا جائزہ

37 اسلام اور موسیقی

38 نوافل کی جماعت کے ساتھ فرض نماز کا حکم

39 أحكام الحج والعمرة والزيارة

40 مقام صحابہ رضی اللہ عنہم

41 تنقیح الکلام فی تائید توضیح الکلام

42 تفسیر سورۂ ق

43 مقالات محدث مبارکپوری رحمہ اللہ (صاحب تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی)

44 إعلاء السنن في الميزان (حنفی مسلک کی معروف کتاب کا ناقدانہ جائزہ)

ادارۃ العلوم الاثریہ منٹگمری بازار
فیصل آباد - پاکستان ـــ فون: 041-2642724